URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براوزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہو گا۔ شُکریہ

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

مدیر اعلیٰ: منزہ سہام

گروپ ایڈیٹر: ناصر رضا

مدیر: دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

منیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

قیمت فی شمارہ: 60 روپے — جلد: 34 - شمارہ: 12 — دسمبر 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

07 بالکل خالی — منزہ سہام

08 احوال — ناصر رضا

22 منزل — م-ن-خ

52 کھڑکی میں رکھی آنکھ — رئیسہ خالد

78 بخت گزیدہ — سلیم اختر

108 اندھیرے کا سفر — کرن شبیر

128 مقدر یوں راکھ ہوا — حنا بشریٰ

144 زندگی کے رنگ — مہر پرویز دولو

156 مسکراہٹ — حسین خواجہ

168 ریشم کے دھاگے — روشانے سبتین

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

186 شاہ مراد
تبسم زہرہ رضوی

198 املتاس
شازلی سعید مغل

210 آپ کی ڈائری
قارئین

218 مسئلہ یہ ہے
ادارہ

228 حجاز کا سفر
زرین شمسی

232 اشعار کہانی
شبیر ناقد

234 سفر کہانی
شبینہ فراز

238 نمایاں شخصیات
شمیم احمد

243 آواز کی دنیا
محمد سلیم اختر

255 بدیسی کہانی
سید شاہ ضمیر

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے، افریقہ 65 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر، ایشیا، یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اب CSS ایک حقیقت

1) والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی اولاد اُن کا نام روشن کرے مگر فی زمانہ اکثر والدین اپنی خواہش کو بس اپنے دل میں ہی دبا کر رکھ لیتے ہیں۔

2) مشہور تعلیمی اداروں اور ان سے جڑے اساتذہ کی بھاری بھر کم فیس عام والدین کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں۔

3) ایسے میں ہم آپ کی رہنمائی کریں گے ہم آپ کی اولاد کو آپ کے لیے باعث فخر بنائیں گے۔

4) علم کی دنیا میں CSS ایک خواب۔

5) اس خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

6) انتہائی قابل ٹیچرز سے گھر بیٹھے اپنی لاڈلی بیٹی یا ہونہار سپوت کو CSS کی تیاری کرائیں۔

7) CSS میں آپ کی کامیابی کو ہم یقینی بنائیں گے۔

رابطہ کیجیے

www.facebook.com/srasheedkhan

میں بھی تو ماں ہوں

ہم جس دور میں جی رہے ہیں اس دور نے ہم سب کے دل بڑے سخت کر دیے ہیں یا یوں کہیے کہ حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اب دکھ کی خبریں چند گھنٹوں تو بے چین رکھتی ہیں پھر رفتہ رفتہ دل اور ذہن دونوں سے محو ہو جاتی ہیں۔ پہلے جیسا معاملہ نہیں جب کوئی دکھی خبر مہینوں یا سالوں دل کے راستے آنکھوں میں ٹھہر جایا کرتی تھی اور وقت بے وقت آنسوؤں کی صورت بہا کرتی' پے در پے صدموں نے اس قوم کو کچھ سکھایا ہو یا نہ سکھایا ہو آنسو روکنے کا فن خوب سکھا دیا اور سانحوں کے ساتھ جینا بھی سکھا دیا۔ مگر کل ٹی وی اسکرین پر میجر اسحاق شہید کی زندگی سے بھرپور تصویر دیکھ کر اور پھر اُسی جوان کو تابوت میں سوتا دیکھ کر دل غم سے پھٹ گیا' شہید کی ڈیڑھ سالہ بیٹی اور بیوہ کی تصاویر نے پوری رات سونے نہ دیا بات بے بات آنکھوں سے آنسو بہتے رہے' بیٹوں کو بلاوجہ ڈانٹا' کھانا بنا کھائے فریج میں رکھا' ہر چینل پر خبر کو بار بار سنا اور دیکھا' میں جانتی ہوں شہید مرا نہیں کرتے' میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وردی پہننے والا ہر جوان اس منصب پر فائز ہونے کا خواہش مند ہوتا ہے' میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خاکی وردی ہماری اور ہمارے وطن کی حفاظت پر مامور ہیں وہ جان دیتے ہیں تبھی ہم اور ہمارے بچے جی پاتے ہیں' مگر میں کیا کروں میں ماں بھی تو ہوں' اولاد کو سوئی بھی چبھ جائے تو دل دکھ جاتا ہے' کوئی بری نظر سے دیکھ لے تو نظر اتارنا فرض ہو جاتا ہے' میں اس ماں کا دکھ کیسے نظر انداز کر دوں جس کا سہارا جس کے گھر کا واحد کفیل دشمن کے ہاتھوں لہولہان ہو گیا' سر اور چہرہ گولیوں سے ظالموں نے چھلنی کر دیا۔ میں کیسے اُس ماں کو صبر کی تلقین کر سکتی ہوں' میں کیسے اُس بیوہ سے آنکھیں ملا سکتی ہوں جس کی اب ساری زندگی کانٹوں پر بسر ہو گی' میں کیسے اُس یتیم شہزادی کی دکھ بھری آنکھوں کو فراموش کر سکتی ہوں۔ میں بھی تو ماں ہوں......!

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

محترم احوالی دوستو! سلامت باشد' سچی کہانیاں کا شمارہ دسمبر 'طویل کہانی نمبر' آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت پیش خدمت ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ یہاں ایک اور بات آپ کے علم میں لانا ضروری ہے کہ سچی کہانیاں کا 'پُر اسرار نمبر' اب جنوری 2018ء کا نہیں' بلکہ فروری 2018ء کا شمارہ ہوگا۔ اِس تاخیر کی وجہ آپ کی جانب سے ارسال کی جانے والی اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہترین کہانیوں کا انتظار اور انتخاب ہے۔ ایک اور اچھی بات یہ بھی ہے کہ ماہِ جنوری 2018ء سے سچی کہانیاں ایک بار پھر انعامی کہانیوں کا آغاز کر رہا ہے۔

احوالی دوستو! سال 2017ء کا سورج ماہِ دسمبر میں آخری ہچکیاں لے کر غروب ہوگا۔ ہماری زندگی کا ہر دن آنے اور جانے کے لیے ہے۔ ہفتوں' مہینوں اور سال میں بدل جانے کے لیے ہے۔ اس جاتے دسمبر میں آپ قارئین کے لیے 'دن' کے حوالے سے ہی گلزار صاحب کی ایک بہت ہی اعلیٰ نظم آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت پیش ہے۔

دن

آج کا دن جب میرے گھر میں فوت ہوا
جسم کی رنگت جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی
سرخ خراشیں رینگ رہی تھیں بانہوں پر
پلکیں جھلسی جھلسی سی اور چہرہ دھجی دھجی تھا
ہاتھ میں تھے کچھ چیتھڑے سے اخباروں کے
لب پر ایک شکستہ سی آواز تھی بس
'دیکھ ذرا' ان بارہ چودہ گھنٹوں میں کیا حالت کی ہے دنیا نے......!

اور اب آغاز احوال......

☆ یہ پہلا خط ہے کراچی سے بھائی اشعر جواد کا' لکھتے ہیں۔ محترم ناصر بھائی! السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ شعرو شاعری کے دنیا میں پڑھا کہ 'نارسائی' بھی اک صدمہ عظیم ہے۔ اس حقیقت کا ادارک اُس وقت ہوا جب میرا ماہِ اکتوبر کے لیے عرق ریزی سے لکھا ہوا خط آپ تک

نہ پہنچ سکا۔ کیسا مذاق ہے عملی زندگی میں بذاتِ خود 'میدانِ عمل' بن کر بھی ہمارے حصے میں فقط 'نارسائی' ٹھہری۔ آپ اِک عرصے بعد اپنے 'میدانِ عمل' میں ملے اور ابتدائی دو شماروں سے ہی آپ کا ماضی والا 'عزم و ہمت' اس بات کا ثبوت ہے آپ کی گوشہ نشینی بھی خود میں اک بڑی سچائی رکھتی تھی۔ احوال کی وہی پرانی رونقیں آباد ہونے لگیں۔ اس وقت کے لوگ جو بیچ کے عرصے میں سچی کہانیاں سے۔ کسی طور دور تھے اُن کی نئے سرے سے آمد ہونے لگی۔ ایسے میں مجھے بھی آپ سے اپنی اگست 2004ء میں پہلی ملاقات بقول محسن نقوی کچھ یوں یاد آئی۔

یاد کرو پہلی ملاقات کی باتیں
میں پہلی ملاقات ذرا بھول گیا ہوں

ماہِ نومبر کا شمارہ دیدہ زیب سرورق سے مزین تھا۔ اداریہ ملکی سیاست و معاشرے پر تلخ سے زیادہ سیاہ کن حقیقت ہے۔ منزہ جی پوچھ رہی ہیں اس سارے تماشے میں ہم کہاں ہیں؟ تو جناب ہم تو تماشا بین ہیں۔ کوئی 'جیو نیوز' دیکھ رہا ہے تو کوئی 'سماء' تو کوئی 'اے آر وائی' تو کوئی 'ایکسپریس نیوز' تماشا بین کو بھی کچھ کہنے کا حق ملا ہے بھلا۔ کہانیوں میں جو میں پڑھ سکا۔ روشانے سبعین کی 'بے جی' متاثر کن تحریر تھی۔ کہانی کا تجزیہ کیا جائے تو اک آخری اور مختصر بات 'مکافاتِ عمل' ہی سمجھ میں آتی ہے۔ جسے اکثر لوگ طاقت و اختیار ملنے پر بھلا دیتے ہیں اور انجام زرینہ بیگم جیسا ہوتا ہے۔ ملازم حسین شیرازی کی تحریر 'قیمت' ایک نہایت ہی بھیانک و تباہ کن حقیقت پر مبنی تھی۔ اس تحریر میں مرکزِ نگاہ بھی عورت کی ذات تھی' جو اپنے من مانے فیصلوں سے بذاتِ خود مثالِ عبرت بنی' 'سنگریزے' اک اچھی کاوش ہے اِسے جاری رکھیں علی حیدر ملک کی اشعار کہانی بھی اچھی ہے مگر ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے مضامین شمارے میں اِک الگ ہی ادبی چاشنی رکھتے ہیں' اک زمانے میں ہم اُن کی کتاب 'لوٹ سیل' رات سونے سے پہلے پڑھتے تھے تو رات پھر ہم خوابوں میں بھی گدگداتے رہتے تھے۔ یہ اُن کے قلم کا کمال ہے کہ اُن کے مضامین میں استاد حسرت موہانی کا تذکرہ پڑھ کر ہم سارا شمارہ استاد حسرت موہانی کی 'یہ کون آ گئی دلبر با مہکی مہکی' غلام علی کی آواز میں سنتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ عمر خطاب کے فلمی مضامین بھی شمارے میں اک اچھا اضافہ ہیں۔ اور اب میں اجازت چاہتا ہوں بقول محسن نقوی

میری ہر سانس میزان عدالت تھی محسن
جتنے محشر تھے میرے جسم کے اندر نکلے

☆ اشعر جواد! خوش رہو آباد رہو' تمہاری نئی کہانی کا ہمیں اور کتنا انتظار کرنا ہوگا؟ شعر اچھا ہے' جون بھائی کا ایک شعر بطورِ خاص تمہارے لیے......

جاں نثاروں پہ وار کیا کرنا
میں نے بس ہاتھ میں سپر لی ہے

☆ ملازم حسین شیرازی بھکر سے شاملِ احوال ہو رہے ہیں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! بہت

شکریہ کہ میری ارسال کردہ کہانی 'قیمت' تازہ شمارے میں شائع کی اور میرے خط کو احوال نامے میں سرفہرست جگہ دی۔ نومبر 2017ء کا سرورق حسن سادگی سے مزین ہے۔ ماڈل نیچرل انداز میں چہرے پر اُداسیوں کو سجائی نظر آتی ہے۔ سب کہانیاں اعلیٰ درجہ کی ہیں' ان کا چناؤ یقیناً محنت طلب کاوشوں کا نتیجہ ہے' سچی کہانیاں نہایت پُرشکوہ اور دل آویز ماہنامہ ہے۔ ادبی ذوق رکھنے والے قارئین اس کی دل نشین تحریروں سے یقیناً فیض یاب ہوتے ہوں گے۔ دی گئی معلومات اُن کے علم میں اضافے کا باعث ہوں گی۔ اداریہ 'حکمران بھی تو عوام میں سے ہوتے ہیں۔ جیسے عوام ویسے حکمران' بے حسی اور غیر ذمہ دار رویے انسان کو ہر وقت دائمی مسائل سے دوچار رکھتے ہیں۔ تاریخی کہانی تاریخ کے سینے سے ورق گردانی کرتے ہوئے جس کہانی کا انتخاب کرتے ہیں وہ قابل صد تحسین ہے کہانی تحفہ خاص نہایت سبق آموز ہے' بہت خوب' کھڑکی میں رکھی آنکھ' ازقلم رئیسہ خالد' سقوط ڈھاکہ ایسا المیہ اور زخم ہے جس کی چبھن ہر لمحہ حساس دلوں اور باشعور ذہنوں کو محسوس ہوتی ہے' خوبصورت طرز تحریر' جنات کا استاد واقعی ناقابل یقین ماورائی مخلوق پر لکھی گئی عمدہ تحریر ہے۔ دل کی آواز

اک دعا نے بچالیا ہے مجھے
ورنہ کس کس کی بددعا ہے مجھے

دل سے نکلنے والی دعا' ہزاروں بددعاؤں کو دور کرتی ہے۔ 'وہ مانگنے والی' نادیہ بتول رضا کی یادگار تحریر' ماشاء اللہ در پر آئے سوالی کو کبھی خالی نہیں لوٹانا چاہیے' اس کی نیت میں کچھ بھی ہو۔ مفلس کی جیب' ایک بدیسی کہانی جس کے ترجمے میں شگفتگی اور روانی ہے۔ التماس' شازیہ سعید مغل کا زیر تحریر دلچسپ سلسلہ پسندیدگی کی سند حاصل ہوگئی۔ ملائیشیا ایک دنیا' زین شمسی کا ½2 صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت اور قابل دید مناظر سے بھرپور ملک کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کرنا کمال حیرت ہے۔ نہایت عمدہ۔ وحید مراد' ازقلم عمر خطاب ایسے شخص کی روئیداد جس کا آغاز قابل رشک تھا لیکن زوال نے بے مرادیوں میں جکڑ لیا۔ وہ مر گیا لیکن آج بھی لاکھوں دلوں میں زندہ ہے انمول تحریر...... قارئین کے حقوق تلف ہونے کے پیش نظر کہانیوں پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے ہاتھ روکنا پڑتا ہے۔ 'اپنی دشمن آپ' گھر کی بات' شارٹ کٹ' ایک سوال' سنگریزے' محبت یا عزت' خالی ہاتھ' ودیگر سب کہانیاں لاجواب ہیں۔ احوال نامے میجر (ر) عبدالقدوس جن کے دل میں آج بھی تحسین مرحومہ کی یادیں روز روشن کی طرح قائم ودائم ہیں۔ ان کے چاہنے والے آج بھی اُن کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے آمین' نظر علی برمانی نے خوبصورت خط لکھا ماشاء اللہ' مور شاہد حسین آپ شاید ہمیں بھول چکے ہیں لیکن آپ کے خطوط کہانیاں اور ہمارے بارے میں حوصلہ افزائی کی تحریریں دل پر نقش ہیں۔ خوش رہیں۔ فیضان علی عثمانی آپ نے جو خط میں تحریر کیا صحیح ہے۔ اللہ پاک ہر ایک کو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ عبدالغفار عابد' آپ اپنے نصب العین پر قائم رہیں منزل کی طرف رواں دواں رہیں راستے میں چھوٹے بڑے کنکر

دعائے صحت

معروف صحافی اور لکھاری' محمد شاہد خان عرف م۔ش۔خ جنھوں نے گزشتہ ماہ سچی کہانیاں شمارہ نومبر سے 'ایک نئے سلسلے 'سنگریزے' کا آغاز کیا ہے' ان دنوں صاحب فراش ہیں' اسی وجہ سے اُن کا دوسرا کالم موجودہ شمارے میں شامل نہیں ہوسکا' ادارہ اُن کی صحتِ کامل کے لیے دعا گو ہے اور آپ قارئین سے بھی م۔ش۔خ کے لیے تمام اچھی دعاؤں کی التماس ہے۔

پتھر آپ کے نیک مقصد میں حائل نہ ہوسکیں گے۔ غلام مرتضیٰ علوی نے دلچسپ اور خوبصورت خط لکھا ماشاء اللہ' حسین خواجہ' ایم افضل' جیجل میتلو' ام مناہل' محمد سلیم اختر' آپ کے خطوط لائق تحسین ہیں افسوس تفصیلی تبصرہ نہیں کرسکتا۔ اللہ زورِ قلم اور زیادہ کرے مسئلہ یہ ہے' آپ کی ڈائری' خوب رہیں۔ خط ہذا کے ساتھ کہانی نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے ارسال کر رہا ہوں۔ پُراسرار نمبر کے لیے تحریر زیرِ قلم ہے اگر اس ماہ نہ بھیج سکا تو آئندہ نمبر کے لیے پیش کروں گا سچی کہانیاں ارسال کرنے کا بہت شکریہ' ناصر رضا صاحب! آخر میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ عجیب وحشت و گھٹن کی فضا میں محبوس قارئین کو حدت و ندرت کی جو راہیں دکھا اور پہنچا رہے ہیں وہ ادبی خدمات کا جھومر ہیں جو اظہر من الشمس ہیں۔ اجازت چاہوں گا میری طرف سے سب احباب کو دعا سلام۔

☜ ملازم حسین شیرازی صاحب! سچی کہانیاں آپ کو پسند آیا ہماری محنت وصول ہوئی۔ پُراسرار نمبر اب جنوری نہیں' ماہ فروری کا شمارہ ہوگا۔ سو آپ کی پُراسرار کہانی ہمیں اس نمبر کے لیے لازمی ملنی چاہیے۔

☆ نسیم سحر کراچی سے شاملِ احوال ہوئی ہیں محترم ناصر رضا! السلام علیکم! جب سچی کہانیاں میں آپ کی واپسی کا پڑھا تو یقین جانیں بہت خوشی ہوئی کیونکہ سچی کہانیاں میں مجھے متعارف کرانے والے آپ ہی تھے' جنوری 2013ء میں میری پہلی کہانی 'نیکی کا کام' آپ نے ہی شائع کی تھی اس لیے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میری خوشی کا کیا عالم ہوگا۔ خیر پچھلے دو ماہ طبیعت بہت خراب رہی اس لیے نہ لکھ سکی اور پڑھنا بھی زیادہ نہ ہوا۔ ابھی مہینے بھر سے وقفے وقفے سے آپ کو فون کر رہی تھی لیکن آپ سے بات نہ ہوسکی آپ مصروف تھے اس لیے سوچا خط ہی لکھ لوں سچی کہانیاں بہت معیاری اور بہترین ڈائجسٹ ہے۔ یقیناً اس میں مدیران کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے اور آپ جیسے سینئر اگر دوبارہ شامل ہوجائیں تو پھر کیا کہنے' میں کم لکھتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے اور آپ لوگوں کی مہربانی جو بھی لکھا شائع ہوا ابھی بھی دو تین کہانیاں ادارے میں موجود ہوں گی جو امید کرتی ہوں آپ کی نظرِ عنایت سے شائع ہوجائیں گی اور اس خط کے ساتھ بھی ایک کہانی بھیج رہی ہوں امید ہے پسند آئے گی۔ تازہ شمارہ اکتوبر کا شمارہ زیادہ نہیں پڑھا احوال اچھا تھا اور خاص کر جو تاریخ کہانی کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ مجھ جیسے تاریخ پسند کرنے والوں کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہے اس کے علاوہ دوسری زبانوں کی ترجمہ کہانیاں بھی عمدہ ہیں اس طرح دوسرے ملکوں اور زبان سے واقفیت ہوگی یقیناً یہ

ایک خوشگوار تجربہ ہے منزہ صاحبہ کا اداریہ ہمیشہ حسب حال اور بہترین ہوتا ہے انشاء اللہ اب اگلے ماہ ضرور تبصرہ کروں گی آپ کے لیے اور سب ادارے کے لوگوں کے لیے بہت ساری دعائیں' اللہ آپ لوگوں کو خوب ترقی اور کامیابی عطا فرمائے آمین۔

☆نسیم سحر صاحبہ! آپ کی احوال میں آمد سے ہمارا دل شاد اور آباد ہو گیا۔ آپ کی ایک کہانی گزشتہ شمارے میں شامل تھی اور نئی کہانی بھی جلد آئندہ کسی شمارے کا حصہ ہو گی۔ زیر نظر شمارے پر آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

☆نظر علی برمانی داد و سے شامل احوال ہو رہے ہیں۔ محترم ناصر بھائی! السلام علیکم! امید ہے بخیریت ہوں گے۔ اس بار شمارہ پانچ تاریخ کو ملا سرورق پر ماہرہ خان اچھی لگیں اداریہ منزہ سہام نے بہت خوب لکھا کہ جیسے ہمارے اعمال ہوں گے ویسے ہمیں حکمران ملیں گے ہم سب کو بھی اپنا اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ منورہ نوری خلیق کی 'تحفہ خاص' واقعی ہمارے لیے تحفہ خاص تھی' بہت زبردست تحریر تھی۔ ناصر بھائی میری ایک گزارش ہے کہ منورہ نوری خلیق کی کہانی جو کہ محمد بن قاسم کے بارے میں تھی' وہ کہانی ایک بار پھر پڑھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے' ہو سکے تو ہماری یہ فرمائش پوری کر دیں۔ رئیسہ خالد کی کہانی 'کھڑکی میں رکھی آنکھ' پڑھ کر یقین مانیے کہ دل دہل گیا۔ پاکستان دولخت ہوتے وقت اس قدر ظلم و ستم ہوئے تھے اور وہ بھی مسلمانوں نے مسلمانوں پر کیے مجھ سے تو وہ کہانی پڑھی ہی نہیں جا رہی تھی' مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا دل پھٹ جائے گا' اُف میرے خدا اس قدر ظلم اور بربریت تو شاید 47ء میں نہیں ہوا ہو گا کیا انسان اتنا ظالم اور وحشی بھی ہو سکتا ہے الامان والحفیظ اب دوسرے حصے میں پتا نہیں کیا ہو گا۔ روشانے سبعین کی کہانی 'بے جی' مکافات عمل پر مشتمل انتہائی زبردست کہانی تھی۔ طرز تحریر بہت زبردست تھا۔ زرینہ کو اپنے کیے کی بہت کڑی سزا ملی اور اس کا انجام بہت افسوس ناک ہوا۔ سنبل کی کہانی 'محبت یا عزت' اچھی رہی' شنگرف کے باپ نے اس سے قتل وہ بھی اپنے باپ کا کروا کر بہت برا کام کیا اور شنگرف کے انجام پر افسوس ہوا' ملازم حسین شیرازی کی کہانی 'قیمت' پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ قسمت نے جمیل صاحب کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلے اور پھر انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر بہت بڑی غلطی کی جس کا خمیازہ بہرحال انہیں بھگتنا ہی پڑا۔ فوزیہ اختر کی کہانی 'خالی ہاتھ' ایک سبق آموز کہانی تھی۔ زوبی کے خالی ہاتھ رہ جانے کا دکھ اپنے دل میں محسوس ہوا۔ غزالہ نزہت فاطمہ کی کہانی 'جنات کا استاذ' بہت خوبصورت پیرائے میں لکھی گئی کہانی بہت اچھی لگی۔ ناصر بھائی ابھی تک یہی کہانیاں پڑھ سکا ہوں باقی کہانیاں بھی یقیناً بہت اچھی ہیں آہستہ آہستہ سب پڑھ لوں گا' ناصر بھائی کیا مجھے اپریل 2000ء کا شمارہ مل سکتا ہے ضرور بتائیے گا' اللہ آپ کا اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

☆نظر علی برمانی! منورہ نوری کے حوالے سے آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے' رئیسہ خالد کی کہانی نے ہر دل والے کی آنکھیں نم کی ہیں 1947ء میں جو ہوا

محمد عثمان جامعی کا شعری مجموعہ 'بس اک دیوار' کی اشاعت

انسانی المیوں کو تخلیقی گرفت کے ساتھ نظم کا روپ دینے والے شاعر محمد عثمان جامعی کا شعری مجموعہ 'بس اک دیوار' شائع ہوگیا ہے۔ اس میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ 'رواں' کراچی کے تحت شائع ہونے والی 320 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 450 روپے ہے۔ کتاب کا فلیپ نوجوان افسانہ نگار اور کالم نویس اقبال خورشید نے تحریر کیا ہے جبکہ اس کا ٹائٹل ڈیزائنر سید شہزاد مسعود کی تخلیق ہے۔

وہ تو غیر مسلموں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا 1971ء کا المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہی مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور بربریت کا بازار گرم کیا۔ اور ہاں! آپ کو اپریل 2000ء کا شمارہ مل سکتا ہے۔ مگر اس کی ایک شرط ہوگی وہ یہ کہ آپ کو سچی کہانیاں کے لیے ایک کہانی تحریر کرنا ہوگی۔

☆ نازیہ بتول رضا کراچی سے شاملِ احوال ہو رہی ہیں۔ سر ناصر رضا! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ سچی کہانیاں میں دوبارہ سے آپ کی آمد دل میں خوشی کے پھول کھلا گئی سچی کہانیاں کو دوبارہ سے پرانے رنگ میں دیکھ کر دل کو بڑی خوشی ملی۔ میری ادنیٰ سی تحریر کو شائع کرنے کا بے حد شکریہ! آپ نے تو ہمیشہ ہی سے میری بے حد حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کی حوصلہ افزائی کی بدولت ہی میرے قلم کو روانی ملی ہے ورنہ شاید کوئی زندگی بھر جان نہ پاتا کہ نازیہ بتول رضا بھی کوئی شخصیت ہے' میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو آپ اپنے رسالے کی زینت بنا کر مجھے اور میری تحریر کو جو عزت بخشتے ہیں اس کے لیے میں آپ کی دل سے ممنون ہوں میری دل سے دعا ہے کہ آپ کی زیر سرپرستی سچی کہانیاں دن رات ترقی کی منازل طے کرتا رہے آمین۔ ماہ ستمبر اور نومبر میں میری تحریر لگانے کا شکریہ' ہمیشہ کی طرح ماہِ نومبر کا شمارہ بھی اپنی مثال آپ تھا مصروفیت کی بنا پر پورا تو نہیں پڑھ سکی چند کہانیاں پڑھی ہیں جو کہ سب ہی اپنی مثال آپ تھیں مزید کہانیاں بھیج رہی ہوں آپ کی مرضی ہے کہ اس میں سے جو کہانی چاہیں لگا دیں اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے کہ آپ اسی طرح محنت اور لگن سے ادب کی خدمت کرتے رہیں آمین دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✍ نازیہ بتول رضا! یہ کس نے کہہ دیا کہ تمہاری تحریر ادنیٰ سی ہوتی ہے؟ تم سمیت میرے ہر لکھاری کی تحریر 'اعلیٰ' ہوتی ہے۔ جب ہی تو سچی کہانیاں میں شائع ہو کر پڑھنے والوں سے پسندیدگی کی سند حاصل کرتی ہے۔ تمہاری نئی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ جلد شمارے کی زینت بنیں گی۔

☆ اُم مناہل ایبٹ آباد سے شریک احوال ہو رہی ہیں' ناصر انکل' السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گے میری کہانی 'جنوں کی بددعا' کو رسالے میں جگہ دینے اور پسند کرنے کا بہت شکریہ یہ آپ ایڈیٹر حضرات اور قارئین اکرام کی محبت ہے جن کی وجہ سے میرے اندر لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اللہ پاک آپ کو ہمت و حوصلہ دے اور سچی کہانیاں کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے آمین۔ سب سے پہلے احوال میں نظر علی برمانی دادو کی معاف کر دینے والی بات نے متاثر کیا انہوں نے

ایسے انسان کی پردہ پوشی کرکے بہت اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے ایسی مثال معاشرے میں کم ہی ملتی ہے میرے زیرِ نظر بھی ایسی کہانیاں آتی رہی ہیں جو کبھی نہ کبھی کسی شمارے یا کسی اور رسالے میں چھپ چکی ہوتی ہیں جن کا حوالہ دینا مجھے مناسب نہیں لگتا' جن میں اپنے آپ کو خود ساختہ سینئر کہنے والے نام نہاد لکھاری بھی شامل ہیں' اللہ عزوجل اُن کو سچ کی توفیق دے انہیں اپنی اصلاح خود کرنی چاہیے' انسان کو دنیا کی چندروزہ نمود و نمائش کے لیے اپنی آخرت خراب نہیں کرنی چاہیے' اس خط کے ساتھ آپ کو ایک پراسرار کہانی بھیج رہی ہوں امید ہے پسند آئے گی۔ منزہ باجی نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اداریہ لکھ کر سہام انکل کی یاد تازہ کردی ان اشعار کے ساتھ خط کا اختتام کررہی ہوں۔

لفظوں کے بیچتا ہوں پیالے خرید لو
شب کا سفر ہے کچھ تو اُجالے خرید لو
ہوگا نہ امیر شہر کا مجھ سے احترام
میری زباں کے واسطے تالے خریدلو

☆ اچھی بھتیجی ام مناہل! ہمیشہ کی طرح تمہاری نئی کہانی بھی بہت اچھی ہے' ہمیں پسند آئی جلد سچی کہانیاں کے صفحات کی مہمان بنے گی۔ اشعار بہت اچھے لگے۔ جواباً بس یہی عرض ہے

میں ہوں اس شہر میں مقیم جہاں
اپنے ہونے سے لوگ ڈرتے ہیں

☆ ارم ناز کراچی سے شاملِ احوال ہورہی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! سچی کہانیاں سے وابستہ تمام احباب کو میرا اسلام۔ یہ رسالہ مجھے بچپن سے پڑھنے کا شوق تھا اب یہ شوق جنون کی حد تک ہوگیا ہے' اس بار اپنی کہانی چھپی دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا' حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ ایک اور کہانی جو حقیقت پر مبنی ہے ارسال کررہی ہوں امید ہے کہ سچی کہانیاں کی زینت بنے گی ایک اور بات میری والدہ جو اس وقت تقریباً 70 سال کی ہیں' دماغی طور پر تھوڑی نفسیاتی ہوگئی ہیں' لیکن سچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہیں' نئے شمارے کے علاوہ پرانے لاکر گھنٹوں پڑھتی ہیں اور پھر جو کہانی ان کو اچھی لگتی ہے وہ سب کو اپنے الفاظ میں سناتی ہیں' کہتی ہیں کہ اس رسالہ سے مجھے بہت محبت ہے بڑھاپے میں یہ میری سہیلی ہے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

☆ ارم ناز صاحبہ! آپ کی پہلی کہانی جو (سچی کہانیاں شمارہ نومبر میں شائع ہوئی)۔ کی طرح دوسری کہانی بھی اچھی ہے' جلد ہی کسی شمارے کا حصہ ہوگی' اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں ہمارا مودبانہ سلام ضرور پیش کیجیے گا۔

☆ روشانے سبعین مہاروی لاہور سے شاملِ احوال ہورہی ہیں۔ اچھے ناصر بھائی! آداب! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ سلسلہ وار کہانی کی پہلی قسط ارسال خدمت ہے۔ تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اچانک گھر کی شفٹنگ کرنی پڑی جس کے باعث بے حد مصروفیت رہی۔ انشاء

اللہ ایک ہفتے کے بعد آپ کو دوسری قسط بھی بھجوا دوں گی۔ یہ کہانی میں بہت محنت سے لکھ رہی ہوں' میری بہت سی امیدیں اِس ناول سے وابستہ ہیں۔ باقی سب خیریت ہے بے جی شائع کرنے کا شکریہ۔ تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام۔

اچھی روشانے 'ریشم کے دھاگے' کا آغاز زیرِ نظر شمارے سے ہو رہا ہے۔ ہمیں امید نہیں یقین ہے کہ قارئین اسے بہت پسند کریں گے۔

☆عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے شریک احوال ہیں۔ باجی منزہ سہام! بھائی ناصر رضا سمیت دوشیزہ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور لکھاری و قارئین کو میرا سلام نومبر کے پرچے کی تعریف بہت ضروری ہے' اس لیے کہ معیار اور میرٹ کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سچی کہانیاں پاکستانی عوام کا پسندیدہ رسالہ ہے مگر ناصر بھائی کی محنت اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقبول ترین بنائے گی انشاء اللہ' باجی منزہ کے اداریے چڑیاں چگ گئیں کھیت پر غور کرنا پڑے گا حکم اللہ ہے وہی تقدیریں بناتا ہے اور بدلتا ہے کوئی کسی کا اقتدار چھین سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کو عطا کر سکتا ہے۔ اچھے حکمران ملیں گے اگر ہم نے کوشش کی' بے عمل رہے تو غلط کار مسلط ہوں اور یہ اللہ کا قانون ہے جو کبھی نہیں بدلتا' پاکستانی عوام کے لیے دکھ وہ فصل ہے جس کی کاشت ہر آنے والی حکومت نے کی۔ کاش ہمارے حکمران سمجھ جائیں کہ ابدیت سفر کو ہے مسافر کو نہیں۔ م ن خ کی تحریر 'تحفہ خاص واقع ہی پڑھنے والوں کے لیے خاص تحفہ تھی۔ اس پر یہی لکھنا کافی ہے کہ کچا گھڑا تو غنیمت ہے پیار کرنے والے تو محض جذبوں سے دریا عبور کر لیتے ہیں۔ باجی نسیم کوثر کی تحریر شارٹ کٹ پڑھ کر حضرت علی کا قول یاد آ گیا آپ نے فرمایا: ''انسان کے نفس کی قیمت جنت ہے وہ اس کو کم قمت پر نہ بیچے'' مگر آج انسان اپنی اِس عارضی زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے اپنے نفس کو اونے' پونے داموں بیچ دیتا ہے۔ جو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ ملازم حسین شیرازی کی قیمت اور فوزیہ اختر کی خالی ہاتھ ان دونوں تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی تھا۔ جذباتی فیصلے ہمیشہ پریشانی اور بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ شاہدہ ذاکر کی یادوں کے چراغ جب آدمی اپنے آئیڈیل سے محروم ہو جاتا ہے تو پھر اس کی یادوں سے دوستی کر لیتا ہے۔ یہی یادیں آدمی کو جینے کی مہمیز دیتی ہیں۔ وقت اور بخت اکثر ساتھ نہیں چلتے' کبھی وقت ہاتھ چھڑا لیتا ہے تو کبھی بخت اگر قسمت سے دونوں مل جائیں تو انسان کی تقدیر بدل دیتے ہیں بہت عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو وقت اور بخت کے نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی رضا پر خوش رہتے ہیں۔ صبر کرتے ہیں عظمیٰ شکور کی تحریر گھر کی بات اس موضوع پر اچھی تحریر تھی۔ مستقبل کے عظیم رائٹر مہر پرویز احمد دولو کی تحریر اپنی دشمن آپ لاجواب تحریر تھی۔ گھر کو جنت اور جہنم بنانے میں والدہ کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ عظیم ہوتی ہیں وہ مائیں جو اپنے لختِ جگر کے گھر کو جنت بنا دیتی ہیں کئی ایک تو گھر کی بادشاہت کے لیے گھر کو جہنم بنا دیتی ہیں۔ افتخار چوہدری کی 'خونی صحرا' نے ایمان تازہ کر دیا۔ اللہ پر یقین رکھنے والے ایک دن کامیابی حاصل کر لیتے ہیں' شیما عبدالقیوم کی دل کی آواز

'رفعت محمود کی سبز کفن اور فرزانہ کی بس اچانک بھی اچھی تحریریں تھیں شازلی سعید مغل کی سلسلے وار کہانی التماس کی دوسری قسط سسپنس سے بھرپور تھی۔ عمر خطاب خان نے وحید مراد مرحوم کی شخصیت پر قلم اٹھایا بہت خوب' کہتے ہیں انسان نہیں مرتا مگر انسانی رویے اسے مار دیتے ہیں۔ وحید مراد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ زمانے کی یہ ریت ہے کہ مرے ہوئے انسان کی میت کو ہر کوئی کندھا دینے کی کوشش کرتا ہے مگر زندہ انسان کو کوئی گلے نہیں لگاتا۔ زین شمسی نے ملائیشیا کی مفت سیر کرائی' اختر حفیظ نے گلابوں کی سرزمین کی سیر کرائی یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ گلابوں جیسی جگہ پر بھی مزدور پریشان ہیں۔ آپ کی ڈائری میں بھی کے انتخاب اچھے تھے۔ اب ایک نظر احوال پر اس محفل میں ہر قاری و لکھاری اپنی مثبت رائے کے ساتھ حاضر تھا۔ نظر علی برمانی' اشعر جواد اور سید سرور ندیم کے ساتھ پرانا تعلق ہے۔ فوزیہ اختر خوش آمدید اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔ حسین خواجہ منزل سے سفر اہم ہے' سفر جاری رکھیں انشاء اللہ کامیابی ملے گی۔ میں مہر پرویز احمد دولو' مسکان بھٹی ظفر' مقصود احمد بلوچ' قاسم بلوچ اور شہزاد شریف سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ لوگ احوال کی محفل میں حاضر ہو کر اس کی رونق کو دوبالا کریں ناصر بھائی میں نفرتوں کی سرزمین کو محبتوں کے پانی سے سیراب کرنے والا آدمی ہوں کسی کا دل توڑنا میرے بس کی بات نہیں مجھے انسانیت سے محبت ہے بس جھوٹ اور دکھاوے سے نفرت کرتا ہوں

مرتا نہیں کوئی کسی کے بغیر یہ حقیقت ہے زندگی کی
لیکن صرف اپنے لیے جینے کو جینا نہیں کہتے

اللہ ہم سب کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

☆ بھائی عبدالغفار عابد! بہت ہی شاندار اور جاندار تبصرے کے ساتھ احوال میں آپ کی آمد ہمارے دل کو شاد اور آباد کر دیتی ہے۔ آپ کی سچی اور پکی تحریر ایک گاؤں کی کہانی آئندہ ماہ سچی کہانیاں کے صفحات پر براجمان ہوگی۔ آپ کے شعری خیال سے ہمیں سو نہیں ہزار فیصد اتفاق ہے۔

☆ مریم شاہ بخاری شرقپور شریف سے شامل احوال ہو رہی ہیں۔ محترم ناصر انکل! السلام علیکم! خدا تعالیٰ سے آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔ امید ہے کہ آپ سب بفضل خدا خیریت سے ہوں گے۔ محترم انکل آپ کی واپسی ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ یقیناً سچی کہانیاں میں اب مزید بہتری آئے گی اور یہ ترقی کے زینے طے کرتا ہوا اپنی مقبولیت کو برقرار رکھے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) انکل' کافی عرصے کے بعد خود کو کاغذ قلم کے خوبصورت بندھن سے جوڑ رہی ہوں۔ اسی سلسلے میں یہ کہانی حاضر خدمت ہے امید ہے کہ یہ سچی کہانیاں کے معیار پر ضرور پورا اترے گی۔ اور آپ پہلے کی طرح میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ کاغذ قلم سے دوری کی وجہ میری شادی ہے۔ جی ہاں اب کچھ عرصے سے میں مریم شاہ بخاری نہیں بلکہ مسز مریم فلک شاہ بخاری ہو چکی ہوں۔ اور سرگودھا سے رخصت ہو کر شرقپور شریف آ گئی ہوں۔ آپ سے التماس ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا'

زندگی رہی تو انشاءاللہ سچی کہانیاں میں مستقل حاضری لگواتی رہوں گی۔ سب کو سلام اور دعائیں۔

◆ اچھی بھتیجی مریم فلک شاہ بخاری! تم نے اپنی شادی کی خبر سنا کر ہمارے دل کو خوشی اور مسرت سے آباد کر دیا ہے۔ اس دنیا کی تمام اچھی سچی دعائیں تمہارے لیے' اپنے میاں جی کو ہمارا سلام اور دعا دو۔ تمہاری کہانی جلد سچی کہانیاں میں شامل ہوگی۔

☆ مور شاہد حسین' قمبر شہداد کوٹ سے شریک احوال ہیں۔ پیارے انکل ناصر رضا' السلام وعلیکم! ہنسی خوشی...... صحت سلامتی کی دعائیں' نومبر کا 'سچی کہانیاں' بہترین سرورق کے ساتھ ملا۔ آنٹی منزہ سہام کا اداریہ 'چڑیاں چگ گئیں کھیت' لفظ لفظ موتی' احوال کا آغاز ملازم حسین شیرازی کے بھرپور تبصرہ سے کیا۔ فیضان حسین عثمانی' ارشد اقبال چوہان' نظر علی برمانی' عبدالغفار عابد' غلام مرتضی علوی' خواجہ حسین خواجہ' محمد سلیم اختر کا تبصرہ پسند آیا۔ ادی تحسین جونیجو' ادی زرینہ جونیجو' منشی عزیز مے کی آمد کا انتظار ہے۔ مرحومہ منورہ نوری خلیق کی تاریخی کہانیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے پر بے حد نواز۔ 'تحفۂ خاص' بہت ہی زبردست تحریر پڑھنے کو دی شکریہ۔ ریبہ خالد کھڑکی میں رکھی آنکھ اگلے حصے کا انتظار روشانے سبعین 'بے جی' سنبل 'محبت یا عزت' عمدہ تحریر تھیں۔ ملازم حسین شیرازی 'قیمت' فوزیہ اختر 'خالی ہاتھ' تسنیم کوثر' شارٹ کٹ' مہر پرویز دولو اپنی دشمن آپ' سبق آموز تحریریں تھیں' بے حد پسند آئیں رفعت محمود سبز کفن' نسیم سحر ایک سوال رُلا دینے والی عمدہ تحریریں تھیں۔ فرزانہ نگہت 'بس اچانک' افتخار چوہدری خونی صحرا نازیہ بتول رضا وہ مانگنے والی' دل کی آنکھ سے پڑھیں۔ ساحل ابڑو ایک ہوئی' عظمیٰ شکور گھر کی بات' شاہدہ ذاکر یادوں کے چراغ' ارم ناز آسمانی جوڑا اچھی تھیں پُراسرار کہانیاں غزالہ نزہت فاطمہ جنات کا استاد' اور شیما عبدالقیوم دل کی آواز اسرار سے پُر تھیں۔ شازلی سعید مغل املتاس' دوسری قسط بھی عمدہ تھی۔ آپ کی ڈائری اشعار کہانی سفر نامہ پسندیدہ سلسلے ہیں۔ م ش خ طنز کہانی بہت ہی زبردست سلسلے کا آغاز ہوا پڑھ کر مزہ آ گیا۔ زین شمسی دنیا کی سیر اچھا سلسلہ ہے۔ عمر خطاب نے مرحوم اداکار وحید مراد کی زندگی پر خوب لکھا۔ نجیب عمر مفلس کی جیب' اچھی تھی۔ انکل آپ کو ایک کہانی ارسال کی تھی وہ قابلِ اشاعت ہے یا ردی کی ٹوکری ہضم کر گئی' ایک مختصر پُراسرار کہانی پیش خدمت ہے۔ امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ آخر میں تمام چاہنے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں اپنا خیال رکھیے گا اللہ حافظ۔

◆ بھائی مور شاہد حسین! احوال میں آپ کی آمد ہمارے لیے خوشی کا باعث بنی۔ آپ کی دونوں کہانیاں جلد سچی کہانیاں کے صفحات کا حصہ ہوں گی۔

☆ فیضان حسین عثمانی' حیدرآباد سے شریک احوال ہیں۔ محترم ناصر رضا بھائی! السلام علیکم! نومبر کے احوال میں اپنی تحریر 'اسرار ہستی' کے لیے پسندیدہ کلمات پڑھ کر دلی مسرت ہوئی اُن تمام احوالی دوستوں کا شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو پسند کیا اور اپنے خطوط میں ذکر کیا۔ ناصر بھائی! اس خط کے ساتھ اپنی دو عدد نئی کہانیاں بھیج رہا ہوں ایک تو 'پُراسرار نمبر' کے لیے ہے اور دوسری کہانی

آپ جلد از جلد کسی شمارے میں جگہ دے دیں' ایسا کیوں ہے؟ آپ کو خود پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا۔ نئی قسط وار کہانی 'املتاس' کا اسٹارٹ تو اچھا ہے اب آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے' ابھی پرچہ مکمل پڑھ نہیں سکا اس لیے تبصرہ نہیں کر سکوں گا۔ میرے دوست اشعر جواد آپ کی ڈائری بہت خوش اسلوبی سے ترتیب دیتے ہیں اس لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بھائی فیضان حسین عثمانی! تمہارے خط کا زیادہ حصہ میرے اور تمہارے تعلق و گفتگو پر مشتمل تھا جو میں نے منہا کر دیا ہے کہ 'آپس کی بات' آپس میں ہی رہنی چاہیے۔ اشعر جواد کو تمہاری مبارکباد پہنچا دی ہے۔

☆ شیخ معظم الٰہی لاہور سے شریک محفل ہیں۔ جناب ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! میں امید کرتا ہوں کہ آپ اللہ پاک کے فضل و کرم سے بالکل خیریت سے ہوں گے اور میں بھی خیریت سے ہوں۔ آج کل لاہور میں اسموگ نے کئی دنوں سے ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے میں اس کی زد میں آ گیا ہوں۔ میرا گلا خراب اور بخار میں مبتلا ہو گیا آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ اب تبصرے کی طرف آتا ہوں سچی کہانیاں رسالہ ہمیشہ کی طرح روزِ اول کی طرح روشن ہے اور رہے گا انشاء اللہ۔ اس کی پہلی تاریخی کہانی پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اس کہانی کے اندر پہنچ گیا ہوں۔ کہانی کے تمام کردار میرے سامنے زندہ و جاوید ہوتے ہیں۔ لکھنے والے نے بہت ہی اچھے انداز میں لکھا ہوتا ہے۔ رسالے کی دوسری کہانیوں کی کیا تعریف کروں ایک دو کی تعریف کروں گا تو دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ہر کہانی اپنی جگہ پر فٹ ہوتی ہے۔ خیال آرائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کا شکریہ' فلمی دنیا کے ستاروں کا ذکر شروع کرنا اچھا قدم ہے۔ اللہ پاک سب لکھاریوں' قارئین اور آپ سب کو صحت و تندرستی دے آمین۔

بھائی شیخ معظم الٰہی! آپ کی صحت کے لیے بہت دعائیں آئندہ بھی احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

☆ ایم افضل کراچی سے شامل احوال ہو رہے ہیں۔ محترم ناصر بھائی! السلام وعلیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ نومبر کا شمارہ نظر سے گزرا تو ایک بار پھر دل نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ لاجواب کہانیاں اور بھرپور کاوشیں تو آپ کا خاصہ ہیں۔ مگر محترمہ رئیسہ خالد کی 'کھڑکی میں رکھی آنکھ' نے تو وہ راز افشاں کیے کہ جن سے میں اور میرے جیسے کتنے آگاہ ہی نہیں تھے۔ بہت ہی اچھا سلسلہ ہے یہ مگر پہلے شروع ہو جاتا تو کیا بات تھی۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ

تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

مگر جناب دیر آئے درست آئے۔ اختر حفیظ صاحب نے سفر کہانی میں جو گلابوں کا ذکر کیا ہے بخدا دل گلاب کے مانند کھل گیا۔ 'محبت یا عزت اور بس اچانک تو کسی فلم کی کہانی لگیں۔ جبکہ نسیم سحر کی سوال ذہن میں ایک سوال چھوڑ گئی۔ بے جی' اور شارٹ کٹ جیسی کہانیاں تو ہمارے معاشرے

میں جا بجا بکھری ہیں۔شمارے کی پہلی کہانی تاریخ کے جھروکوں سے تحفہ خاص نہیں تحفہ انمول کا درجہ رکھتی ہے ہمارے لیے تو' اشعار کہانی اور بدیسی کہانی تو مزاج کا ذائقہ ہی بدل دیتی ہے امید کہ یہ سلسلہ بھی مستقل رہے گا۔ وحید مراد صاحب کے بارے میں پڑھا بہت سے حقائق سے پردہ اٹھا' باقی سب تو معمول کے مطابق تھا بس آخر میں اتنی گزارش ہے کہ

دکھے نہ دل کسی کا یہ دھیان میں رکھنا
مٹھاس لہجے میں نرمی زبان میں رکھنا

✦ بھائی ایم افضل! آپ کا خط احوال کا خاصہ ہوتا ہے۔ آپ کہانی تحریر کرنے والے ہمارے مشورے پر کب عمل پیرا ہو رہے ہیں؟ شعر کی صورت آپ کا مشورہ تو ہم نے اپنی زندگی کے ایک اصول کی صورت ہمیشہ یاد رکھا ہے۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھار کا تجربہ یہ شعر بھی یاد دلا دیتا ہے۔

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پر داستانِ گلاب لکھنا

☆ اور یہ آخری خط ہے کسی نامعلوم مقام سے نعمان احمد آرائیں کا' جو گئے شماروں اگست' ستمبر' اکتوبر وغیرہ کے حوالے سے لکھا گیا ہے لیکن اسے شامل احوال کر رہا ہوں۔ ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! خوش آمدید تے جی آیاں نوں اور اب احوال کی طرف آتے ہیں اگست میں احوال کی محفل اچھی تھی اور ستمبر کے احوال کی طرف آتے ہیں۔ شروعات علی اصغر الا انصاری کے تبصرے سے کرتے ہیں۔ ہائیڈ پارک یا آپ کی ڈائری ایک ہی بات ہے۔ یہ سوچ کے دو الگ انداز ہیں اور آپ دونوں میں ہی خیال آرائی' مراسلے' انتخاب شامل کر سکتے ہیں' رفعت شبنم احوال میں کاشی چوہان کے دور میں بھی اہل ادب شامل تھے۔ خواجہ حسین صاحب کوئی ایسا دور نہیں آیا جس میں رسالے کا معیار کم ہوا' کہانیاں تو کافی ایسی بھی شائع ہوئیں جن میں کافی جملوں کا ادب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تو پھر وہ کہانی قابل ادب نہیں۔ اب تو انٹرنیٹ پر بہت کام ہو رہا ہے اور وہ انسان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اس سے اچھا یا برا کام انجام دیں اور ان سلسلوں میں کیا خرابی تھی جو آپ نے کہا اچھا کیا اور وہ کون سے لوگ ہیں جن کو آمد ہضم نہیں ہو رہی آپ اُن کو ظاہر کریں۔ راحت وفا مرد عورت اور عورت مرد دونوں ہی ایک دوسرے کو حقوق دینے کے لیے تیار نہیں جو اسلام نے انہیں دیے ہیں عبدالغفار عابد صاحب آپ نے کہا کہ احوالیوں کی تعداد کم ہے یہ اصلی ہیں' اس سے پہلے اصلی نہیں تھے؟ اشعر جواد' سید سرور ندیم اور عثمان کی رائے سے میں اتفاق نہیں کرتا ہوں' اسماء غفور صاحبہ مرد کے اس معاشرے میں مجرم عورت مرد دونوں ہی ہیں۔ نہ سارے مرد ایک جیسے ہیں نہ ہی عورتیں اور وہ عورتیں خود موقع دیتی ہیں۔ عورت ان خواہشوں کو پورا کرنے میں بھی کوئی مفاد ہوتا ہے۔ مجھے آپ کی رائے سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور غیرت کے نام بھی پڑھی ہے۔ عورت جو مرد کی توہین کرتی ہے۔ میرے ساتھ ایسے تین واقعات ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں

نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو اگلے ماہ احوال میں یہ باتیں شامل کردوں گا۔ اکتوبر کے احوال کی طرف آتے ہیں۔ فیضان حسین کے تبصرے سے کرتے ہیں۔ آج کل کے سید بھی نام کے ہی رہ گئے ہیں۔ سیدوں کے جوتوں کی خاک والی بات تو پیدا ہی نہیں ہوتی' ساحل ابرو صاحب آپ نے کہا آپ کی طرح اردو ادب جریدہ پڑھنے کو ملے گا پہلے نہیں ملتا تھا؟ ارشد اقبال صاحب ٹوکن تو تھا ہی نہیں تو کہاں غائب ہوگا لگتا ہے کہ آپ کو ٹوکن لگا ہے اس لیے آپ بھیجنے کو کہہ رہے ہیں۔ میجر (ر) عبدالقدوس صاحب نے اپنی شریکِ زندگی حیات کے بارے میں بہت اچھا تبصرہ کیا ہے زندہ انسان سے تو ہر کوئی پیار کرتا ہے۔ اصل پیار تو یہ ہے کہ اس کے جانے کے بعد بھی پیار کا اظہار کرے آپ نے اپنی شریکِ حیات کے نام سے کتاب شائع کروا کر اپنے پیار کا ثبوت دیا ہے۔ ناصر رضا کی رائے کاغذی تاج محل کے نام سے اتفاق کرتا ہوں اور پاک و ہند میں یہ خاصا مسلمانوں کو ہی حاصل ہے کہ جنہوں نے ایسی انمٹ نشانیاں چھوڑی ہیں اور آخر میں تمام احوالیوں' کہانیاں اور ناول 'مسئلہ یہ ہے' ہائیڈ پارک 'آپ کی ڈائری 'مراسلے 'انتخاب' خیال آرائی لکھنے والوں کو سلام عرض ہے۔ آپ نے بہت اچھا سلسلہ تیر نیم کش کیوں بند کردیا اسے فوراً رسالے میں شروع کیا جائے آپ کی بڑی عین نوازش ہوگی شکریہ اور سچی کہانیاں میں شامل تمام لوگوں کے لیے سلامتی' خوشحالی' تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز و اقارب اس دنیائے فانی سے پردہ کرچکے ہیں ان سبھی کے لیے دعائے مغفرت اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں آپ اگر واقعی اہلِ ادب ہیں تو جیسا کہ میرا خیال ہے آپ میرے احوال کو شامل کریں گے۔

◄ بھائی نعمان احمد آرائیں! آپ کا خط شاملِ احوال ہے آپ نے اپنے خط میں شہر کا نام نہیں لکھا؟ آپ نے اپنے خط میں جو لکھا اچھا لکھا' آئندہ بھی احوال میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔ اور ہاں آپ کا یہ خط اس لیے شامل احوال نہیں کیا ہے کہ میں خود کو اہلِ ادب ثابت کروں۔ بلکہ اس لیے شامل ہے کہ احوال میں خواہ تعریف ہو یا تنقید کسی کے بھی خط کی شمولیت پر کوئی قدغن نہیں ہے۔

اور اب گلزار صاحب کی اس دل میں گھر کر لینے والی نظم کے ساتھ اجازت......!

کاغذ پر گرتے ہی پھوٹے لفظ کئی

کاغذ پر گرتے ہی پھوٹے لفظ کئی
کچھ دھواں اٹھا...... چنگاریاں کچھ
اک نظم میں پھر سے آگ لگی!
جلتے شہر میں بیٹھا شاعر
اس سے زیادہ کرے بھی کیا؟
لفظوں سے آگ نہیں بجھتی
نظموں سے زخم نہیں بھرتے!

پھر ملیں گے گر خدا لایا

ناصر رضا

پُراسرار کہانی نمبر

'سچی کہانیاں' کا شمارہ فروری 2018ء پُراسرار کہانی نمبر ہوگا۔ اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں گی' جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔

جناتی کہانیاں' ارواح کہانیاں' خوف اور دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اِس پُراسرار نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی' روحانیت کے اسرار اور تصوف سے جڑی نہایت ہی اعلیٰ اور خصوصی کہانیاں بھی اِس کا حصہ ہوں گی۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست

برائے کرم اپنے آرڈر سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں

تاریخ کہانی

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی علم سے آباد ایک زندہ تحریر

منزل

حسرت موہانی کا خیال

اے زہد عشق تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لا رہے ہیں کوئے بتاں سے ہم

م۔ن۔خ

''قدِ آدم آئینے کے روبرو بیٹھی ہوئی ثنابنت سعد نے ایک بار پھر خود کو دیکھا۔اس کی شخصیت

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

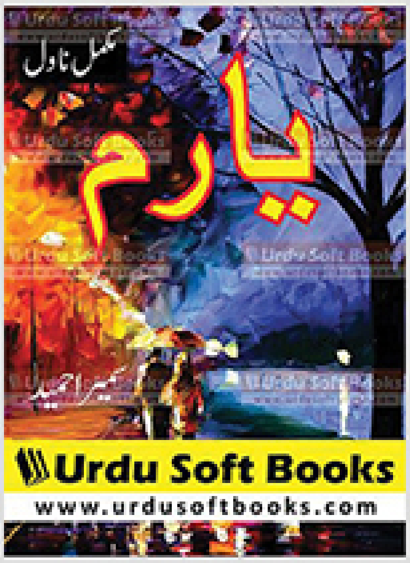

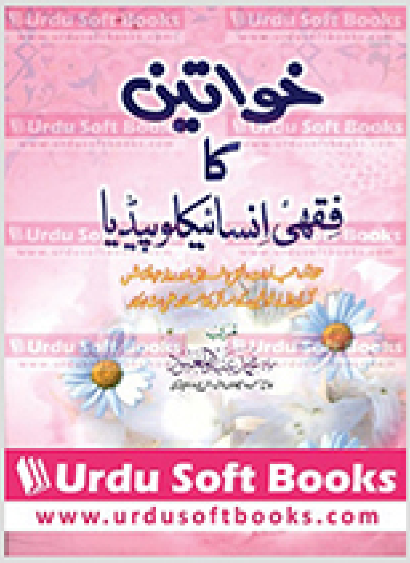

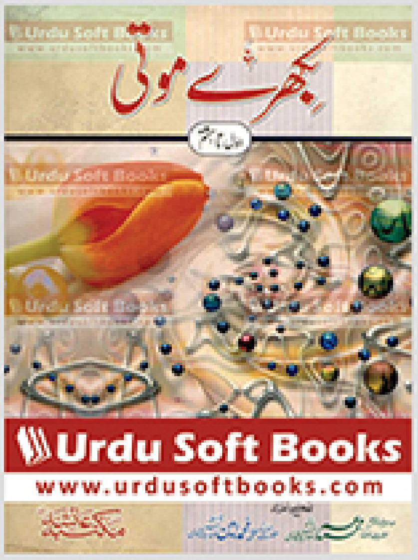

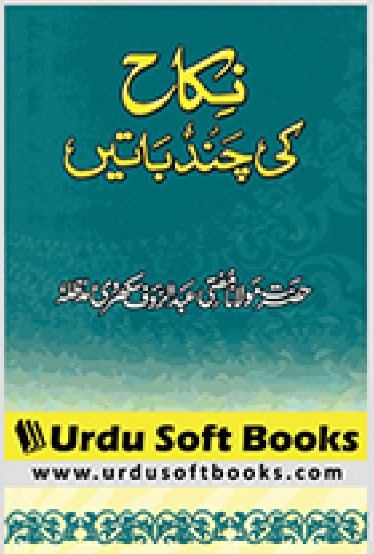

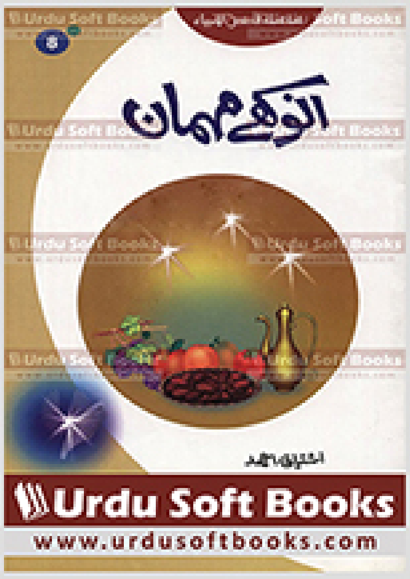

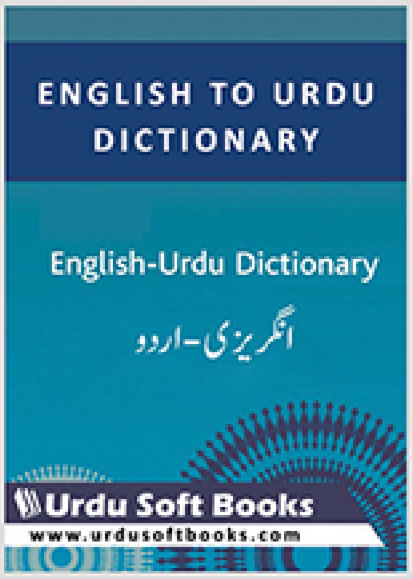

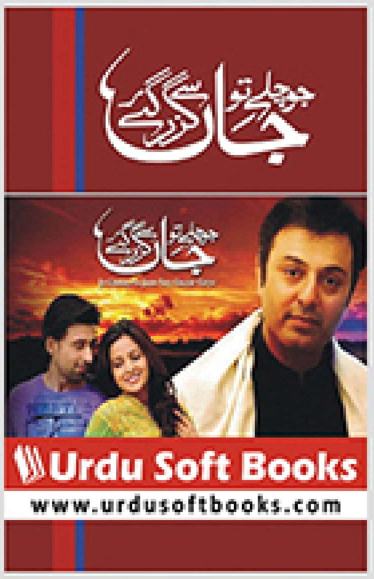

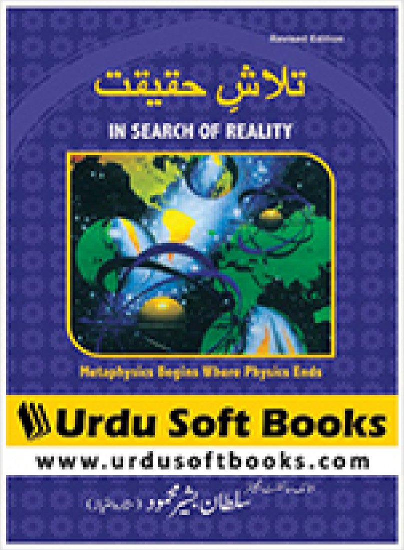

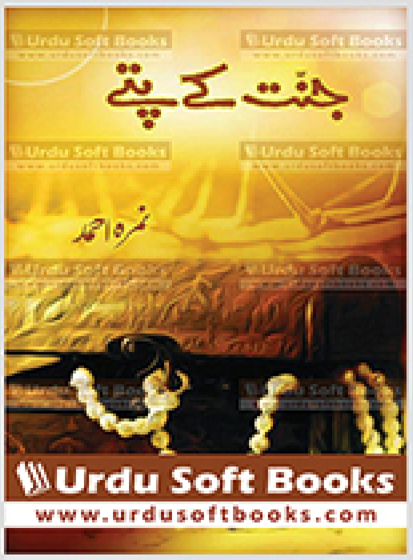

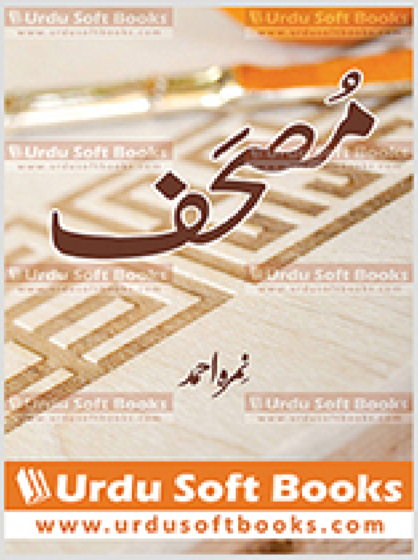

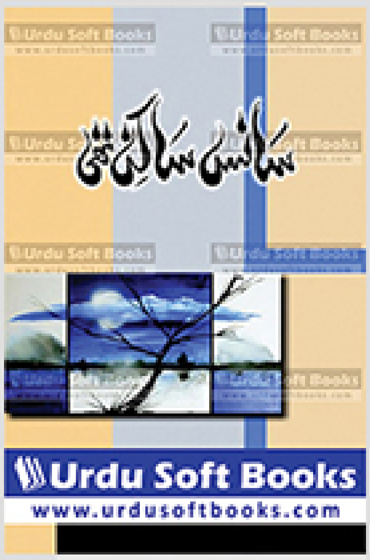

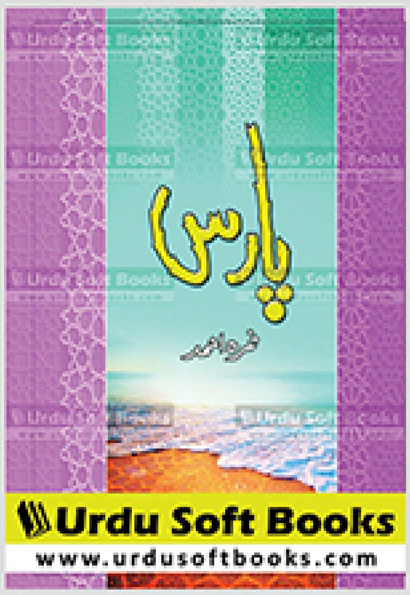

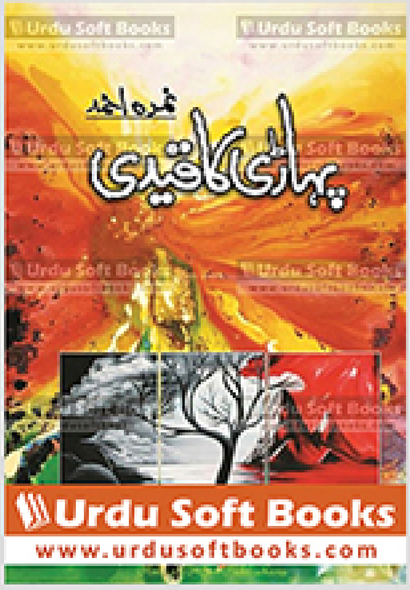

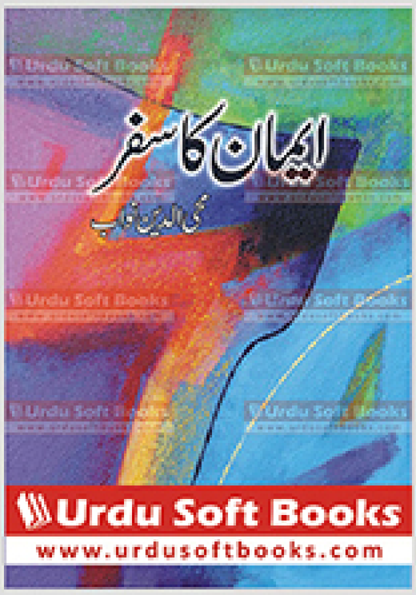

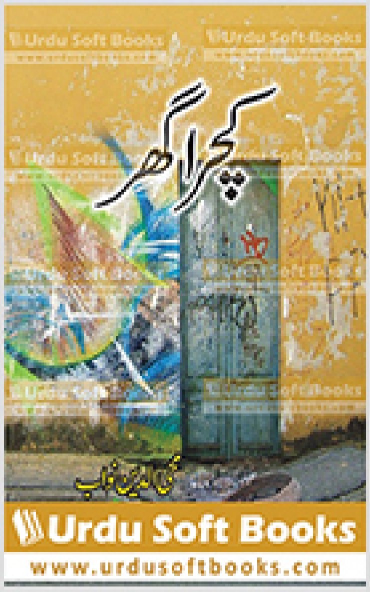

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

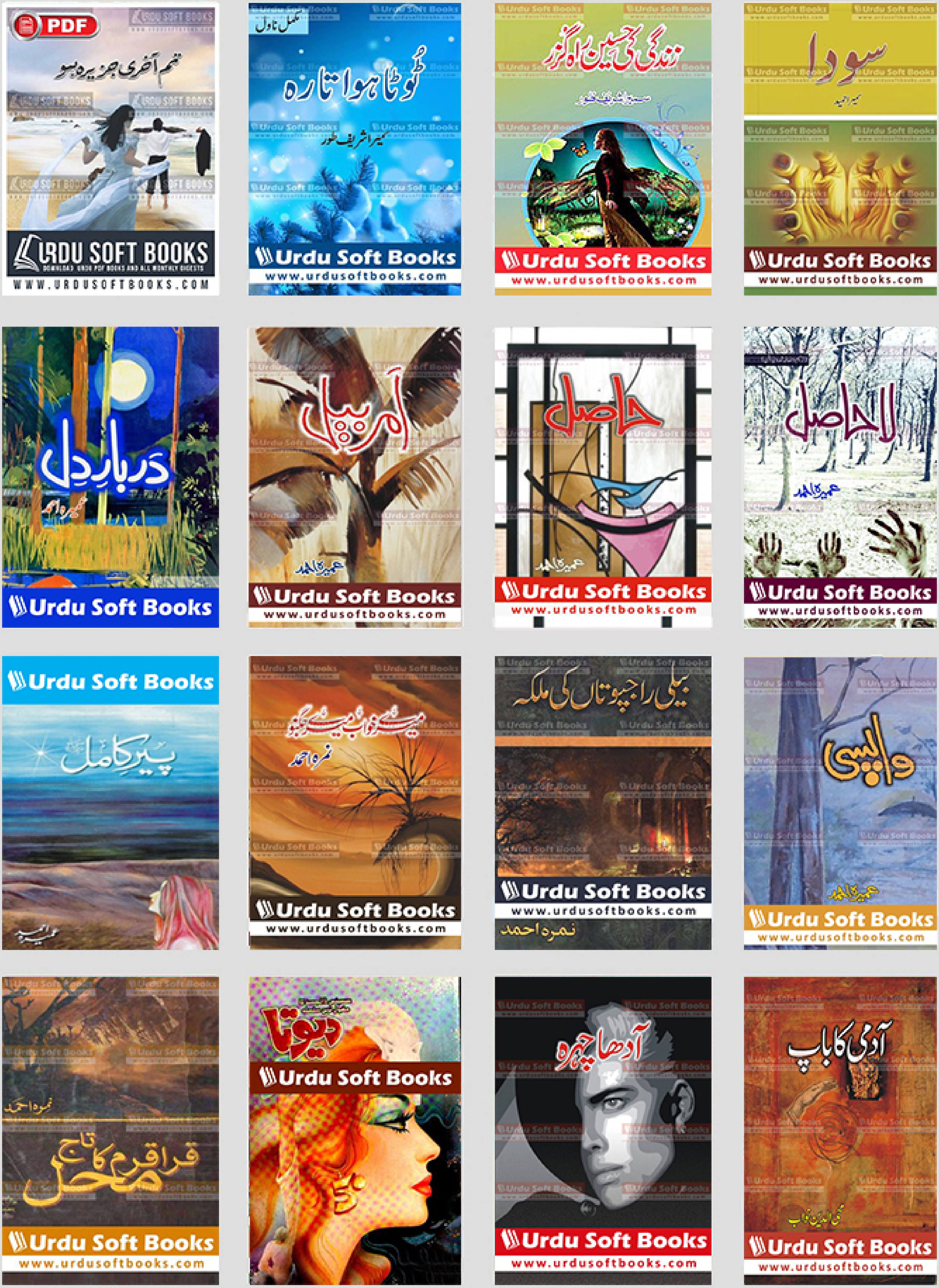

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

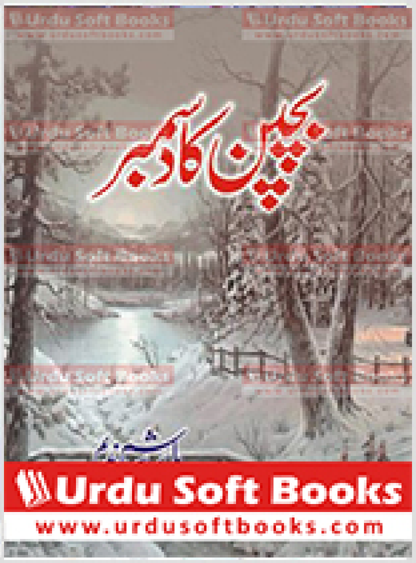

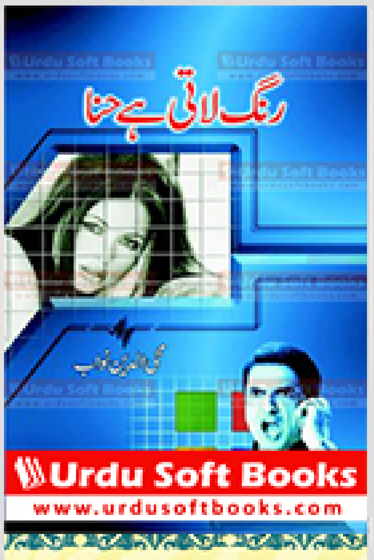

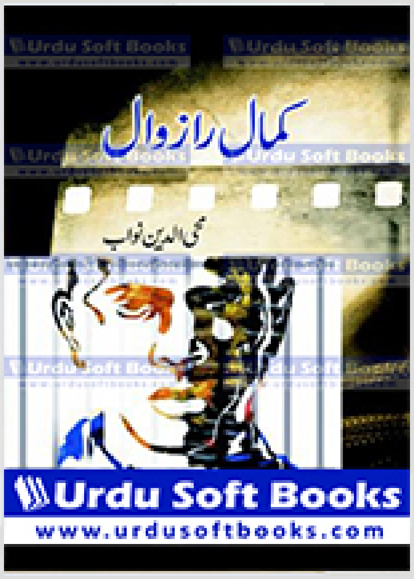

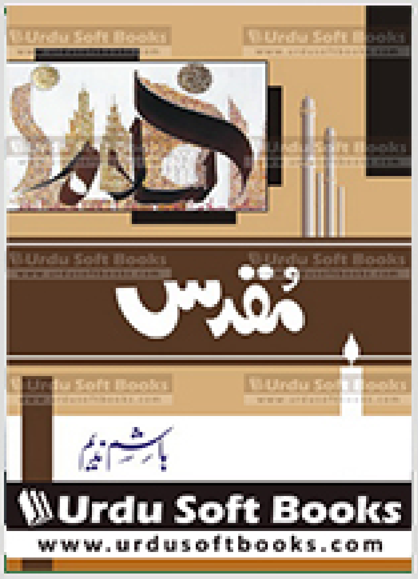

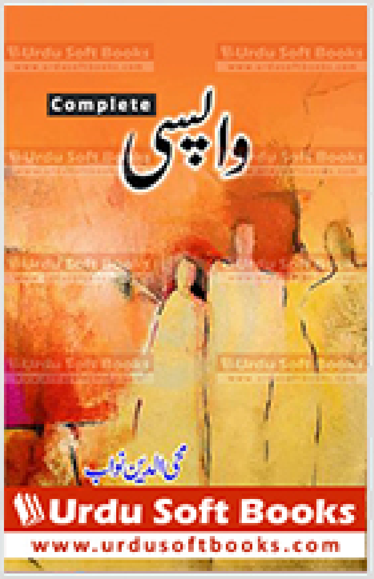

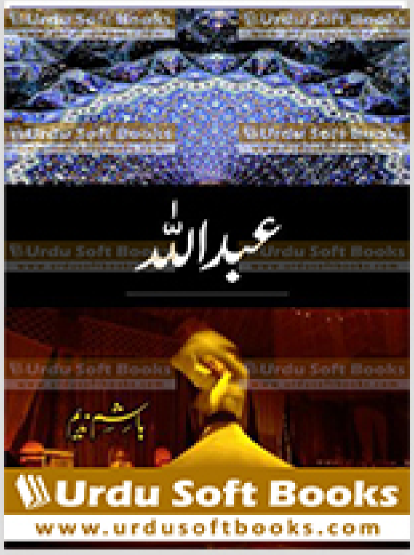

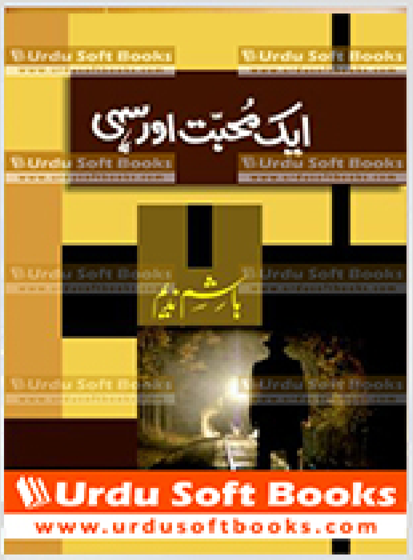

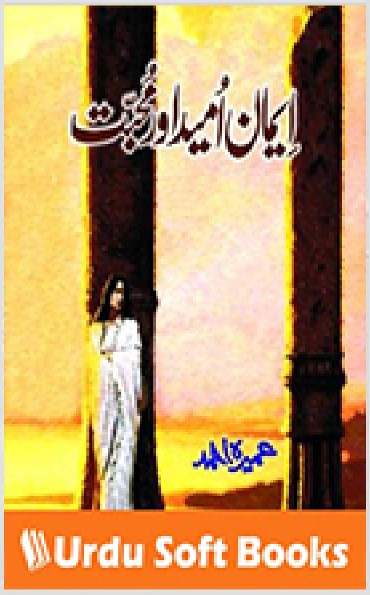

میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہاں' آنکھوں میں علم و ذہانت اور رُخ پر سکونِ قلب کے آثار ضرور تھے پھر بھی وہ گھبرا رہی تھی اور جیسے خود سے پوچھ رہی تھی۔ 'ثنا! اگر تم شرط ہار گئیں تو؟'

'تو شکست کا اعتراف کرلیں گے۔' اس نے خود ہی جواب دیا۔ 'تم نے کب کسی اور سے شرط لگائی ہے؟ ہارنے کی صورت میں کسی کو علم بھی نہیں ہوگا اور جیتنے کی صورت میں تم کیا پاؤ گی؟' دل نے سوال کیا۔

'وہ منزل جس کی طرف لاتعداد راستے جا رہے ہیں۔' عقل نے جواب دیا۔ 'اگر راستہ بھٹک گئی تو ہار جاؤ گی لہٰذا.....'

خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبوں نے اسے ہراساں سا کر دیا تھا۔ سکن پور کے جلیل القدر امیر عمار کا مکتوب سامنے تھا اور وہ جو ہر کام کو فرض اور عبادت سمجھ کر کرتی تھی' اس انوکھے فرض کے متعلق آئینے میں اپنی سادگی دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ 'تم یہ کام کر بھی سکو گی؟'

شاید یہ سوچ الفاظ بن گئی تھی جن کا جواب باہر سے آتی ہوئی معمر سودہ نے دیا۔ ''اگر تو یہ کام نہ کر سکتی تو سکن پور کے امیر تک خود تمہاری درخواست نہ پہنچاتی۔ یہ کام مشکل ہے مگر تیرے لیے نہیں۔''

''میری عظیم استانی! میری محسن! میں نے سنا ہے کہ سکن پور کے امیر لاتعداد عورتوں کو آزما چکے ہیں جن میں تجربے کار اور صاحبِ اولاد بھی تھیں' صاحبِ علم بھی لیکن سنا ہے' ہفتے دو ہفتے سے زیادہ کوئی نہیں رکتی' سب حویلی سے چلی جاتی ہیں۔''

''تم نے صحیح سنا ہے۔'' بوڑھی سودہ نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔ ''وہ سب تجربے کار اور صاحبِ علم تھیں لیکن صاحبِ دل نہ تھیں۔ محبت کے اس جذبے سے محروم تھیں جو معصوم بچوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ دیکھو ثنا! دل میں ممتا کا جذبہ ہونا اور بات ہے اور جذبے کو لٹانا اور بات۔ ضروری نہیں ہے کہ جو 'ماں' بن جائے' وہ محبت سے بھی آشنا ہو۔ جو عورتیں ابھی تک حویلی میں جاتی اور ناکام ہوتی رہیں' وہ یقیناً مائیں تھیں۔ ممتا سے بھرا ہوا دل بھی رکھتی تھیں لیکن صرف اپنی اولاد کے لیے۔ وہ دوسروں پر محبت لٹانے کے فن سے آشنا نہ تھیں۔''

ثنا بنت سعد نے اس حوصلہ افزائی پر محبت سے اسے دیکھا تو بوڑھی سودہ نے پھر کہا۔ ''ثنا! یہ مت سمجھنا کہ تمہاری ذمے داری سے میں گھبرا گئی ہوں۔ اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے ہیں۔''

''آپ میری معلّمہ اور میرے والدین کے بعد مجھے سہارا دینے والی ہیں۔ میں تو آپ کے لیے ایسا سوچ بھی نہیں سکتی' آپ کا احسان چکا ہی نہیں سکتی بلکہ آپ ہی کی دی ہوئی تعلیم میرے لیے مشعلِ راہ اور زندگی کا سرمایہ ہے۔ اب مجھے آپ کی دُعائیں چاہیے۔/ چاہئیں۔'' ثنا بنتِ سعد نے آخری بار گلے ملتے ہوئے کہا اور اپنے سفر پر روانہ ہوگئی۔

•......•......•......•

''لو بھئی' باتوں باتوں میں وقت اور فاصلے کا اندازہ ہی نہ ہوا۔ لگتا ہے' جتنا سفر ہم نے طے کیا ہے' اتنا ہی سفر طے کر کے سکن پور خود نزدیک آ گیا۔ یہ دریا کے پانی سے ٹکرا کر ادھر آنے والی ہوائیں' پھلوں کے بوجھ سے لدے ہوئے درختوں کے جھنڈ اور پھولوں کی مہک سکن پور ہی کی ہے۔''

عاص بن زید نے امیر زادہ وائل بن عمار کی

طرف دیکھا جس کے خوبصورت چہرے پر خوشی سے زیادہ تردد کا انداز تھا۔ اس طویل سفر کے بعد دونوں نے گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ دی تھیں اور شاید گھوڑوں نے بھی اپنے علاقے کو پہچان لیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص رفتار سے رواں تھے۔ اس وقت امیرزادہ وائل بن عمار کی خاموشی بے معنی نہ تھی۔ اس کا یہ زندہ دل دوست اس کے جذبات کو خوب سمجھ رہا تھا اور پھر یہی نہیں بلکہ سکن پور کے امیر عمار نے اس پر ایک بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔ اسے خوب یاد تھا' انہوں نے کہا تھا۔ ''عاص! میں نہیں جانتا کہ تمہارے والد زید سے میرے تعلقات کیسے تھے لیکن تمہیں میں اپنے فرزند وائل سے کم نہیں سمجھتا لہٰذا اپنا حق سمجھتے ہوئے کہتا ہوں کہ اسے اب زندگی کی خوشیوں کی طرف تم ہی لا سکتے ہو۔''

عاص بن زید نے یہ بات غور سے سنی تھی' امیر عمار کے رخ پر چھائی ہوئی مایوسی کو دیکھا تھا اور دھیرے سے بولا تھا۔ ''یا عم! ایک دوست اور ایک بھائی جو کچھ کر سکتا ہے' میں وہ ضرور کروں گا اور پھر ایک طبیب ہونے کے ناتے زندگی دینا میرا کام ہے۔ آپ یقین کیجیے' اس تجارتی سفر میں' میں نے وائل کے ساتھ سفر کرنے کا فیصلہ صرف اسی لیے کیا ہے کہ وہ خود کو تنہا نہ سمجھے۔''

''مجھے یقین ہے اور خوشی ہے کہ اس سفر میں تم اس کے ساتھ ہو۔'' امیر عمار نے رازداری سے کہا۔ ''ایک بات کا اور بھی خاص خیال رکھنا' یہ سفر صرف تجارتی نہیں بلکہ میں نے جہاں جہاں تم دونوں کو قیام کا مشورہ دیا ہے' اس کا ایک خاص مقصد ہے۔''

عاص بن زید نے وضاحت کے بغیر ہی اس مقصد کو بھی جان لیا تھا اور یہ سفر تجارت اور نفع لے لحاظ سے کامیاب بھی رہا تھا اور وہ دونوں کچھ جگہوں پر رکے بھی تھے لیکن قیام سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔

اگرچہ وہ سب لوگ وائل کو اچھے لگے اور انہوں نے بھی اسے پسند کیا تھا لیکن پھر ہمیشہ کی طرح وائل بن عمار پر افسردگی کا دورہ پڑا اور وہ سب کو ٹھکرا کر روانہ ہو گیا تھا' شاید اس طویل سفر میں عاص نے اس موضوع کو چھیڑنا ضروری نہیں سمجھا۔ وائل بن عمار کی کیفیت اسے ادھر آنے نہیں دے رہی تھی۔ تجارتی یا بدلتے موسم کی خشک باتوں کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں چھیڑا تھا لیکن اب عاص سے رہا نہ گیا۔ اس نے کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔

''دوست! تم جیسا بے رنگ آدمی میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ کیسے کیسے حسین نظارے سامنے آئے اور کیسی کیسی حسین صورتیں تمہیں دکھائی/ دکھائیں مگر تم رخ موڑ کر چل پڑے۔''

''تو کیا ان حسین نظاروں میں کھو جاتا؟'' وائل بن عمار نے بشاش ہونے کی کوشش کی۔ ''اگر ایسا ہوتا تو تمہیں تنہا واپس آنا پڑتا اور......''

''میں تنہا کیوں آتا؟'' عاص نے بات قطع کی۔ ''ہم تین واپس آتے اور سکن پور کے امیر عمار ہمیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔''

''ہوں......'' وائل بن عمار نے گہری سانس لی۔ ''میں جانتا ہوں' بابا جان کو میری شادی کی کتنی آرزو ہے لیکن وہ میرے احساسات کو سمجھ نہیں رہے۔''

''تم مجھے سمجھا دو اپنے احساسات' میں انہیں سمجھا دوں گا۔'' عاص نے ناگواری کا اظہار کیا۔ ''کیا وہ باپ ہو کر تمہارے

احساسات کو نہیں سمجھ پا رہے یا تم ان کے جذبات کو؟''

''حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان کے جذبات سے بے خبر نہیں ہوں۔'' وائل بن عمار نے پختہ لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ میں خود ایک باپ ہوں' جان سکتا ہوں کہ باپ کی تمنا کیا ہوتی ہے لیکن وہ میرے جذبات سے لاعلم ہیں کیونکہ وہ......''

''ہاں' ہاں' کہو کہو' رک کیوں گئے؟'' عاص نے محبت بھرے غصے سے دیکھا۔ ''تمہارا مطلب یہی ہے ناں کہ تمہارے باپ وہ مرد نہیں ہیں جن کی بیوی' بچے کی ولادت کے وقت مر گئی ہو اور وہ دوسری بیوی کے لیے لڑکی کا انتخاب کر رہا ہو' یہی نا؟''

''ہاں۔'' وائل بن عمار نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم کافی سمجھدار آدمی ہو پھر بھی مجھے الزام دیتے ہو کہ میں لڑکی کے انتخاب میں گھبرا جاتا ہوں؟ سنو میرے دوست! مرد جب پہلی شادی کرتا ہے تو معاملہ صرف اپنی ذات کا ہوتا ہے کہ بیوی نہ جانے کیسی ثابت ہو؟ اچھی بیوی بن سکے گی یا نہیں؟ تلخ زبان ہو' گھر نہ سنبھال سکے' کنبے سے نباہ نہ کر سکے' یہ سارے خوف دامن گیر ہوتے ہیں لیکن ان سب کا ایک علاج بھی ذہن میں ہوتا ہے کہ ہم بھی خود کو کچھ بدل لیں گے' آہستہ آہستہ اسے اپنی مرضی پر لے آئیں گے ورنہ پھر مرد بن کر اپنی مرضی چلائیں گے لیکن دوسری شادی کے وقت مسئلہ صرف اپنی ذات یا اپنے عیش و آرام کا نہیں ہوتا۔ ہم کسی کے دل میں گھس کر اپنی اولاد کے لیے محبت تو نہیں ڈال سکتے نا؟''

وائل بن عمار کا لب و لہجہ ایسا تھا کہ عاص کچھ نہ کہہ سکا' شاید یہ برجستہ گو دوست لاجواب رہ گیا تھا یا کوئی جواب دینا چاہتا تھا مگر کوئی بھی جواب وائل بن عمار کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔

وہ حویلی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ بڑے پھاٹک پر ہی گھوڑوں کو تھامنے کے لیے مروان موجود تھا۔ اس نے سلام کیا اور لگامیں تھام لیں۔ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے انہیں لگا' چمنستان میں آ گئے ہیں۔ طویل و عریض صحن میں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے۔ دائیں طرف چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد نشست گاہ کا دروازہ تھا لیکن ادھر رخ کرنے سے قبل ہی سامنے درختوں کے درمیان موجود دو ہستیوں نے جیسے تمام تھکن اتار دی تھی۔ بیک وقت باپ اور بیٹے کا دیدار وائل بن عمار کے لیے مسرور کن تھا۔ امیر عمار اپنے چار سالہ پوتے عاطر کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ عاطر کے بڑے سر کو چھوٹے چھوٹے گھونگریالے بالوں نے ڈھکا ہوا تھا۔ پیالے کی طرح گول اور چمکتے ہوئے چہرے پر صحت مندی کی سرخی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں چمک اور معصومیت کے ساتھ ذہانت تھی۔ وائل بن عمار نے اپنے بیٹے کو دیکھا جو بلاشبہ حسن و وجاہت میں اس کا عکس تھا۔ اس کا دل چاہا' دوڑ کر اسے سینے سے لگا لے' تبھی اس نے ادھیڑ عمر کے باپ کو دیکھا جس کے رخ پر پسینے کے قطرے اعلان کر رہے تھے کہ وہ گھنٹوں سے اس بچے کے ساتھ مصروف رہا ہے۔

دوسرے ہی لمحے چشم تصور اسے ایک دس سالہ بچے تک لے گئی جس کا باپ طویل سفر سے لوٹا تھا اور وہ ہاتھ اٹھا کر اسے اپنی طرف بلانا چاہتا تھا مگر سفر سے واپس آنے والا باپ اس تک پہنچنے سے پہلے راستے میں کھڑے اپنے باپ کے گلے لگ گیا تھا' تب اس نے خفگی سے کہا تھا۔ ''جایئے

بابا جان......! ہم آپ سے نہیں بولتے، آپ پہلے ہم سے نہیں ملے۔ کیا ہم آپ سے محبت نہیں کرتے؟''

تب اس نے اس ناراض بچے کو بازوؤں میں لے کر سرگوشی کی تھی۔ ''بیٹے! آپ ہم سے دس سال سے محبت کرتے ہیں اور دادا جان چالیس سال سے، اب بتایئے، کیا ہم پہلے انہیں سلام نہ کرتے؟''

یہ سنتے ہی لمحہ بھر میں بچے کا غصہ ختم ہوگیا اور وہ محبت سے دادا جان کو دیکھنے لگا۔ وہ محبت سے آگے بڑھا اور دادا سے چمٹ گیا۔ امیر عمار نے اسے سینے سے لگالیا۔

''کیسے ہو وائل؟ سفر کیسا گزرا؟''

''میں ٹھیک ہوں بابا جان!'' وائل بن عمار نے کہا۔ ''آپ کیسے ہیں؟''

''اپنے عاطر کی خبر لو۔'' امیر عمار نے اسے جس محبت سے سینے سے لگایا تھا، اتنی ہی چاہت سے الگ کیا۔

''کیا اس کی خبر لینے کے لیے آپ کافی نہیں ہیں؟'' وائل بن عمار نے عاطر کو بازوؤں میں بھر لیا پھر اس کی انگلیاں معصوم بچے کے بالوں اور رخساروں کو چھونے لگیں۔ امیر عمار نے بیٹے اور پوتے کے اسی ملاپ کو بڑی مسرت سے دیکھا اور بولے۔

''اگر میں اس کی خبر گیری کو کافی ہوں تو مجھ پر ہی اعتماد کیوں نہیں کر لیتے؟''

اب تک عاص اپنا گھوڑا مروان کے حوالے کر کے اپنا سفری تھیلا لیے نزدیک آچکا تھا۔ امیر عمار نے اسے بھی سینے سے لگایا، عاطر کو اس نے بھی پیار کیا، تبھی اسے ایک دم یاد آیا کہ ننھا منا سا یہ بچہ سفر سے آتے ہی بے جا ضد کیا کرتا تھا کہ مجھے بھی سفر پر لے جاؤ اور جب تک امیر عمار، وائل یا خود عاص اسے گھوڑے پر بیٹھا/بٹھا کر قرب و جوار کا چکر نہ لگا لیتے، وہ روتا ہی رہتا تھا لیکن آج ایسا نہیں تھا، شاید وائل خود بھی حیران تھا اور عاص بھی لیکن قبل اس کے کہ وہ اظہار کرتے، عاطر نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بل کھاتے زینے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''بابا جان......! آپ میری دوست سے ملیں گے؟''

''دوست؟'' وائل بن عمار نے دریافت کیا۔

تب امیر عمار ان سب کو نشست گاہ کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے اپنے پوتے کے لیے ایک نئی مربیہ رکھی ہے۔ یہ بہت جلد اس سے مانوس ہوگیا ہے۔ ''دوست'' کہتا ہے اسے۔''

وہ سب نشست گاہ کی طرف چل دیئے، کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس گھر میں مربیہ کا رکھا جانا کوئی اہم بات نہیں تھی۔ عاطر نے ماں کی گود میں تو چند سانس ہی لیے تھے پھر تو نگہداشت کے لیے کسی نہ کسی کا سہارا لیا ہی جاتا تھا۔ اب تک شاید اس بچے کو کوئی سمجھ نہ پایا تھا یا خود اس بچے نے کسی کو قبول نہ کیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ ہر دوسرے مہینے امیر عمار کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا تھا۔

''چار سالہ بچے کی نگہداشت کے لیے مربیہ کی ضرورت ہے۔''

یہ اعلان سننے کے بعد ضرورت مند عورتوں کی قطار آموجود ہوتی۔ سب لائق و فائق اور بہترین کارکردگی کی دعوے دار ہوتیں۔ امیر عمار ہر طرح گفتگو کرتے اور آخر میں کسی صاف ستھری شخصیت و اطوار اور تجربے کار خاتون کو ترجیح دیتے۔ ان کے خیال میں بچے کی پرورش کے لیے تجربے

کاری اولین شرط تھی۔ اس طرح وہ سب حویلی میں آتی رہیں لیکن نہ عطار کی ضد کم ہوتی نہ وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتا اور نہ امیر عمار کی ذمے داری کم ہوتی۔

عاطر کو جو ضد بھی ہو جاتی' اسے پورا کرا کر ہی دم لیتا ورنہ توڑ پھوڑ اور رونا چلانا شروع کر دیتا' شاید یہ بھی اپنی بات منوانے کا ہتھیار تھا۔ اس نے یہی انداز اپنا لیے تھے۔ ایسے میں اس کی آیا چور بن کر رہ جاتی اور امیر عمار کے سامنے قسمیں کھاتی اور کہتی۔ ''امیر......! امیرزادہ بلاوجہ ہی چیخیں مار رہے ہیں' میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''کہیں عاطر کو چوٹ تو نہیں لگی؟'' امیر عمار پوتے کے ہاتھ پاؤں دبا کر محسوس کرتے' گردن اور پشت دیکھتے۔

آیا منمنانے لگتی۔ ''نہیں امیر......! میں تو ہر وقت امیرزادے پر نظر رکھتی ہوں' انہیں چوٹ نہیں لگی۔''

''لیکن بھئی' بھلا بچہ بغیر سبب کیسے رو سکتا ہے؟'' امیر عمار بری طرح بے چین نظر آنے لگتے۔ کبھی کچھ کرتے' کبھی کچھ لیکن سمجھ نہ پاتے اور آیا بھی حواس باختہ سی طرح طرح سے عاطر کو سنبھالنا چاہتی پھر چند دن کے اندر اندر اس کی اعلیٰ کارکردگی کا دعویٰ' تجربہ اور علم بے معنی لگتا اور وہ بوریا بستر سمیٹ کر رخصت ہو جاتی اور امیر عمار دو دن بعد ہی پوتے کو سنبھالنے میں ناکام ہو کر دوسرا اعلان کرتے۔

''بچے کی نگہداشت کے لیے سمجھدار اور تجربے کار آیا کی ضرورت ہے۔''

یوں اعلان ہوتے رہے' آیائیں آتی جاتی رہیں عاطر کی ضدیں بڑھتی رہیں۔ ان سے گھبرا کر امیر عمار' بیٹے سے کہتے۔ ''وائل! بچے کو ماں کی ضرورت ہے۔''

مگر وائل بن عمار ''ماں'' لانے سے معذور تھے۔ انہوں نے لاتعداد لڑکیاں دیکھیں' متعدد لڑکیوں نے انہیں پسند کیا مگر بات نہ بنی اور انہیں بار بار اپنے عظیم باپ کو مایوس کرنا پڑا۔ وہ مایوس ہو کر اپنے پوتے سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ وہ اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔

اس بار پھر انہوں نے اعلان کیا تھا جس کے جواب میں جہاں لاتعداد عورتوں کی قطار بنی' وہاں امیر عمار کو ایک سادہ سی درخواست بھی وصول ہوئی۔ لکھا تھا۔

''سکن پور کے عظیم امیر......! اس ملازمت کے لیے درخواست پیش کرنے سے قبل میں اس بچے کے ساتھ ایک ہفتہ گزارنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ کروں گی کہ یہ کام میرے لیے آسان ہے یا نہیں کیونکہ اپنی صلاحیتوں کو آزمائے بغیر دعویٰ کرنا میری عادت نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے آزمائش کا ایک ہفتہ دیں گے؟''

یہ سطور پڑھ کر امیر عمار چونک گئے۔ انہیں لگا کہ درخواست دینے کا یہ انداز انوکھا ہے۔ اسے ضرور موقع دینا چاہیے' تب انہوں نے منظوری دے دی لیکن اس نوعمر دبلی پتلی سی لڑکی کو دیکھ کر وہ پھر حیران ہوئے اور ایک دم بولے۔ ''لڑکی......! تم تو بہت کم عمر ہو اور میرا خیال ہے' تمہیں اس کام کا تجربہ بھی نہیں ہوگا؟''

''میں نے 'تجربے کار' ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا۔'' ثنا نے جواب دیا۔ اس کے لہجے کی پختگی' بے پناہ اعتماد اور الفاظ صاحب علم ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

امیر عمار کو یہ بات پسند آئی' انہوں نے

سوچا۔' امیر عمار! تمہارے ضدی پوتے سے تو معمر تجربے کار آیائیں بھی بھاگ گئیں' یہ لڑکی بھی چلی جائے گی لہٰذا ابھی سے مایوس کیوں ہو رہے ہو؟ اسے ایک ہفتہ گزار لینے دو۔'

تب انہوں نے پورے اخلاق کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا اور اپنے پوتے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔ ثنا نے بڑے غور سے سنا اور جب وہ چار برس کی روداد سنا چکے تو وہ بولی۔

''مہربان امیر...... !سب سے پہلے میں آپ سے ایک گزارش کروں گی کہ آج اس لمحے کے بعد آپ کبھی اپنے پوتے کو موضوع مت بنایئے۔ اسے دوسروں کے سامنے پیش مت کیجیے بلکہ اسے موقع دیجیے کہ وہ خود کو پیش کر سکے۔''

امیر عمار نے تعجب سے اس لڑکی کو دیکھا جس نے بہت گہری بات کی تھی اور یقیناً اس کا علم' عمر سے بہت زیادہ تھا۔ وہ اگر مرعوب نہیں تو متاثر ضرور ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ثنا نے کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اس سے میرا تعارف مت کرایئے' میں خود اس سے ملوں اور وہ خود آپ سے میرا تعارف کرائے؟''

''ضرور' ضرور۔'' امیر عمار نے اتنا ہی کہا اور اسے اوپر کا راستہ دکھایا جہاں سے توڑ پھوڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔

اس شام امیر عمار اپنی نگرانی میں غلام سے پودوں کی تراش خراش کرا رہے تھے کہ چار سالہ عاطر نے ایک دم ہی انہیں پکارا۔ ''دادا جان...... !میری دوست سے ملیے۔''

امیر عمار نے دیکھا' وہ ثنا کی انگلی پکڑے ان کی طرف آرہا تھا۔ ثنا نے انہیں دیکھا اور عاطر سے بولی۔ ''یہ آپ کے دادا جان ہیں۔''

''ہاں۔'' عاطر نے فخر سے کہا۔ ''دیکھا' کتنے اچھے ہیں۔''

''ہاں' بہت اچھے ہیں۔'' ثنا نے کہا۔ ''اب آپ ان سے اجازت تو لیجیے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔''

''دادا جان! کیا میری دوست یہاں رہ سکتی ہیں؟'' عاطر نے پوچھا۔

''ہاں' ہاں' میری جان! تمہاری دوست جب تک دل چاہے' یہاں رہ سکتی ہیں۔'' امیر عمار نے اپنی حیرانی چھپاتے ہوئے کہا۔

اور پھر سات دن کی یہ آزمائش اس امیر کو بار بار حیران کرتی رہی۔ روز کی طرح عاطر کو پھر ضد سی ہوگئی۔ ''میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' امیر عمار پریشان ہوگئے۔ دسترخوان پر عاطر کو ضد چڑھتی تو وہ گھنٹوں بھوکا بیٹھا رہتا۔ امیر پیار سے اصرار کرتے' غلام خوشامد کرتے' اس وقت ہر نظر میں ہمدردی ہوتی' چار سالہ بچہ اتنی دیر سے بھوکا ہے۔ اس دن بھی وہ مچل گیا۔ ''میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

''اچھا' ہمارے چھوٹے دوست کو بھوک نہیں ہے۔'' ثنا نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں' جب بھوک محسوس ہوگی' کھالیں گے۔ امیر......! آپ ان سے اصرار مت کیجیے' آیئے' ہم کھانا شروع کر دیتے ہیں۔''

امیر عمار کو یہ بات عجیب لگی۔ خود عاطر کو بھی تعجب ہوا۔ اس کی چیخ و پکار پر سب کھانا چھوڑ دیتے تھے لیکن آج کھانا شروع کیا جا چکا تھا۔ اسے نہ کسی نے ڈانٹا تھا نہ اصرار کیا تھا نہ زبردستی کی جا رہی تھی۔ امیر عمار اور ثنا کھانا شروع کر چکے تھے۔ عاطر نے کھانے پر نظر ڈالی۔ اپنی ضد سے باز آجانا اور ہتھیار ڈال دینا اس کی انا اور

خودداری کے خلاف تھا اور خوشامد کرنے والی ہستیوں میں سے کسی نے خوشامد نہ کی تھی۔ کوئی پلیٹ میں کھانا ڈال کر پیچھے نہیں چلا تھا لہٰذا اس نے خود دسترخوان پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''میں سلاد کھاؤں گا۔''

ثنا نے جملہ سنا اور جلدی سے سلاد کی پلیٹ نکال کر اسے دی۔ عاطر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''میں ہڈی والی بوٹی لوں گا۔''

''ہاں' ہاں' ضرور۔'' ثنا نے مرغی کی بھنی ہوئی ٹانگ اس کی طشتری میں رکھ دی پھر امیر عمار اور ثنا کن انکھیوں سے اسے کھانا کھاتے دیکھتے رہے۔

چند دن گزرے کہ اچانک ایک دن اس نے غلام کو حکم دیا۔ ''جگ کا تمام پانی میرے گلاس میں ڈال دو۔''

''لیکن امیر زادے......! اتنے بڑے جگ کا پانی چھوٹے گلاس میں نہیں آ سکتا۔'' غلام نے پیار سے سمجھایا لیکن عاطر سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اپنی بات کی نفی سنتے ہی پرانا ہتھیار استعمال کرنے پر تل گیا تھا اور چند منٹ کے اندر اندر شور مچانے لگا۔ وہ چیخ پکار کرنے لگا۔ وہ امیر سے لے کر کسی غلام تک کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ بالائی منزل سے آتے ہوئے ثنا نے اس منظر کو دیکھا' غلام پانی کا جگ ہاتھ میں لیے کھڑا اسے سمجھا رہا تھا۔ ''چھوٹے امیر! اتنا پانی اتنے چھوٹے گلاس میں نہیں آ سکتا۔''

اور عاطر شور کر رہا تھا۔ ''میں جگ کا سب پانی پیوں گا' اس گلاس میں ڈالو۔''

ثنا نیچے آئی' اس نے غلام سے جگ لیا اور بولی۔ ''لو' اپنا گلاس بھرلو۔'' پھر عاطر نے رونا چھوڑ کر گلاس آگے کر دیا اور ثنا جگ اس میں انڈیلنے لگی پھر گلاس بھر گیا اور جگ کا پانی بہتا رہا' تب بے ساختہ عاطر نے کہا۔ ''بس...... بس......''

''مگر آپ نے تو کہا تھا کہ سب پانی گلاس میں انڈیل دو۔'' ثنا نے کہا۔

عاطر نے اسے جھینپی جھینپی نظروں سے دیکھا اور گلاس لبوں سے لگا لیا۔ امیر عمار کے لیے یہ نیا انداز تھا۔ ثنا نے دھیرے سے کہا۔ ''امیر......! آپ نے غور کیا' بچہ ضد کرتے وقت خود بھی یہ جانتا ہے کہ اس کی ضد غلط ہے اور اسے شرمندہ ہونا بھی آتا ہے لیکن بہترین علاج یہ ہے کہ اسے ضد مت دلائیں۔ جس بات کے ماننے میں کوئی نقصان نہ ہو' بات مان لیں۔''

مگر یہ بات اس نے اس طرح کہی تھی کہ عاطر سن نہ سکا بلکہ چند قطرے منہ میں ڈال کر باقی پانی جگ میں واپس ڈال رہا تھا اور بھول گیا تھا کہ ابھی ابھی کیا ضد کر رہا تھا۔

یوں دن گزرتے رہے اور ضد کا وقفہ کم ہوتا گیا۔ عاطر' ثنا کے قریب آتا گیا اور آزمائش کے سات دن گزر گئے' تب امیر عمار نے دریافت کیا۔ ''ثنا! آج سات دن پورے ہو گئے' اب بتاؤ' کیا تمہارے لیے یہ ذمے داری اٹھانا آسان ہے؟''

''ہاں' میرے لیے یہ ذمے داری اٹھانا مشکل نہیں ہے لیکن جب تک میں یہاں ہوں' اس بچے کے کلی اختیارات مجھے دے دیجیے۔''

''اور تم کب تک یہاں ہو؟'' امیر عمار نے بے ساختہ دریافت کیا۔

''مختلف فرض مختلف اوقات میں ہمیں آواز دیتے ہیں۔ جب بھی کسی فرض نے مجھے پکارا' میں چلی جاؤں گی۔'' ثنا نے کہا تھا۔

اگلی صبح تک امیر زادہ وائل بن عمار اور عاص کی تھکن اتر چکی تھی۔ بڑے ہشاش بشاش سے وہ غسل کر کے ناشتے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے اور شاید ہمیشہ کی طرح عاطر کا انتظار کر رہے تھے۔ وائل کے ساتھ والی نشست عاطر کے لیے خالی تھی اور امیر عمار کی ساتھ والی نشست پر عاص بیٹھا ہوا انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے لیے چمچ چمچ شہد کھا رہا تھا' تبھی سامنے سے آتے ہوئے عاطر اور اس کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ دونوں ہی چونک گئے۔ اس لڑکی پر مربیہ یا آیا کا لفظ کسی طور پر بھی نہ جچتا تھا۔ تجربے کار اور صاحب علم کے الفاظ اور عاطر کی شخصیت میں خوبصورت سی تبدیلی کسی معمر اور رعب دار آیا کا تصور پیش کر رہی تھی لیکن اس لڑکی میں تو کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں۔

''السلامُ علیکم!'' کی آواز سنتے ہوئے وائل نے اپنے بیٹے کی نگہداشت کرنے والی اس لڑکی کو دیکھا جوان کی طرح باقی سب کی طرف بھی متوجہ تھی۔ امیر عمار نے سلام کا جواب دیتے ہوئے تعارف کرایا۔

''یہ میرا بیٹا' عاطر کا باپ وائل بن عمار ہے اور یہ وائل کے عزیز ترین دوست عاص بن زید ہیں۔'' یہ کہہ کر امیر نے ان دونوں کو دیکھا اور کہا۔ ''یہ ثنابنتِ سعد ہیں' ہمارے ننھے عاطر بن وائل کی دوست اور ساتھی۔''

عاطر نے بڑی خوشی محسوس کی۔ ثنا نے تعارف کے بعد وائل بن عمار کو دیکھا' اس کی نظروں میں ذہانت اور شائستگی تھی۔ سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔ ''میں نے پہچان لیا تھا۔ عاطر آپ سے بہت ملتا ہے۔''

لمحہ بھر کے لیے وائل کو یوں محسوس ہوا جیسے گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔ اسی وقت ثنا نے عاص کو دیکھا' وہ مسکراتے ہوئے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میرے نزدیک بیٹھ جائیے' مجھے آرام رہے گا۔''

''پھر تو آپ کی خوشی مشروط ہوئی۔'' ثنا نے اس بے تکلفی کو پسند کیا۔

''ارے بھئی' اس دنیا میں کوئی شے بغیر شرط کے ہوتی ہے۔'' عاص نے تفصیل گنوائی۔ ''کھانے کے لیے بھوک کی شرط' سونے کے لیے نیند شرط' نماز کے لیے وضو شرط' جنت کے لیے اعمال شرط' تقریر کے لیے سامعین۔''

''اور تمہارے چپ رہنے کے لیے؟'' وائل نے اس کی بات کاٹی۔

''تمہارے جیسے خشک آدمی کی موجودگی کی شرط۔'' عاص نے برجستہ کہا۔

سب ہی ہنس دیئے۔ اب تک ثنا' عاطر کو وائل کے ساتھ والی نشست پر بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی تھی۔ عاص نے اس منظر کو پریشانی کے انداز سے دیکھا اور بولا۔ ''کر دیا نا مجھے مایوس۔ میں چاہتا تھا' آپ میرے نزدیک بیٹھیں۔''

''لیکن میں آپ سے دور بیٹھ کر بھی آپ کی فرمائش پوری کر سکتی ہوں۔'' ثنا نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''آپ بتائیے' آپ کو دسترخوان پر رکھی ہوئی کون سی شئے چاہیے؟ دودھ' شہد کا مرتبان' پھلوں کی طشتری یا پھل کاٹنے کے لیے چاقو؟''

اس وقت وائل بن عمار اور عاص بن زید دونوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات تھے اور امیر عمار زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا رہا تھا۔ عاص نے کہا۔

''سچ بتائیے' آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ

اس دنیا میں کوئی شئے بغیر شرط کے نہیں ہوتی۔'' ثنا نے کہا۔ ''اس وقت نزدیکی نشست پر بٹھانے کی شرط اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوسکتی۔''

یوں خوشگوار سے ماحول میں وہ سب ناشتا کرنے لگے پھر ایک دم ہی عاطر نے کہا۔ ''دوست' تم نے کہا تھا' آج ناشتے کے بعد ہم چمن میں ایک نیا کھیل کھیلیں گے۔''

''ہاں' میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ جب آپ اپنی طشتری خالی کرلیں گے' دودھ کا پورا گلاس پئیں گے' تب میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔''

''اور اگر میں یہ سب نہ کھاؤں؟'' عاطر نے پوچھا۔

''تو میں بھی اپنا وعدہ پورا نہیں کروں گی۔'' ثنا نے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ ایک بات بڑے' بچوں کی مانتے ہیں اور ایک بات بچے' بڑوں کی۔''

یہ سن کر عاطر جلدی جلدی کھانے لگا اور جب جب ثنا دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگاتی' وہ ایک گھونٹ پی لیتا۔ اس وقت سب چشمِ تصور سے اس بچے کو دیکھ رہے تھے جو اگر مرضی نہ ہوتی تو دسترخوان الٹ دیتا تھا مگر ایک نوالہ نہیں کھاتا تھا اور پورا پورا دن بھوکا رہتا تھا۔ کس کی محبت یا کسی کی خوشامد اسے مجبور نہ کرسکتی تھی۔ اس وقت وہی بچہ بڑوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کے رخ پر نہ زردی تھی نہ کمزوری۔ عاطر نے ناشتا ختم کیا۔ ثنا نے رومال سے اس کے ہاتھ اور منہ صاف کیے پھر بولی۔ ''آپ جن کھلونوں سے کھیلنا پسند کرتے ہیں' انہیں الگ کرلیجیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

عاطر کسی تابعدار بچے کی طرح چلا گیا۔ ثنا پیالی میں قہوہ ڈالنے لگی اور بولی۔ ''کیا آپ میں سے کوئی قہوہ پینا پسند کرے گا؟''

''ضرور۔'' عاصم نے کہا۔ ''میں تو ضرور پیوں گا۔''

وائل بن عمار نے کہا۔ ''میں بھی آپ دونوں کا ساتھ دوں گا لیکن اس سے پہلے اس بات پر داد دوں گا کہ بہت کم وقت میں آپ نے عاطر کو خود سے بہت مانوس کرلیا ہے اور اس وقت تو کمال ہی کردیا۔ اسے اپنی مرضی کے مطابق ناشتا کرادیا ورنہ ہم سب دن دن بھر کوشش کرتے تھے' اس کے پیچھے پھرتے تھے مگر وہ اتنا نہیں کھاتا تھا۔''

ثنا نے اس کی پوری بات سنی اور قہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ نے بہت اچھا کیا جو یہ بات عاطر کے سامنے نہیں کی۔ اب ایک بات کی خاص احتیاط رکھیے کہ کبھی بھی بچے کے سامنے یہ مت کہیے گا کہ وہ کھاتا نہیں' کھیلتا نہیں یا دوسروں میں گھلتا ملتا نہیں کیونکہ بچہ جو بات اپنے بارے میں والدین یا دوسرے محبت کرنے والوں سے سنتا ہے' اس کے خلاف کرنا پسند نہیں کرتا۔ کبھی کبھی بڑوں کی مرضی پر پورا اترنے کی آرزو میں وہ زندگی بھر اپنی خواہشات کا اظہار نہیں کرتا اور ایک دبی ہوئی شخصیت بن کر رہ جاتا ہے۔''

وائل بن عمار ستائشی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے قہوہ پی رہا تھا۔ عاصم نے اعتراف کے انداز میں کہا۔ ''بنتِ سعد! انسانوں کے بارے میں اتنی نفسیات آپ نے کہاں سے سیکھی؟''

''انسانوں سے۔'' ثنا نے برجستہ کہا۔ ''انسانوں کے بارے میں صحیح علم انسانوں ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا آپ نے سنا نہیں' کسی دانش ور کا قول ہے کہ زمانہ سب سے بڑا استاد ہے؟''

''لیکن اس استاد سے علم حاصل کرنے کے لیے بھی وقت کی ضرورت تو ہوتی ہے ناں' آپ نے یقیناً اتنا وقت نہیں گزارا کہ زمانے سے سبق سیکھ سکتیں۔''

ثنا کو ہنسی آ گئی۔ اسے کم عمر کہنے کا یہ انداز خوبصورت تھا۔ وہ مبہم الفاظ میں بولی۔ ''بے شک آپ کی بات درست ہے لیکن اس کا کچھ نہ کچھ انحصار شاگرد پر بھی ہوتا ہے' کچھ اشاروں کو سمجھ لیتے ہیں' کچھ پوری کتاب رٹ کر بھی سمجھ نہیں پاتے۔''

''واہ واہ۔'' عاص بن زید نے داد دی۔ ''جو جملہ لوگ ملتے ہی کہتے ہیں' وہ میں اب کہنا چاہوں گا۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری اور آپ کی عادتیں بہت ملتی ہیں۔ پتا نہیں' یہ ملاقات میری خوش نصیبی ہے یا آپ کی؟ آپ بتایئے؟''

''میرا خیال ہے کہ ''خوش نصیبی'' کا لفظ آپ پر ہی جچتا ہے لہٰذا یہ ملاقات آپ کی خوش نصیبی ہے۔'' ثنا بولی تو کمرا قہقہوں سے گونج گیا۔ امیر عمار کی ہنسی میں فخر تھا۔ وائل کے انداز میں ستائش اور عاص کے رخ پر مسرت تھی۔

چند لمحوں بعد وہ سب ناشتا کر کے کمرے سے نکل رہے تھے' تب عاص نے کہا۔ ''موسم شہ سواری کی دعوت دے رہا ہے' چلو وائل' چکر لگا آتے ہیں۔''

وائل بن عمار نے ایک دم ہی ثنا کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا آپ شہ سواری کا شوق رکھتی ہیں؟''

''میں شوق رکھتی ہوں اور کرتی بھی ہوں لیکن اس وقت میں عاطر سے کیا ہوا وعدہ پورا کروں گی اور جس کھیل میں عاطر شریک نہیں ہوگا' میں شرکت نہیں کروں گی اور میرا خیال ہے' ابھی وہ شہ سواری کے قابل نہیں ہے۔''

وہ معذرت کرتے ہوئے چلی گئی۔ وائل بن عمار اور عاص شہ سواری کے لیے روانہ ہو گئے لیکن نجانے کیوں آج وہ دیر تک سواری نہ کر سکے اور جلد ہی لوٹ آئے۔ ثنا' عاطر کے ساتھ اس کے کھلونوں سمیت پچھلے چمن میں جا چکی تھی جہاں بچوں کے شوق کا پورا انتظام تھا۔ جھولے بھی تھے' فوارہ بھی اور دوڑنے کے لیے میدان بھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر ننگے پاؤں دوڑنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ثنا کے خیال میں تازہ ہوا' کھلا آسمان اور ٹھنڈی گھاس صحت کے لیے بہت ضروری تھے اور یہاں یہ سب ہی میسر تھا پھر عاطر بھی ادھر آ کر بڑی خوشی محسوس کرتا تھا۔ وہ بہت دیر تک یہاں اس کے ساتھ کھیلتی رہی اور باتیں کرتی رہی۔

اس رات عاطر' باپ کے سینے سے لگا باتیں کر رہا تھا' اس نے کہا۔ ''بابا جان! آپ کو معلوم ہے' میری دوست نے میرے گھوڑے کے گلے میں گھنٹیاں باندھی ہیں' جب وہ گھاس پر دوڑ رہا تھا تو وہ خوب بج رہی تھیں۔''

''آپ کا گھوڑا دوڑنے لگا؟'' وائل بن عمار نے دریافت کیا۔

''ہاں......'' عاطر نے کہا۔ ''دادا جان نے اس کے چاروں پیروں میں پہیے لگوا دیئے تھے۔ میری دوست نے کہا ہے کہ اب دوسرے گھوڑے کے بھی پہیے لگوا لیں گے اور پھر ان دونوں کی دوڑ کرائیں گے۔''

وائل نے محسوس کیا کہ عاطر بہت خوش ہے' تب اس نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور پیار کرنے لگا پھر انہیں وقت کا پتا ہی نہ چلا اور شام ہو گئی۔

تنہامت چھوڑو۔"
"اوہو تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے تمہاری عزت خطرے......"
"بات عزت کی نہیں۔" وائل نے بات قطع کی۔ "بلکہ انتخاب کی ہے۔"
"انتخاب اور تم کرو گے؟" عاص نے طنز کیا۔ "آج کی تاریخ لکھ لو اور میری یہ بات بھی لکھ لو کہ وہ دونوں لڑکیاں بھی ناکام ہی جائیں گی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد تم پر سوگ کے دورے کیوں پڑنے لگتے ہیں؟"
وائل بن عمار خود بھی مستعجب سا تھا۔ ایک نہیں، وہ کئی لڑکیوں سے ملا تھا، انہیں پسند کیا تھا، جو سامنے موجود ہوتی، اسے سراہتا بھی، پسند بھی کرتا لیکن تنہائی ملتے ہی اسے لگتا کہ ہر لمحہ جو گزرا، بے وقوفی کے سوا کچھ نہ تھا اور ایسا کیوں تھا، وہ خود جان نہیں پاتا تھا۔ یہ کھوج امیر عمار کو بھی تھی۔ یہ تجسس اسے خود بھی تھا اور یہی سوال اب عاص نے بھی کیا تھا لیکن اس کا جواب نہ پہلے تھا نہ اب پھر وہ غور کرتا رہا اور وقت گزر گیا۔ فیبہ اور محسنہ آ گئیں۔ دونوں ہی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔
بڑی بڑی آنکھوں والی فیبہ دھیمے لہجے میں بات کرتی، بہت غور سے دوسروں کی بات سنتی اور سننے والے کا دل موہ لیتی۔ اس کے برخلاف محسنہ دل کھول کر ہنستی، قہقہے لگاتی۔ اس کی آنکھوں کی گردش ہر شے پر نظر رکھنے کی غمازی کر رہی تھی۔ اس کے بائیں رخسار پر ہونٹوں کے پاس ننھا سا کالا تل حسن کا محافظ ہی نہیں، توجہ کا مرکز بھی بن جاتا تھا۔
وائل بن عمار دونوں کو دیکھ کر پلکیں جھپک کر رہ گیا تو عاص نے کہا۔ "میرا خیال ہے، انسان یہ فیصلہ کبھی کر ہی نہیں سکتا کہ حسن کی معراج کیا ہے؟"
بہرحال گھر میں رونق ہو گئی تھی۔ سب جمع ہوتے تو وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔ ثنا ان کے پروگراموں میں کم ہی حصہ لیتی کیونکہ ان میں اکثر چار سالہ عاطر کی گنجائش نہ ہوتی اور ثنا اس کی نگہداشت کے لیے تھی۔ اس کے بغیر ہر تفریح غیر ضروری نظر آتی۔ ایسے میں وہ اس کے کھیلوں میں دلچسپی پیدا کر کے اسے اپنے ساتھ مصروف کر لیتی اور یہ چاروں من مانی کرنے کے لیے آزاد ہوتے۔ فیبہ کو شہ سواری اچھی لگتی تھی اور محسنہ کو چاندنی راتوں میں کشتی کی سیر کرنا اچھا لگتا تھا۔ فیبہ کو برستے پانی میں اونچی اونچی پینگیں بڑھا کر جھولنا پسند تھا اور محسنہ کو برسات کے نت نئے کھانے بڑی چھتری کے نیچے بیٹھ کر کھانا اور برسات کا نظارہ کرنا۔ عاص نے یہ سب سنا اور مسرت کے ساتھ بولا۔
"بھئی، جھولا جھولنے اور پکوان کھانے کے لیے تو بارش کا انتظار کرنا پڑے گا لیکن شہ سواری اور کشتی کی سیر جب چاہے، کی جا سکتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے وائل؟"
"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔" وائل نے رضامندی کا اظہار کیا۔ "چلو، کل ہی چلتے ہیں لیکن شہ سواری کے لیے صبح سویرے نکلا جائے۔"
"یہ بات ان خواتین سے کہیے۔" عاص نے کہا۔ "سنا ہے، تیاری میں ان ہی کو دیر لگتی ہے۔"
"سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کیا کرتے۔" فیبہ نے ہنس کر کہا۔
"تو پھر آزمائے لیتے ہیں۔" عاص نے ان دونوں کو سنایا۔ "کل صبح چھ بجے روانہ ہو جائیں گے۔"

•......•......•......•

اس شام جب سب جمع تھے' امیر عمار نے ایک خبر سنائی۔ ''ہمارے عزیز دوست جبیر بن حکم کی بیٹیاں فیبہ اور محسنہ آنے والی ہیں۔''

یہ خبر سنا کر امیر عمار رکے اور پھر دھیرے سے بولے۔ ''دونوں ہی لڑکیاں لائق و فائق ہیں' خوبصورت اور ذہین ہیں۔ ہمارے دوست جبیر چاہتے ہیں کہ ہم ان میں سے کسی بھی ایک کو حویلی میں لے آئیں۔ تمہارا کیا خیال ہے وائل؟''

''انہیں حویلی میں آنے سے کون منع کرتا ہے بابا جان؟'' وائل بن عمار نے ادب سے کہا۔ ''کیا حویلی میں لوگ آتے جاتے نہیں ہیں؟ اور پھر بھی نہ کبھی تو آپ کے وہ دوست بھی تشریف لاتے ہی ہوں گے۔''

''مگر وہ تشریف لانا نہیں' لے آنا چاہتی ہیں وائل......!''

عاص نے معنی خیز انداز سے وضاحت کی۔ اسی وقت کسی ملاقات کی خبر سن کر امیر عمار بیرونی نشست گاہ کی طرف چلے گئے' تب وائل نے غصے سے عاص کو دیکھا اور بولا۔ ''عاص! اگر باتیں ذرا کم کرنے لگو تو یقیناً اچھے انسان ہو۔''

''برے تو تم بھی نہیں ہو۔'' عاص نے اطمینان سے کہا۔

''اگر......''

''اگر میں تمہاری بے وقوفانہ باتیں مان لوں؟'' وائل بن عمار نے بات کاٹتے ہوئے اس کا جملہ مکمل کیا۔

''اچھا چھوڑو۔'' عاص نے بات ٹالی۔ ''یہ بتاؤ' وہ دونوں بہنیں کب آ رہی ہیں اور یہ جبیر بن حکم کون ہیں جن سے یہ ناچیز ابھی تک ناواقف ہے؟''

''یہ وہی مہربان ہستی ہیں جن کے گھر قیام کا حکم بابا جان نے خاص طور پر دیا تھا۔'' وائل بن عمار نے دھیرے سے کہا۔ ''اور ہم راستہ کاٹ کر نکل گئے تھے۔''

''دیکھو دوست!'' عاص نے جلدی سے وضاحت کی۔ ''ہر قسم کی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ راستہ میں نے نہیں کاٹا تھا بلکہ میں تو قیام کرنا چاہتا تھا مگر تم نے بتات ہی نہ مانی۔ چلو اچھا رہا۔ دونوں بہنیں آ رہی ہیں' حویلی میں کچھ رونق ہی ہو جائے گی۔''

''ابھی کیا بدرونقی ہے؟'' وائل نے پوچھا۔

''ارے بدذوق انسان......!'' عاص نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ''بھلا جہاں برسوں سے صرف چار مرد ہوں' وہاں کیسے رونق ہو سکتی ہے اور ان چار میں بھی ایک ادھیڑ عمر سے کچھ اوپر' ایک کم سنی سے بھی نیچے۔ باقی رہ گئے تم اور میں تو کیا نہا میں اور کیا نچوڑیں؟''

وائل بن عمار کھلکھلا کر ہنس دیا اور بولا۔ ''اب تو خوش ہو جاؤ' مہمان آنے والے ہیں۔''

''وہ تمہاری خوشی کے لیے آ رہے ہیں' میری طرف تو کوئی نظر ہی نہیں ڈالتا۔'' اس نے کہا۔

''عاص......!'' وائل بن عمار ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''ایسی خوشی کے تصور سے میرا دم گھٹتا ہے' میرا خیال ہے' ہم دونوں کچھ دن کہیں سفر پر چلتے ہیں۔''

''تمہیں تو اب چچا جان ہلنے بھی نہ دیں گے۔ اس بار کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو ہی جائے گا لیکن میں جانے کے لیے سنجیدہ ہوں۔'' عاص نے کہا۔

''نہیں عاص......!'' وائل نے بے چینی سے کہا۔ ''فی الحال اپنے سفر کا ارادہ ملتوی کر دو' مجھے

اس وقت محفل میں بھی موجود تھے۔ عاطر یہ گفتگو سنتے ہوئے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بابا جان! آپ اور چچا جان کہاں جانے والے ہیں؟''

وائل نے اس کی طرف دیکھا۔ ننھا بچہ باپ کی طرف متوجہ تھا لیکن فیبہ نے پیار سے اس کے رخسار تھپتھپائے اور بولی۔ ''بیٹے! آپ کے بابا جان شہ سواری کے لیے جانے والے ہیں۔''

''بابا جان! میں بھی چلوں گا۔''

وائل بن عمار نے کہا۔ ''بیٹے! آپ ابھی چھوٹے ہیں' کچھ وقت انتظار کیجیے' شہ سواری بچے نہیں کرتے۔''

لیکن عاطر اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ ضد کرنے لگا لیکن قبل اس کے کہ وہ ضد میں شدت اختیار کرتا' ثنا بولی۔ ''عاطر! آپ نے وہ تصویر بابا جان کو نہیں دکھائی جو کل شام بنا رہے تھے۔ آپ کو یاد ہے ناں' درخت پر چڑیا بیٹھی ہوئی ہے؟''

عاطر نے لمحہ بھر کو سوچا پھر اس کے رخ پر خوشی اور سوچ گہری ہونے لگی جیسے اپنی ضد کو بھول گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کہا۔ ''بابا جان! آپ میری تصویر دیکھیں گے؟''

''ہاں بیٹے! ہم ضرور دیکھیں گے' آپ ہمیں دکھائیے۔''

یوں ایک دم ہی موضوع بدلا۔ وائل بن عمار نے تصویر دیکھی' سب کو دکھائی اور عاطر مسرور ہوگیا پھر وہ سب اپنی اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ علی الصباح ان چاروں کو شہ سواری کے لیے جانا تھا۔

فیبہ اور محسنہ وقت سے پہلے ہی تیار ہوگئی تھیں۔ کچھ وقت اور موسم کا تقاضہ تھا' کچھ عاص کو شکست دینا تھی۔ عاص نے ہنس کر شکست مان لی اور کہا۔ ''بھئی' واقعی آپ نے تو سب خواتین کو جھٹلا دیا۔ کہاں ہیں وہ دیر سے تیار ہونے والی خواتین؟ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ......''

''آج پورے شہر میں کہیں مکھن نہیں ملے گا۔'' محسنہ نے کہا۔ ''سب ہمیں لگایا جا چکا ہے۔''

چاروں ہنستے بولتے بڑے پھاٹک کی طرف چل دیئے جہاں گھوڑے تیار تھے۔ اس تفریح کی ابتدا بڑے خوبصورت انداز سے ہوئی مگر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک دم ہی نجانے کس طرح وائل بن عمار کا گھوڑا بے قابو ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس وقت وہ تینوں پریشان تھے۔ عاص متردد سا دیکھ رہا تھا لیکن فیبہ اور محسنہ بری طرح گھبرا گئی تھیں۔ فیبہ نے دھیرے سے کہا۔ ''مجھے تو ڈر ہے کہ گھوڑا پہاڑی علاقے کی طرف نہ نکل گیا ہو پھر تو اسے قابو میں لانا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ گھوڑا بے قابو ہوا ہے؟'' محسنہ نے پوچھا۔

''کیا تم نے نہیں دیکھا تھا؟'' فیبہ نے سوال کیا۔

''میں نے گھوڑے کو اچھلتے دوڑتے اور نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا ہے۔'' محسنہ بولی۔ ''کیا یہی ہوتا ہے بے قابو ہونا؟''

''کہیں انہیں چوٹ نہ لگ جائے؟'' فیبہ بولی۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہاں رک کر ان کا انتظار کریں یا انہیں تلاش کریں؟'' محسنہ نے کہا۔ ''آپ کی کیا رائے ہے عاص صاحب؟''

''مجھے تو یہی تعجب ہے کہ یہ سب ہوا

کیسے؟'' عاص حیران تھا۔ ''نہ وائل کوئی اناڑی شہ سوار ہے اور نہ اس کا گھوڑا نیا ہے۔''

بات درست تھی' سبھی گھوڑے روکے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھا۔ فبیہ جو رائے دیتی' محسنہ اسے رد کر دیتی اور جو محسنہ دیتی' فبیہ اسے قبول نہ کرتی' یہاں رکنا اور وائل کی واپسی کا انتظار کرنا بھی حماقت تھی اور پورے علاقے میں پھرنا بھی ناممکن۔ سڑکیں بھی تھیں' سبزہ زار بھی اور پہاڑ اور دور وہ بل کھاتا ہوا دریا جو یہاں کے حسن کو دوبالا کرتا تھا۔ عاص نے ان سب راستوں کا تصور کیا' سر بلند کرتے آفتاب کی حدت کو محسوس کیا اور بولا۔

''بہتر یہ ہے کہ ہم واپس چلے چلیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گھوڑے کو قابو کر لینے کے بعد وائل لوٹ گئے ہوں اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں مروان' عمیر اور حارث کے ساتھ ان کی تلاش کے لیے نکلوں گا۔''

اس وقت فبیہ اور محسنہ دونوں ہی وائل کی تلاش کی آرزو مند تھیں لیکن عاص کے گھوڑا موڑنے کے بعد وہ رک نہ سکیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ واپس آ گئے۔ مروان بڑے پھاٹک پر ہی موجود تھا۔ عاص نے دریافت کیا۔ ''کیا وائل واپس آ گئے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' مروان نے کہا۔ ''غالباً ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' بس گھوڑا میرے حوالے کیا اور اندر چلے گئے۔''

عاص نے اطمینان کا سانس لیا۔ فبیہ اور محسنہ متعجب ہی دیکھتی رہ گئیں۔ اندر امیر عمار متردد سے ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے ان سب کو دیکھا' سلام کا جواب دیا اور پھر ٹہلنے لگے۔ فبیہ اور محسنہ چند لمحے رک کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور عاص خواہ مخواہ ہی امیر عمار کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ اصل صورتِ حال جاننے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ''یا عم! وائل کہاں ہے اور اسے کیا ہوا جو ایک دم پلٹ آیا؟''

''وہ اپنے کمرے میں ہے۔ ہمیشہ لڑکیوں کے ساتھ وقت گزار کر اس پر افسردگی کا جو دورہ پڑتا ہے' وہی دورہ پڑا تھا' واپس آیا' عاطر کو بلایا اور کمرے میں بند ہو گیا۔''

عاص نے کمالِ حیرت سے سنا۔ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے مگر اسے یاد آیا' ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی وائل تفریح ادھوری چھوڑ دیتا اور کبھی تفریح کے بعد تکیے میں منہ دے کر لیٹ جاتا تھا۔ اسی حیرانی میں عاص آہستہ سے دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنے اسی لباس اور جوتوں کے ساتھ وائل بستر پر دراز تھا اور پہلو میں لیٹے عاطر کو سینے سے لگائے' آنکھیں موندے نجانے کیا سوچ رہا تھا؟ چونک کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ ان آنکھوں میں خوشی تھی' سرور تھا' سکون تھا۔ دھیرے سے بولا۔ ''آ جاؤ عاص' تم لوگ کب واپس آئے؟''

''تمہارا گھوڑا بے قابو ہونے کے بعد ہم بھی نہ رک سکے۔'' عاص بولا۔

''گھوڑا بے قابو؟'' وائل نے حیرانی سے دیکھا۔ ''نہیں بھئی' گھوڑا نہیں بلکہ میں خود افسردگی سے بے قابو ہو گیا تھا۔''

''چلو' ہم بھی وہیں آتے ہیں۔'' وائل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یعنی کہ وہی پرانا دورہ پڑ گیا تھا؟'' عاص

نے دریافت کیا۔

وائل کچھ نہ بولا' بس سینے پر لیٹے ہوئے عاطر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چھت کو گھورتا رہا۔ عاص نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''کم از کم مجھے ہی بتا دیتے' ان دونوں بہنوں کے تردد نے مجھے بھی پریشان کردیا۔ میں بھی یہی سمجھا کہ گھوڑا اچانک بے قابو ہوگیا۔''

''معاف کرنا دوست......!'' وائل نے تاسف سے کہا۔ ''بس لمحے بھر میں مجھے نجانے کیسی وحشت ہوئی اور میں پلٹ آیا۔ چلو' ان دونوں سے بھی معذرت کرلیں گے اور آئندہ تفریح میں اس کا ازالہ کردیں گے۔''

''لیکن اس وقت کیا کہو گے؟'' عاص نے سنجیدگی اور ہمدردی سے پوچھا۔

ابھی وائل کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک نے دونوں کو متوجہ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی مترنم سی آواز سنائی دی۔ ''کیا میں اندر آسکتی ہوں؟''

''آیئے' آیئے۔'' وائل نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اس سے قبل عاص نے جھپٹ کر کمبل اس پر ڈال دیا۔ فیبہ اندر آگئی۔ اس کے انداز میں پریشانی تھی' بولی۔

''کیا چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی؟ لمحہ بھر میں گھوڑا قابو سے باہر ہوگیا تھا؟''

''فیبہ......!'' عاص نے جلدی سے کہا۔ ''وائل کہتے ہیں کہ ان کا گھوڑا بے قابو نہیں ہوا تھا بلکہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔''

''آپ نے بتایا کیوں نہیں؟'' فیبہ نے گلہ کیا۔

''میں نے سوچا تھا' آپ سب لوگ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ میں اگر چپ چاپ لوٹ جاؤں تو آپ تینوں اطمینان سے صبح کی سیر کا مزہ لے کر لوٹ آئیں گے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ آپ سب میری وجہ سے پلٹ آئے۔ مجھے افسوس ہے۔''

''ہم سب کا لوٹ آنا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' فیبہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''البتہ آپ کی ناسازئ طبع کا جان کر تشویش ہوئی۔ آپ آرام کیجیے اور طبیب کو بلایئے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو تکلف مت کیجیے۔''

''نہیں بھئی......!' وائل نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں دوستوں سے تکلف نہیں کرتا بلکہ تکلف کرنے والوں کو دوست بھی نہیں رکھتا۔ عاص اس بات کا بین ثبوت ہے۔''

''بے شک آپ کے دوست کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ دوست کے معاملے میں خوش نصیب ہیں۔'' فیبہ نے کہا۔ ''یہ ہر معاملے میں خوش نصیب ہیں فیبہ......!'' عاص نے سنجیدگی ختم کر کے پھر مذاق شروع کردیا۔ ''اس پر قدرت کی عنایات اس قدر ہیں کہ یہ بعض اوقات انتخاب ہی نہیں کرسکتا کہ کس کی طرف ہاتھ بڑھائے؟''

تبھی غلام نے دروازے پر رک کر دریافت کیا۔ ''جناب! امیر دریافت کررہے ہیں کہ آپ قہوہ ان کے ساتھ پئیں گے یا اپنے کمرے میں؟''

''بابا جان کہاں ہیں؟'' وائل نے پوچھا۔

''نشست گاہ میں۔'' غلام بولا۔

''چلو' ہم بھی وہیں آتے ہیں۔'' وائل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بچے کو غلام کے حوالے کردیجیے' وہ لے جائے گا۔'' فیبہ نے کہا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

یہ جملہ سن کر غلام رک گیا کہ شاید امیر زادہ حکم دے لیکن وائل بن عمار کے بازو کا حلقہ کچھ اور تنگ ہوگیا۔ عاطر کو سینے سے لگائے لگائے وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلو بیٹے! دادا جان کے پاس چلتے ہیں۔''

اس دن نشست گاہ میں سب جمع تھے اور محسنہ ان سب کے لیے قہوہ بنا رہی تھی۔ وائل کو دیکھ کر اس نے بھی پریشانی کا اظہار کیا' خیریت دریافت کی اور وائل نے اسے بھی وہی جواب دیا۔ اس کی تفریح خراب ہوجانے پر معذرت کی اور یوں اصل معاملے کو کوئی بھی نہ جان سکا۔ دوسرے اور تیسرے دن کے لیے کوئی پروگرام بھی نہ بن سکا۔ عاص کا خیال تھا کہ چند دن آرام کرنا چاہیے اور وائل بن عمار کے یہ چند دن بڑی خاطر داریوں میں گزرے۔ فیہ اور محسنہ گھر داری میں بھی حصہ لے رہی تھیں۔ وائل کو غذا میں کس کس شئے کی ضرورت زیادہ ہے' کون سے وقت کیا چاہیے اور کتنا آرام چاہیے' اس کا خیال انہیں خوب تھا۔ وائل نے کہا۔ ''دیکھیے' میں بیمار نہیں ہوں۔''

''لیکن پسند یا آرام کا خیال صرف بیماروں ہی (کا) تو نہیں رکھا جاتا؟'' عاص اسے خاموش کر دیتا۔ ''کوئی ناز اٹھاتا ہے تو اٹھوالو۔''

اس وقت وائل کچھ نہ کہتا لیکن خجل سا ہوجاتا۔ ذرا سی علالت کے اظہار کے بعد وہ کتنا خیال کر رہی تھیں۔ ان کا خلوص بھی تھا اور اخلاق بھی۔ ایسے میں عاص یہ سب غور سے دیکھتا۔ ایک دن تنہائی ملتے ہی بولا۔ ''وائل میرے دوست! مان جاؤ کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور جو لوگ نہیں مانتے' انہیں بھی منوانے کی کوشش کرو۔''

وائل نے حیرت سے دیکھا کہ اس وقت یہ تبلیغ کیوں شروع ہوگئی؟ اس حیرانی کو محسوس کر کے عاص نے کہا۔ ''اِن دونوں بہنوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا بلکہ میرا ایمان پختہ ہوگیا کہ اسلام ہی دینِ فطرت ہے۔''

''مگر اِن دونوں بہنوں سے تمہارے ایمان اور دین کا کیا تعلق ہے؟'' وائل نے دریافت کیا۔

''ارے بھئی' صحیح حکومت چلانے کے لیے حزبِ اختلاف کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں؟'' عاص نے سوال کیا۔

''بالکل ہوتی ہے۔'' وائل نے جواب دیا۔

''تو بس سمجھ لو کہ گھر میں اپنی ذات کو منوانے اور محبت کرانے کے لیے مقابلے کی ضرورت ہے۔'' عاص نے سمجھایا۔ ''اسی لیے اللہ نے چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ اب دونوں بہنیں تمہاری خاطرداری میں ایک دوسری پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔''

وائل بن عمار کو بے ساختہ ہنسی آ گئی' اس نے کہا۔ ''عاص! میرا خیال ہے کہ میری شادی وہ موضوع ہے جسے تم دنیا کے ہر موضوع پر حاوی کرسکتے ہو۔''

''میں اس موضوع پر عبور حاصل کرچکا ہوں۔'' عاص نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہاری خاطر اتنی لڑکیاں دیکھی ہیں اگر اپنی خاطر اتنی دیکھتا تو آج کئی بیویوں کا شوہر ہوتا۔ اچھا' ایک بات بتاؤ' اگر میرے عزت مآب چچا نے مجھ سے دریافت کرلیا کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے' دونوں میں سے کسے حویلی میں روک رہے ہو تو میں کیا جواب دوں؟''

وائل بن عمار نے غور سے اس کا سوال سنا اور شرارت سے بولا۔ ''اچھا' تم بتاؤ کہ تمہیں کون سی

پسند ہے؟''

''کس کے لیے؟'' عاص نے بے ساختہ پوچھا۔

اس وقت دونوں زندگی سے بھرپور ہنسی ہنس دیئے پھر عاص نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''دیکھو دوست! آنکھیں اور گفتگو کا انداز تو بڑی جان لیوا ہے اور رخسار کا تل چھوٹی کا چھٹی کر دیتا ہے۔''

''یار' تو' تو خطرناک حد تک عاشق مزاج ہے۔'' وائل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن سچ بتا' مذاق نہ کر۔''

''کیا بتاؤں؟''

''اگر تمہارے لیے عاص بن زید! تمہارے لیے بات کی جائے تو کس کو پسند کرو گے؟ تل والی کو؟''

عاص لمحہ بھر سوچتا رہا پھر سنجیدہ بنتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بڑی دشواری کی بات ہے کہ صرف ایک تل کے لیے پوری لڑکی سے شادی کرلوں؟''

دونوں دوست دیر تک ہنستے بولتے رہے پھر وائل نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں کافی آرام کر چکا۔ میرا خیال ہے' کسی تفریح کا پروگرام بنایا جائے اور مہمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ بھی کرنا ہے۔ تم بتاؤ' کیسے کیا جائے؟''

''سب سے پہلے تو ایک شرط ہے کہ تمہیں افسردگی کا دورہ نہیں پڑے گا۔ دوسری بات یہ کہ پروگرام سب کے ساتھ مل کر بنائیں گے تاکہ جو جسے پسند ہو اس کے حساب سے کام شروع کیا جائے۔''

''ٹھیک ہے' اس بار ایسا نہیں ہوگا۔'' وائل نے کہا۔ ''اب کتنی بار وعدہ لو گے؟ چلو' آج کے لیے سوچتے ہیں۔''

''لیکن آج کا دن تو گزر چکا۔'' فبیہ نے ان دونوں کی مرضی جاننے کے بعد کہا۔

''تو کیا ہوا' رات تو چاندنی ہے نا۔'' محسنہ نے یاد دلایا۔ ''کشتی کی سیر بھی ہو سکتی ہے اور ٹھنڈی ریت بھی کچھ کم فرحت بخش نہیں ہوتی۔''

تجویز اچھی تھی اور مشکل بھی نہیں۔ بارہا رات کے کھانے کے بعد وہ دور تک جاتے تھے۔ ریت کے اونچے اونچے ٹیلے' چاندنی رات میں برف کے تودوں کی طرح چمکتے تھے۔ آج بھی یہی کیفیت تھی۔ وائل بن عمار کا دل چاہا کہ ثنا اور عاطر بھی ساتھ دیں لیکن عاطر سو چکا تھا۔ امیر عمار' ثنا سے محوِ گفتگو تھے لہٰذا وہی چاروں چل دیئے پھر کبھی دوڑتے ہوئے ریت کے اونچے تودوں پر چڑھنے اور پھسلنے میں اور کبھی ٹھنڈی ریت پر لیٹ کر چاندنی کو محسوس کرنے میں وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو مروان کے سوا سب سو چکے تھے اور پرسکون نیند ان کا بھی انتظار کر رہی تھی۔

چند روز یہی سلسلہ رہا۔ وہ دن بھر خوش گپیوں اور کھانے میں گزارتے' جب چاندنی علاقے پر اپنا تسلط جماتی' وہ اپنے کھیلوں اور تفریح کی ابتدا کر دیتے۔ کبھی ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے' کبھی ٹھنڈی ریت پر لیٹ جاتے' کبھی محسنہ' عاص کا ساتھ اور فبیہ' وائل کا اور کبھی یہ ساتھ بدل جاتے۔ واپس آ کر وہ گہری نیند سوتے اور صبح اتنی دیر تک سوتے رہتے کہ غسل اور ناشتے سے فارغ ہونے والا عاطر اپنی بانہیں باپ کے گلے میں ڈال دیتا' تب وہ اس کے نرم نرم مہکتے وجود کو محسوس کر کے بازوؤں میں کس لیتا اور سب کچھ بھول جاتا۔ کبھی کبھی صبح کے ناشتے اور دوپہر

کے کھانے کے لیے وہ ایک ساتھ ہی تیار ہوتے یا کبھی غلام آ کر عرض کرتا۔ ''آقا......! بنتِ سعد کہہ رہی ہیں کہ بچے کے پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

یہ سنتے ہی عاطر عجلت سے ان سے ہٹتا اور پوچھتا۔ ''بابا جان......! میں جاؤں؟''

وائل بن عمار اسے ایک بار اور پیار کرتے ہوئے جانے کی اجازت دے دیتا اور وہ چند لمحوں کے لیے تکیے میں منہ دے کر پھر لیٹ جاتا۔ ایسے میں کوئی اسے احساس دلاتا۔ ''وائل بن عمار! ان دنوں میں تم نے خوب تفریح کی' مہمانوں کا ساتھ دیا مگر تم نے اداسی محسوس کی نہ تنہائی میں آتے ہی گھبراہٹ اور اضطراب نے تمہیں اپنے حصار میں لے لیا' کیوں؟''

مگر اسی ''کیوں؟'' کا جواب نہ ملا اور دن گزرتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے وقت گزاری کے لیے کئی انداز اختیار کیے۔ کبھی وہ چاروں ہی ہوتے اور کبھی امیر عمار' ثنا اور عاطر بھی ان کا ساتھ دیتے۔ ایسے میں وائل بن عمار عجیب سی خوشی محسوس کرتا۔ عاطر اس کے قریب ہوتا اور وہ عاطر کے۔ جب وہ عاطر کے ساتھ بڑی سی گیند لے کر بار بار اچھالتا تو عاطر خوش ہو کر ثنا سے پوچھتا۔ ''دوست......! آپ میرے اور بابا جان کے ساتھ کھیلیں گی؟''

یہ آواز سن کر ثنا ان دونوں کی طرف دیکھتی اور اپنا کھیل' اپنی مصروفیت اور اپنی محفل چھوڑ کر ان کے پاس آ جاتی' تب کبھی وہ تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے' کبھی بڑی سی گیند ان کے درمیان گردش کرتی اور تینوں ہی اسے پکڑنے کی کوشش کرتے۔ ایسے میں ایک دن عاطر نے کہا۔ ''بابا جان! ہم اس ٹیلے تک بھاگتے ہیں' کیا آپ مجھے پکڑ سکتے ہیں؟''

''پتا نہیں بیٹے! ہم پکڑ سکتے ہیں یا نہیں؟''

''دوست......! کیا بابا جان مجھے پکڑ سکتے ہیں؟'' عاطر نے ثنا سے پوچھا۔

''آپ دونوں دوڑ لگایئے اور آزمایئے کہ کون تیز دوڑتا ہے؟'' ثنا نے کہا۔

سب دلچسپی سے باپ بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔ عاص نے کہا۔ ''عاطر! آپ اپنے بابا جان کے ساتھ شرط لگایئے اور پھر انہیں ہرایئے۔''

پھر شرط لگی۔ وائل بن عمار اور عاطر نے ٹیلے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ وائل کی رفتار لمحہ بہ لمحہ سست ہونے لگی اور عاطر جیت گیا۔ سب لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ عاطر کے رخ پر جیتنے کی اور وائل کے رخ پر بیٹے سے ہار جانے کی خوشی تھی۔ امیر عمار اور عاص ہاتھ اٹھا اٹھا کر تالیاں بجا رہے تھے۔ عاطر واپس آتے ہی دادا جان سے لپٹ گیا پھر ثنا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ عاص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''عاطر......! آپ کے بابا جان شرط ہار گئے' اب جو دل چاہے' ان سے مانگ لیجیے۔''

عاطر کے چہرے پر خوشی ہی خوشی تھی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کی خوشی سے وائل بن عمار کو لگتا تھا کہ دنیا بھر کی مسرتیں حاصل ہو گئی ہیں' تب عاطر نے زور سے کہا۔

''بابا جان! آپ ہار گئے ناں' اب ایک گیت سنایئے۔''

تب محفل قہقہوں سے گونج گئی۔ سب اصرار کر رہے تھے۔ ''گانا سنایئے' گانا سنایئے۔''

وائل مجبور ہو گیا اور عاطر کو بازوؤں میں لیے لیے چند شعر گائے۔

اس طرح دن ہنستے بولتے گزر رہے تھے کہ

ایک دن جبیر بن حکم کا پیغام آ گیا۔ اسے کسی سفر پر روانہ ہونا تھا اور فبیہ اور محسنہ کو ان کا ساتھ دینا تھا۔ انہیں رخصت کرتے وقت امیر عمار نے بہت سے تحائف دیئے اور اتنے ہی اپنے دوست کو بھیجے لیکن کسی کا مقصد بھی پورا نہ ہوا تھا اور امیر عمار خفیف اور شرمندہ ہو رہے تھے۔ اس سے قبل بھی کئی بار یہی ہو چکا تھا۔ پہلے پہلے وہ صرف شرمندہ ہوتے لیکن اب خفت کے ساتھ وہ پریشان بھی تھے۔ ان کے دوست کی دونوں بیٹیاں معمولی لڑکیاں نہیں تھیں، حسن و اخلاق میں یکتا و بے نظیر لیکن وائل بن عمار نے چپ سادھ لی تھی، نہ انکار نہ اقرار۔ عاص متردد تھا۔ اس بار اسے وائل پر غصہ نہیں آیا تھا بلکہ ہمدردی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وائل نے دونوں ہی لڑکیوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ جب جب ذکر آتا، ان کی تعریف بھی کرتا لیکن شادی کے نام پر چپ ہو جاتا تھا۔ رخصتی کے دن اس نے کہا۔

''وائل! چچا جان دریافت کر رہے ہیں کہ وہ اپنے دوست جبیر بن حکم کو کیا جواب دیں؟''

''عاص......!'' وائل بن عمار نے اس کی طرف رخ موڑ کر مصروف ہوتے ہوئے کہا۔ ''بابا جان سے کہنا، ہمیں معاف کر دیں۔ معزز جبیر بن حکم کی دونوں بیٹیاں بہت اچھی ہیں مگر ہم ان کے قابل نہیں۔''

اس جواب پر بہت دیر تک نہ عاص کو مذاق سوجھا نہ امیر عمار کچھ کہہ سکے پھر آہستہ آہستہ خود کو سنبھالنے لگے، تب عاص نے کہا۔ ''یا عم! میں چند دن کے لیے جانا چاہتا ہوں۔''

امیر عمار نے قدرے حیرانی سے دیکھا مگر دریافت نہ کیا کہ کہاں جانا چاہتے ہو؟ انہیں علم تھا کہ یہ سوال عاص کو تکلیف دے گا۔ دور پار کے چند لوگوں کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''کیا بہت مجبوری ہے؟''

''یہی سمجھیے۔'' عاص نے مجبوری کا اظہار کیا۔ ''ورنہ میں کبھی نہ جاتا۔''

''دیکھو عاص......!'' امیر عمار نے دیانت داری سے کہا۔ ''تم ہمیں جتنا وقت دیتے ہو، عام لوگوں سے اس کی توقع ناممکن ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ میری مصروفیت اور میری سب سے اہم ذمے داری تو ثنا بنتِ سعد نے سنبھال لی ہے اور میں عاطر کی طرف سے مطمئن بھی ہوں، اب تم وائل سے بات کر لو اور وہ پسند کرے تو دونوں ہی سفر کا پروگرام بنا لو۔''

''لیکن بابا جان!'' وائل بن عمار نے اطمینان سے کہا۔ ''میں کچھ عرصے تک کسی سفر پر نہیں جا سکوں گا اور عاص کے رکنے پر اصرار نہیں کروں گا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جلد لوٹ آنا۔ ہم نئی زمین پر کاشت کرنے والے ہیں۔ اچھا ہے، عاص بھی موجود ہوں۔''

عاص کی مجبوری تھی، وہ رک نہ سکا اور چلا گیا لیکن ہمیشہ سے بالکل ہی الٹ معاملہ تھا۔ وائل کو اس تنہائی سے نہ وحشت ہوئی نہ گھبراہٹ۔ پہلے جب بھی مہمان واپس جاتے، وہ گھنٹوں کمرے میں اندھیرا کیے لیٹا کچھ سوچتا رہتا تھا۔ کبھی امیر عمار کے پاس جا کر بیٹھتا، کبھی عاطر کے ساتھ وقت گزارتا لیکن وحشت کم نہ ہوتی۔ اس وقت اسے خبر ہی نہ تھی کہ حویلی میں کتنے ملازم ہیں؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ اندرونی چمن کی گھاس کاٹی گئی یا نہیں؟ اسے پروا نہ تھی کہ باہر نئے درخت کتنے اور کون سے ہیں؟ لیکن اب وہ ہر شئے پر نظر رکھتا۔ اس کا دل چاہتا، عاطر کھیل میں مصروف ہو تو وہ اسے دیکھے۔ جب وہ پڑھے، تب وہ غور سے

سنے۔ عاطر کے کھیل کود کے وقت وہ درختوں کو پانی دیتا اور کبھی عاطر اصرار کرتا تو کھیل میں شریک ہو جاتا۔ یوں وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ اس کے اندر ایک خوبصورت سا انقلاب اسے مسرور کرتا۔ ثنا نے ان سب کے ساتھ تفریحات میں بہت کم حصہ لیا تھا اور وائل کی طرف بھی بہت کم توجہ دی تھی لیکن عاطر کی تمام تر ذمے داری سنبھال چکی تھی۔ وہ اس کی ہر لمحے کی ساتھی، ہر وقت کی دوست اور اتالیق تھی۔ اس نے اس کی ابتدائی تعلیم کا آغاز یوں کیا تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ اس نے پڑھائی کے طریقے کو نیا انداز دیا تھا جس سے عاطر سمجھتا تھا کہ کھیل رہے ہیں۔ علاقے کے بڑے نجار کو بلا کر اس نے کہا تھا۔

''معزز نفیر! آپ لکڑی کا کام کرتے ہیں، علاقے بھر میں ضرورت کی اشیاء آپ ہی بناتے ہیں، کیا ہمارا کام کر سکیں گے؟''

بوڑھے بڑھئی نے تعجب سے دیکھا۔ ثنا بنتِ سعید کو بہت کم وقت میں سب ہی جان گئے تھے اور مداح بھی تھے۔ اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا آپ کیا کام کرانا چاہتی ہیں لیکن میں لکڑی کے کام میں کبھی ناکام نہیں ہوا۔''

''یقیناً آپ ابھی ناکام نہیں ہوں گے۔'' ثنا نے تعریف کی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ آپ تمام حروفِ تہجی خوبصورت کھلونوں کی شکل میں بنا کر ان پر مختلف رنگ کر دیں تاکہ عاطر کھیل ہی کھیل میں حروف کی شناخت کرنے لگے۔ اسی طرح ایک سے لے کر سو تک تمام ہندسے ہوں اور یہ سب اتنے خوبصورت ہوں کہ بچے کی توجہ کا مرکز بنے رہیں۔''

بوڑھے نجار نے یہ بات غور سے سنی اور بولا۔ ''کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گی کہ میں کہہ سکوں، آپ بہت خوبصورت سوچ کی مالک ہیں؟''

''شکریہ۔'' ثنا ہنس پڑی۔ ''آپ/اب مجھے دیکھنا ہے کہ اس سوچ کو آپ کیسی شکل دیتے ہیں؟''

''آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔'' نفیر واپس چلا گیا اور ان دونوں کو پتا ہی نہ چلا کہ سیڑھیاں اتر کے آتے ہوئے وائل نے یہ بات سنی اور اسے انوکھا تصور محسوس کیا۔ اس وقت تو ثنا اس سے بات کر کے اندر چلی گئی اور وہ خود باہر چلا گیا لیکن چند روز بعد جب بوڑھے نفیر نے وہ سب ہندسے اور حروف بنا کر لا کر دیے تو امیر عمار اور وائل دونوں نے ہی انہیں پسندیدہ انداز سے دیکھا۔ امیر عمار نے کہا۔ ''ثنا! تم نے یہ سب کیوں بنوایا ہے؟''

''محترم امیر!'' ثنا نے کہا۔ ''آپ نے غور نہیں کیا، عاطر قدرے مختلف فطرت کا بچہ ہے۔ اس کا کھیل اور علم جدا جدا نہیں ہونا چاہیے اور پھر میں چاہتی ہوں کہ وہ جو لفظ سنے، پڑھے، یاد کرے، اسے پہلے نظروں سے دیکھے۔ اس سے نہ صرف اس کے لیے یہ کام آسان ہو جائے گا بلکہ وہ دل و دماغ اور اپنی سوچ سے لفظوں کو قبول کر لے گا۔''

''تم واقعی حسین سوچ کی مالک ہو۔'' امیر عمار نے داد دی۔ ''ہمارے علاقے میں اس سے قبل علم کا یہ تصور کسی نے بھی پیش نہیں کیا۔''

''خیر یہ آپ کی اعلیٰ خیالی ہے۔'' ثنا نے کہا۔

''یہ اعلیٰ خیالی نہیں، حقیقت ہے۔'' وائل نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''آپ اس بات کے لیے بہت زیادہ تعریف کی مستحق ہیں کہ آپ نے بہت

کم وقت میں عاطر کی فطرت کو پڑھا' سمجھا اور محسوس کیا اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔"

"آپ نے اس بات کو سراہا اور میرا حوصلہ بڑھا دیا' اس کے لیے میں آپ کی مشکور ہوں۔"

اس دن وہ تینوں دیر تک نشست گاہ میں باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں موضوع بدلے اور وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ جب غلام نے رات کے کھانے کی اطلاع دی' تب وہ چونکے پھر عاطر کے کھیل کا نیا انداز شروع ہوا۔ کھیلنا' کھانا پینا' بھاگنا دوڑنا اور پڑھنا لکھنا سب ان چوبی حروف میں سما گئے تھے۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کون سا لمحہ کب اسے کچھ سکھا گیا اور کس لمحے وہ کون سی ضد بھول گیا؟ بس ثنا کی توجہ اسے اچھی لگتی۔ وہ اس کی شخصیت کو' اس کی باتوں' اس کے کاموں کو توجہ دیتی۔ کس وقت کون سا لباس ہونا چاہیے' وہ انتخاب کرتی اور سمجھاتی۔ کبھی اس سے مشورہ لیتی اور ہر کام کے وقت ایک شرط پیش کر دیتی۔

"عاطر! اگر آپ یہ کریں گے تو میں یہ کروں گی اور اگر آپ میری بات نہیں مانیں گے' تب میں بھی آپ کی بات نہیں مانوں گی۔"

عاطر کو ادلے بدلے کا یہ انداز اچھا لگتا اور سمجھتا کہ وہ بڑوں کے برابر ہو گیا ہے۔ ثنا کی توجہ' سادگی اور بے تکلفی جہاں عاطر کے لیے خوشی اور اعتماد کی کا سبب تھی' وہاں وائل بن عمار کو کبھی کبھی چونکا بھی دیتی۔ پہلے دن اس لڑکی سے مل کر اس نے سوچا تھا کہ وہ انسانی نفسیات پر گرفت رکھنے والی ایک ذہین لڑکی ہے پھر سوچا' دنیا کی اعلیٰ ترین لڑکی ہے جس نے عاطر جیسے بچے کو متوجہ کر لیا پھر سوچ بدلتی گئی۔ ایک محبت کرنے والی لڑکی ہے جس نے اپنی محبت اور توجہ سے عاطر میں تبدیلی پیدا کر دی پھر اس کی سوچ نیا انداز اختیار کر گئی اور اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ ایک دن وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر قدِ آدم آئینے کی سامنے اپنا سراپا دیکھ رہا تھا کہ ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ کسی نے جیسے چپکے سے کہا۔

"وائل بن عمار! تم وجیہہ و شکیل ہو۔ بات کرنے کا سلیقہ جانتے ہو۔ تمہارے پاس علم ہے' دولت ہے لیکن......؟"

اس لیکن پر چونک کر وائل بن عمار نے اندر کی اس آواز پر غور کیا تو توجہ دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کسی نے احساس دلایا۔

"وائل بن عمار! تمہاری ستائیس سالہ زندگی کا پہلا موقع ہے جب کسی لڑکی نے تمہاری کسی صفت کی طرف توجہ نہیں دی۔ تمہارا سراپا' دولت و حشمت' ذہانت و علم اس کے لیے معمولی سی بات ہے' کیوں؟"

تبھی قہقہے کی آواز اسے سوچوں کی دنیا سے کھینچ لائی۔ لمحے بھر کو اسے لگا' وہ اس پر ہنس رہی ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی بڑی سی کھڑکی سے پردہ سرکا کر چند گز نیچے چمن میں دیکھا تو ثنا' عاطر کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

"دیکھا' اس بات پر آپ جیت گئے۔"

وائل بن عمار نے خود کو چھپائے چھپائے نیچے دیکھا' وہ عاطر کو آگے بڑھنے کا موقع دینے کے لیے خود پیچھے ہو گئی تھی تاکہ اس کے دل میں جیت کا احساس پیدا ہو جائے پھر وہ اس کے آگے نکلنے پر تالی بجاتے ہوئے بولی۔ "عاطر! آپ کو معلوم ہے' اب آپ ہر کھیل میں کیوں جیت جاتے ہیں؟"

"کیوں؟" عاطر نے دریافت کیا۔

"کیونکہ آپ خوب کھاتے پیتے ہیں اور ہر

شئے کھاتے ہیں۔ جو بچہ خوش ہو کر اپنی پوری خوراک کھاتا ہے' وہ بہت جلد بڑا ہو جاتا ہے اور سب سے جیت جاتا ہے۔ چلو اب کھیل ختم' اندر چلتے ہیں۔''

وائل بن عمار نے بھی پردہ برابر کیا اور سیڑھیاں اتر کر عاطر کے پاس پہنچ گیا جہاں امیر عمار اور ثنا موجود تھے۔

چند روز بعد ایک نئی مہمان نے ان سب کو مسرور کر دیا۔ خولہ بنتِ ریاط' امیر عمار کے رشتے کی بھتیجی تھی۔ خولہ کی آمد بہار سے کم نہ تھی۔ اسے قدرت نے خوبصورتی بھی بخشی تھی اور وہ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو سنوارنے کی عادی بھی تھی۔ اسے موسم کے لحاظ سے لباس اور محفل کے اعتبار سے بات کرنے میں کمال حاصل تھا اور جذبوں کے اظہار میں اس کی برابری کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ امیر عمار اور وائل کو اس کے اچانک آنے سے بے حد خوشی ہوئی۔ امیر عمار نے کہا۔ ''تم دونوں نے تو کئی برس بعد ایک دوسرے کو دیکھا ہے' کیا تم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا؟''

''بابا جان!'' وائل نے کہا۔ ''اگر میں خولہ کو کہیں اور دیکھتا تو شاید پہچان نہ سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے' تم مجھے بھول گئے ہو؟'' خولہ نے بے تکلفی سے کہا۔ ''میں تمہیں ہزاروں میں دیکھ کر بھی کہہ سکتی ہوں کہ یہ وائل بن عمار ہیں' میرے بچپن کے ساتھی' میرے عم زاد۔''

''پھر تو تمہاری یادداشت کی داد دینا چاہیے۔'' وائل نے کہا۔

''مجھے تمہارے ساتھ ہونے والے المیے سے بہت دکھ ہوا۔'' خولہ نے ہمدردی کی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ بھی کم ہی رہ سکے؟''

''ہوں......'' وائل نے گہرا سانس لیا۔ ''صرف ایک سال۔''

''اور تمہارا بیٹا؟'' خولہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اب وہی میرا سب کچھ ہے۔'' وائل بن عمار نے کہا۔

''وہ یہاں ہے؟'' خولہ نے ایک دم ہی پوچھا۔ ''معاف کرنا' میرا مطلب ہے' جہاں کوئی عورت نہ ہو' وہاں بچے کی پرورش مسئلہ بن جاتی ہے لہٰذا میں سمجھی تھی کہ تم نے بچے کو بیوی کے خاندان میں رکھا ہوگا؟''

''تمہاری بات درست ہے۔'' امیر عمار نے کہا۔ ''جہاں عورت نہ ہو' بچے کی پرورش مشکل ہوتی ہے۔ ہم کئی برس اس تجربے سے گزرے ہیں لیکن اب ہمیں ایک اچھی مربیہ مل گئی ہے جو بچے کی نفسیات بھی جانتی ہے اور بچوں سے محبت بھی کرتی ہے۔''

یہ لوگ دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ خولہ تھکی ہوئی تھی اور اسے بھوک بھی نہ تھی لہٰذا وہ آرام کے لیے چلی گئی لیکن اگلی صبح وہ عاطر کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے امیر عمار سے کہا۔ ''یہ تو بالکل وائل جیسا ہے۔''

''ہاں۔'' امیر عمار نے ثنا سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ وہ شخصیت ہے جس کا میں نے رات ذکر کیا تھا۔ ثنا بنتِ سعد اور خولہ بنتِ ریاط!''

خولہ نے اسے دیکھا اور بے تکلفی سے بولی۔ ''رات چچا جان کی بات سن کر میں نے سوچا تھا' شاید کچھ زیادہ ہی تعریف کر رہے ہیں مگر اس وقت آپ کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ تعریف ناکافی تھی۔''

ثنا بڑی خوش دلی سے ہنسی اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ معزز امیر کی سراہنے والی صفت سے آپ بھی متفق ہیں؟''

اس وقت کوئی ملاقاتی آ گیا تو امیر عمار بیرونی نشست گاہ میں چلے گئے۔ غلام نے عرض کیا۔ ''جناب' امیرزادہ وائل صبح سویرے ہی کچھ دوستوں کے ساتھ شکار کے لیے گئے ہیں۔''

پھر یہ ناشتا کرتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔ کچھ ذاتی باتیں' کچھ کائناتی۔ یہ دن بہت اچھا گزرا۔ خولہ نے کہا۔ ''یہاں آتے ہوئے مجھے خیال تھا کہ حویلی میں صرف مرد ہی مرد ہیں' نجانے میرا وقت کیسے گزرے؟ لیکن تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔''

اس شام کھانے کی میز پر وائل بن عامر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجیے گا' شکار کا منصوبہ اچانک ہی بنا' میں ٹال نہ سکا اور یوں دن گزر گیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' خولہ نے کہا۔ ''لیکن آپ نے کیا شکار کیا؟''

''بس کچھ مرغابیاں' کچھ تیتر۔ کسی دن تمہیں بھی لے چلیں گے۔ یہ ایک الگ ہی سا انوکھا تجربہ ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ثنا کی طرف دیکھا اور بولا۔

''بنتِ سعد! کیا آپ شکاریات سے دلچسپی رکھتی ہیں؟''

ثنا کو اس سوال پر ایک دم ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''امیر! میں کچھ عجیب سی فطرت کی مالک ہوں۔ جب سارے زمانے کی نظریں عقاب کی جھپٹ اور تیزی کو داد دے رہی ہوتی ہیں' اس وقت میں صرف شکار کی بے بسی محسوس کرتی ہوں اور اس کے تڑپنے کے سوا کچھ دیکھ نہیں سکتی۔''

اس جواب پر امیر عمار اور وائل دونوں ہی مسکرا دیے۔ خولہ نے کہا۔ ''ثنا کی بات سننے والی نہیں بلکہ محسوس کرنے کے قابل ہے۔''

کھانا ختم ہوا تو امیر عمار جلد ہی آرام کے لیے چلے گئے اور وائل نے ان دونوں ہی سے کہا۔ ''خواتین......! کیا آپ چاندنی رات سے لطف اندوز ہونا پسند کریں گی؟''

''ہاں' میں تو ضرور چلنا چاہوں گی۔'' خولہ نے کہا۔

''اور میں......'' ثنا نے جواب دیا۔ ''عاطر کے بغیر نہیں جاؤں گی' اگر وہ رضامند ہے تو چلتے ہیں۔''

وائل نے عاطر کو دیکھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بیٹے! آپ سیر کے لیے باہر جائیں گے؟''

لیکن اس وقت عاطر نہ خود جانے کو راضی تھا نہ وائل سے جدا ہونے کے لیے تیار۔ اس نے کہا۔ ''بابا جان! مجھے نیند آ رہی ہے' آپ بھی مت جایئے۔''

اس انداز پر خولہ کو ہنسی آ گئی۔ اس نے رخسار تھپتھپایا اور پیار سے بولی۔ ''نیند آپ کو آ رہی ہے' بابا جان کیوں رک جائیں؟ جایئے' آپ سو جایئے۔ شب بخیر۔''

پھر وہ وائل کے ساتھ چل دی اور عاطر نیند سے بوجھل آنکھیں لیے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے پژمردگی سے کہا۔ ''بابا جان! شب بخیر۔''

اس رات وائل بہت دیر تک وقت کا لطف لیتے ہوئے خولہ سے باتیں کرتا رہا' ان برسوں کی باتیں جب وہ ملے نہ تھے۔ خولہ مسلسل باتیں کر رہی تھی لیکن وائل اپنے اندر عجیب سا اضطراب محسوس کر رہا تھا' وہی افسردگی' وہی سوگ

والی کیفیت جس پر قابو پا چکا تھا' پھر عود کر آئی تھی۔ کھلی ہوا اور ٹھنڈی چاندنی کے باوجود دم گھٹ رہا تھا۔ تنہائی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا جیسے خود اپنے آپ سے بچھڑ گیا ہو۔

پھر دن گزرتے رہے' ہر دن کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا۔ امیر عمار کو قدرے اطمینان ہوا کہ خولہ کی آمد نے وائل کو مصروف کر دیا ہے لیکن وائل کو لگتا' وہ اپنا بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ خولہ کی فطرت اور مزاج سب سے جداگانہ تھا۔ وہ کہتی۔ ''وائل! زندگی بہت کم ہے' اسے اپنے لیے گزارو' صرف اپنے لیے۔''

اس طرح کشتی کی سیر کے لیے وہ چھوٹی کشتی کا انتخاب کرتی جس میں ان دو کے سوا کسی کی گنجائش نہ ہوتی۔ چاندنی میں ٹہلنے اور لطف لینے کے لیے وہ سب کو غیر ضروری سمجھتی۔ وائل کو پروگرام بنانے کی ضرورت نہ پڑتی اور خولہ چلنے کا اعلان کر دیتی۔ ایسے میں وہ سوچتا' ساتھیوں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ کچھ ساتھ دیتے ہیں' کچھ تنہا کر دیتے ہیں۔ اکیلا پن جو دیکھا نہیں' محسوس کیا جاتا ہے' اس اکیلے پن سے بچنے کے لیے وہ خواہ مخواہ ہی عاص کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ عزیز دوست جس نے اس بار اسے اتنا وقت دیا تھا کہ وہ خود اس کا عادی ہو گیا تھا' اب دل چاہتا تھا کہ وہ واپس آ جائے تاکہ زندگی کا انداز بدلے۔ ان دنوں تو بس والہانہ جذبات رکھنے والی خولہ تھی یا عاطر میں مگن رہنے والی ثنا۔ سوچتے سوچتے اسے لگتا' اس مقام پر آ کر سوچ رک گئی ہے۔ ثنا بنتِ سعد' بظاہر ایک عام لڑکی اسے گھیر لیتی اور اس امیر زادے کو اندازہ ہی نہ ہوتا۔ لگتا جیسے کوئی اندر چٹکیاں لے رہا ہے۔

''وائل بن عمار! تم جو مخالف جنس کی کمزوری سمجھے جاتے تھے' کبھی نظرانداز نہیں کیے گئے تھے' تمہاری مسحور کن شخصیت کی پرستش کی جاتی تھی' آج اس لڑکی کی نظر میں غیر اہم کیوں ہو؟''

اندر کے اس سوال کا جواب وہ پوری ہوش مندی کے ساتھ دینا چاہتا تھا۔ خود کو مطمئن کرنے کے لیے سمجھاتا' کون کہتا ہے کہ ثنا بنتِ سعد کے نزدیک تم غیر اہم ہو؟ وہ تمہاری عزت کرتی ہے' تمہاری گفتگو میں حصہ لیتی ہے' جب جب تم کسی تفریح کے لیے دعوت دیتے ہو' ساتھ جاتی ہے پھر یہ گلہ کیوں ہے؟'

اس جواب کے باوجود وہ مطمئن نہ ہوتا بلکہ اس کی بے چینی بڑھ جاتی اور اندر سے مزید سوال اٹھنے شروع ہو جاتے۔ 'یہ کیسی لڑکی ہے جس کے انداز دید میں نہ والہانہ پن ہے نہ پسند نہ پیغام نہ اس کے تبسم میں کوئی معنی ہیں نہ رویے میں کوئی ترجیحی انداز نہ قہقہے میں توجہ حاصل کرنے کی چاہت نہ گفتگو میں دل کی موہ لینے کی ادا؟'

اس سوال کے ساتھ مہینوں پر محیط سب واقعات یاد آتے۔ جب جب اس نے ثنا کو کسی تفریحی پروگرام میں دعوت دی تھی' ایسے میں کسی شوق یا چاہت کے بغیر کبھی اس نے اس پیشکش کو قبول کر لیا تھا' کبھی معذرت کر لی تھی۔ اسے یہ بھی خوب یاد تھا کہ کسی بھی لڑکی کو ساتھ دیکھ کر کبھی اس کے رخ پر کوئی تاثر نہیں آیا تھا۔ انہی باتوں کو محسوس کر کے ایک بار اس نے عاص سے بڑی رازداری سے کہا تھا۔ ''عاص...... ! کیا بنت سعد کھیل کود یا تفریح کا شوق نہیں رکھتی؟ بہت کم ہمارا ساتھ دیتی ہے؟''

عاص نے چند لمحے غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے' بنتِ سعد ان تمام باتوں کا شوق رکھتی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا' بہت کم وقت

میں عاطر نے کیا کچھ سیکھ لیا ہے۔ وقت پر کھانا پینا، کھیلنا، بھاگنا دوڑنا اور پڑھنا لکھنا، وقت پر بیدار ہونا اور وقت پر سو جانا۔ یہ سب کسی با اصول و با اخلاق انسان کی صحبت کا اثر ہی ہو سکتا ہے۔"

وائل بن عمار اس بات کو رد نہیں کر سکا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسے لگتا تھا کہ اس کی شخصیت مات کھا گئی ہے۔ حسن و چاہت کے تمام فاخرانہ تصورات جو دوسری لڑکیوں کے اہمیت دینے سے پیدا ہوئے تھے، چور چور ہو گئے۔ اسے بے پناہ چاہت ملی تھی اور اب بھی نفیسہ نے ٹوٹ کر چاہا تھا، محسنہ نے اپنے جذبوں کا بھرپور اظہار بھی کیا تھا اور خولہ بنت رباط اپنا حق بھی جتاتی تھی لیکن ایک عجیب ہی کمی کا احساس اسے بے کل کر دیتا تھا جسے وہ خود بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن حسین مناظر اور چاندنی راتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ صرف اس ہستی کے قرب کی آرزو کرتا جسے یہ آرزو نہ تھی۔ خوبصورت مقامات پر اس نے بہت دن گزارے تھے اور جو ساتھی بھی ہوتی، اس کا ساتھ دینے پر فخر کرتی تھی۔ اسے مائل رکھنا چاہتی تھی مگر ان سب کی فطرت سے ثنا کا موازنہ کرتے کرتے وائل کھو جاتا تھا اور بھول جاتا کہ کون اس کے ساتھ ہے؟ ایسی ہی سوچوں میں گم ہو جانے پر خولہ نے پوچھا۔ "کس سوچ میں ہو وائل؟"

"ہوں......" وائل بن عمار نے چونک کر دیکھا۔ "عاص میرا دوست آنے والا ہے، تم ملو گی تو بہت خوش ہو گی۔"

پھر ایک دن اچانک ہی عاص واپس آ گیا۔ وہی ہنستا مسکراتا اور ہنساتا ہوا۔ خولہ نے اسے بہت پسند کیا۔ ثنا بھی خوش ہوئی اور وائل کے دماغ سے بھی ایک بوجھ اتر گیا۔ اس نے کہا۔ "عاص! تم نے میرا بہت وقت ضائع کیا۔"

"ضائع کیا؟" عاص نے حیرانی سے دیکھا۔ "تمہیں موقع دے کر گیا تھا کہ شاید آگے بڑھ سکو مگر جہاں چھوڑ گیا تھا، وہیں ہو۔ لگتا ہے، گردشِ وقت کو بھی مات دے دی ہے تم نے۔"

"مجھے تمہاری عادت ہو گئی ہے۔" وائل نے بات بدلنا چاہی۔

ایک دم ہی خولہ نے پوچھا۔ "عاص......! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟"

عاص نے سوال سنا تو ایک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔ اس وقت اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "آپ محبت کی بات کرتی ہیں، میں نے تو اس کی پرستش کی تھی۔"

اس انداز اور بات پر سب چونک گئے۔ عاص کی آواز میں درد ہی درد تھا۔ وائل متعجب تھا۔ اس کے اتنے زندہ دل دوست کے دل میں اتنا غم کہاں سے آ گیا تھا؟ ثنا اس کے ظرف کی داد دے رہی تھی کہ کس طرح وہ اپنے غم کو چھپا کر سب کو ہنساتا تھا۔ خولہ نے کہا۔ "وہ کون تھی اور اسے کیا ہوا؟"

"وہ......" عاص نے دھیرے سے کہا۔ "وہ میرے محسن کی بیٹی تھی جنہوں نے والدین کے مرنے کے بعد مجھے پرورش کیا اور تعلیم دی۔ وہ اور میں ساتھ ساتھ کھیلے پھر میں تعلیم کے لیے بھیج دیا گیا۔ جس وقت میں رخصت ہوا، وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اس نے کہا تھا۔ "عاص! جلدی واپس آنا۔ عاص! مجھے بھولنا مت۔" اس کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے پھر اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں بیٹی اکیلی رہ گئیں۔

میں نے بھی جلداز جلد تعلیم پوری کی اور تجارت شروع کر دی۔ جب میں گھر جاتا' گویا اس کی عید ہو جاتی۔ وہ پاگل ہو جاتی تھی اور جب میں قیام کی مدت پوری کر کے واپس جاتا تو اس کی دھندلی آنکھیں دور تک مجھے دیکھتیں۔''

عاص سانس لینے کے لیے رکا' سب متوجہ تھے۔ نجانے کب اور کس وقت وائل بن عمار نے اٹھ کر بے تابانہ ٹہلنا شروع کر دیا تھا جو بڑی ہی تکلیف اور اذیت کی علامت تھی لیکن اس وقت کمرے میں موجود ہر فرد عاص کے دکھ میں ڈوب چکا تھا اور آگے جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ عاص نے گہرا سانس لیا اور کہنا شروع کیا۔

''وہ ہمیشہ کہتی تھی' عاص! میں نے دو ہستیوں سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ ایک ماں ہے اور دوسرے تم۔ نہ میں ماں سے الگ رہ سکتی ہوں نہ تم سے۔'' جب میں ایک بار وائل کے ساتھ تجارتی سفر پر گیا' اس وقت وہ بے قابو ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عاص......! میں آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔'' پھر میں روانہ ہو گیا۔ اس نے جاتے جاتے التجا کی۔ ''عاص......! اپنا سفر طویل مت کرنا' طویل مت کرنا۔''

اب عاص بے قابو ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا بازو اپنے چہرے کے آگے کر لیا جیسے سب سے منہ چھپا رہا ہو۔ یہ اس کا نیا روپ تھا۔ ثنا کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور خولہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ ان سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا جو آخر بے تابانہ انداز میں ثنا نے پوچھ ہی لیا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر......'' عاص نے بازو چہرے کے آگے سے ہٹایا۔ ان سب کو دیکھا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''پھر...... پھر...... اس بار میں گیا اور اس لڑکی سے شادی کر لی۔''

لمحہ بھر کو سب حواس باختہ رہ گئے پھر محفل زعفران زار بن گئی۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے قہقہے روک نہ سکا اور وائل نے نجانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ''دھوکے باز...... فریبی...... اتنی بڑی خوشی روک کر اور رلا کر سنا رہا ہے؟ ساتھ کیوں نہیں لایا اس لڑکی کو؟''

''ماں بیمار تھی اس کی اس لیے وہ فی الحال نہیں آ سکی۔'' عاص نے کہا۔ ''لیکن ظاہر ہے' آئے گی۔''

''اس کے آنے سے قبل آپ کو اپنے جرائم کی سزا بھگتنا ہوگی۔'' ثنا نے بناوٹی غصے سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' عاص نے پوچھا۔

''آپ کا پہلا جرم ہے کہ آپ نے چپ چاپ شادی کر لی۔ آپ کا دوسرا جرم یہ ہے کہ سب کو افسردہ و غمگین کیا۔'' ثنا نے کہا۔ ''یہاں جتنے لوگ موجود ہیں' ان سب کی گواہی لیجیے۔ سب کتنے رنجیدہ تھے' کتنے دکھی تھے۔ اب بتائیے' اس پر کیا سزا دی جائے آپ کو؟''

''اس کی سزا یہ ہے کہ سزا بھی اسے خود ہی تجویز کرنا پڑے گی۔'' وائل بن عمار نے کہا۔ ''کہو' منظور ہے؟''

''چلو منظور ہے۔'' عاص نے سخاوت دکھائی۔ ''میں اپنی سزا خود تجویز کرتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد خولہ سمیت تم سب میرے مہمان ہو۔ اپنی بیوی کے آنے تک تمہیں خوب تفریح کراؤں گا' خوب خوب وقت دوں گا۔''

''اور بیوی کے آنے کے بعد؟'' خولہ نے دریافت کیا۔

''پھر اس کی صورت آپ کو نظر نہیں آئے گی۔'' وائل بن عمار نے کہا۔ ''غلام بن کر رہے گا۔''

یوں یہ رات ہنسی اور دل لگی کی نذر ہوگئی' سبھی مسرور تھے۔ دوسرے دن عاص نے پہلے سیر کا اعلان کیا۔ دریا پار اپنے باغات والی کوٹھی میں چند دن گزارنے کا بتایا اور کہا۔

''معزز خواتین......! یہ ایک پنتھ دو کاج والی بات ہے۔ میں چاہتا ہوں' آپ وہاں کچھ وقت بھی گزار لیں اور مجھے کچھ مشورہ بھی دے دیں۔''

وائل بن عمار نے اس کی بات کاٹی۔

''میں اسے خوبصورت طریقے سے سجا لوں اور......''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہ چاہتا ہوں؟'' عاص نے جواب دیا۔

''سب اندازہ کر چکے ہیں کہ تم عمر بھر غلامی کرنے والے شوہر بنو گے۔'' وائل بن عمار نے کہا۔

''فی الحال تو مجھے دوست اور بھائی بننے دو۔'' عاص نے کہا۔ ''اور ایک دوست ہونے کے ناتے میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کسی بھی قسم کی تفریح کے وقت جدا نہیں ہوں گے لہٰذا دریا پار جانے کے لیے میں نے صرف ایک بڑی کشتی کا انتظام کیا ہے۔ سب سفر کا اور وقت کا مزہ لیتے ہوئے دریا عبور کریں گے۔''

خولہ کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی' تنہائی پسندی اسے ہنگاموں سے دور لے جاتی تھی مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ 'چلو' اس بار یونہی سہی۔' امیر عمار کو خبر ہوئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر عاص کو گلے لگا لیا اور کہا۔

''عاص......! تمہاری یہ حرکت سزا کے نہیں' انعام کے قابل ہے لیکن انعام اس لڑکی کو ملے گا البتہ تم نے جو سزا خود تجویز کی ہے' میری نہیں' موسم اسی بات کا متقاضی ہے۔''

غزل

شہر کا شہر حریفِ رسن و دار ملا
نام میرا ہی لکھا کیوں سرِ دیوار ملا

مشتہر کردیا اتنا تری چاہت نے مجھے
نام گھر گھر میں مرا صورتِ اخبار ملا

سوچتے سوچتے دھندلا گئے یادوں کے نقوش
فکر کو نہ میرے اب تک لبِ اظہار ملا

جس کی قربت کو ترستا تھا زمانہ کل تک
آج وہ شخص اکیلا سرِ بازار ملا

میری سچائی کو اس وقت سراہا تو نے
سر پہ جب باندھ کے میں جھوٹ کی دستار ملا

لوگ کیوں میرے حوالہ سے نہ جانیں تجھ کو
میری چاہت سے زمانہ کو یہ معیار ملا

آنکھوں ہی آنکھوں میں لہرائیں بہاریں منظرؔ
اک شجر بھی نہ گلستاں میں ثمر دار ملا

پروفیسر منظر ایوبی

موسم کی خوبصورتی، کشتی کی سیر اور دریا کی دوسری طرف والے باغوں میں قیام کے تصور نے سب کو مسرور کیا ہوا تھا۔ مکمل تیاری کے بعد یہ قافلہ روانہ ہوا۔ یہ کشتی صرف کشتی نہیں، ایک چھوٹا سا جہاز ہی تھا جس میں آرام اور سہولت کی ہر چیز موجود تھی۔ سفر طویل نہیں تھا لیکن ان سب نے اسے خود طویل کر دیا۔ عاص نے خولہ سے کہا۔

''بنتِ رباط! جب آپ اگلی بار تشریف لائیں گی، تب اس دریا پر ایک پل ضرور دیکھیں گی، یہ دریا میرے اور وائل کے علاقے کے درمیان گزرتا ہے۔ آنا جانا کشتیوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے جو ذرا دشوار ہے۔ آئندہ یہ مشکل نہیں ہوگی۔''

''گویا کہ دوسری طرف کا علاقہ آپ کا ہے؟'' خولہ نے پوچھا۔

''یہی سمجھیے۔'' عاص نے کہا۔ ''بس بابا جان......! اور ماں کی وفات کے وقت سے اب تک میں ادھر توجہ نہیں دے سکا لہٰذا اس طرف جیسے ہمیشہ پھولوں اور پھلوں کی کاشت ہوتی تھی، وہی ہوتی رہی بلکہ پھیلتی رہی اور بابا جان کا گھر عین درمیان میں رہ گیا۔ اب پھر میں نے انہیں باغوں کی شکل دی، ان پھلوں اور پھولوں کو بازار اور دور دور بھیجنے لگا اور وائل بن عمار کی طرف کا پورا علاقہ نئے انداز سے تعمیر ہوتا گیا۔''

''گویا کہ آپ کا گھر باغوں کے بیچوں بیچ ہے؟'' خولہ نے کہا۔ ''یقیناً وہ بہت حسین جگہ ہوگی؟''

اور واقعی عاص کا گھر طویل و عریض باغ کے درمیان تھا۔ چند ملازموں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا اور عاص بھی سال میں ایک دو بار ہی یہاں آتا تھا۔ کئی بار وائل اور امیر عمار نے بھی ساتھ دیا تھا۔ ہاں، ثنا اور خولہ پہلی مرتبہ یہاں آئی تھیں اور فطرت کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر متحیر سی ہوگئی تھیں۔ ثنا نے گھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورتی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہوں......'' خولہ نے تائید کی۔ ''ہر کمرے کی کھڑکی، ہر دروازہ اور بالائی منزل کی ہر کھڑکی اور بالکونی کسی نہ کسی چمن میں کھلتی ہے اور دور دریا بہہ رہا ہے جس کے پانی کا کوئی رنگ نہیں لیکن ہزاروں رنگ ہیں۔ اس حسن کو لفظوں میں نہیں سمویا جا سکتا۔''

پھلوں سے لدے ہوئے طویل القامت درخت اور دور تک پھیلے ہوئے رنگا رنگ پھولوں کے تختے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ ٹھنڈی فرحت بخش ہوا اور سرور بخش رہی تھی۔ اسی وقت عاص نے ادھر آتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ قدرے آرام کیجیے پھر نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں، جب تک میں دیکھتا ہوں، یہ ملازم لوگ کیا کر رہے ہیں؟''

''کیا آپ اس حسین موسم اور حسین جگہ پر مہمان بنا کر بٹھانا چاہتے ہیں؟'' ثنا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، آپ لوگ آرام کیجیے، کھانے کا انتظام میں کرتی ہوں۔''

''مجھے یقین تھا کہ تم یہ پیشکش ضرور کرو گی۔'' عاص نے بے تکلفی سے کہا۔

پھر سبھی مصروف ہوگئے۔ کھانے پینے، بھاگنے دوڑنے، گھومنے اور خوش گپیوں میں وقت کا احساس ہی نہ ہوا اور نہ تھکن کا اندازہ ہوا لیکن اس دن جب دن بھر مصروف رہ کر وائل بن عمار آرام کے لیے لیٹا تو نہ دل پر بوجھ تھا نہ افسردگی لیکن اسے اس کی وجہ پر غور کرنے کا وقت بھی نہ ملا اور وہ غافل ہو کر سو گیا۔

یہ دن فطرت کے بے پناہ حسن کی داد دینے میں گزر گئے۔ عاص کے جدت پسند ذہن نے ان تفریحوں کو نئے سے نیا انداز بخشا اور ان سب نے مزہ لیا۔ انہوں نے ہر دن کو ایک یادگار دن بنا کر گزارا۔ اس طرح پانچ روز قیام کے بعد واپس آنا پڑا۔ وائل نے کہا۔ ''عاص......! اب یہاں ناصرہ اور تمہارے پاس آئیں گے تو کافی دن گزاریں گے۔''

''انشاءاللہ!'' عاص نے کہا۔

عاص کی طرف سے یہ دعوت بڑی طویل تفریح تھی۔ اس سے قبل ان سب نے کبھی اتنا مزہ نہیں لیا تھا۔ واپسی پر وائل بن عمار نے عاص سے کہا۔ ''عاص......! ایک بات میں جان نہیں سکتا۔ اس سے قبل مجھے ہر خوشی اداس کر دیتی تھی۔ بقول تمہارے، مجھ پر سوگ کے دورے پڑتے تھے لیکن ان تمام دنوں میں ایک لمحے کے لیے بھی مجھے وہ کیفیت محسوس نہیں ہوئی۔''

''تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ ایسا کیوں ہے؟'' عاص نے دریافت کیا۔

''جبھی تو تمہیں بتا رہا ہوں۔'' وائل بن عمار نے بے تکلفی اور رازداری سے کہا۔ ''حیرت ہے کہ اپنی پسندیدہ شخصیتوں اور ساتھیوں کے ہمراہ وقت گزارنے کے باوجود میرا دل غم سے بھر جاتا تھا۔''

''میرے دوست......!'' عاص نے بڑی ہی رازداری سے کہا۔ ''اگر کوئی تمہارا بہترین دوست، تمہارا بازو کاٹ کر تمہیں یقین دلانا چاہے کہ وہ تمہارا دوست ہے تو کیا تم یقین کرو گے؟''

وائل بن عمار نے قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا تو عاص نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ ''تمہاری پسندیدہ سبھی ہستیاں صرف تمہارا ساتھ چاہتی ہیں اور تم عاطر سے بچھڑ جاتے ہو۔''

اس وقت وائل کے رخ پر حیرت ہی حیرت تھی۔ لمحہ بھر میں اسے وہ سب واقعات یاد آ گئے جب اپنے گرد منڈلانے والی ہستیوں کے ساتھ وہ گھوم کر آنے کے بعد گھنٹوں گھٹن اور اداسی کا شکار رہتا تھا، تبھی عاص نے مذاق کے انداز میں کہا۔ ''میرے دوست......! مجھے تو لگتا ہے کہ تم باپ بیٹے کی ضرورت مشترک ہو اور طلب کے لیے تمہیں ہاتھ بڑھانا پڑے گا۔''

اس بات پر وائل بن عمار کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور یوں لگا جیسے ہر طرف روشنی پھیل گئی ہے۔

•......•......•......•

شادی کے ہنگامے سے فارغ ہونے کے بعد ثنا بنتِ سعد نے قدِ آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی نہ حسن نہ چمک دمک، تب وہ مسکرا دی۔ اسے لگا، کوئی اندر سے سوال کر رہا ہے۔ 'ثنا بنتِ سعد......! جو منزل تم نے پا لی ہے، اس کے لیے سفر تو لاتعداد عورتوں نے کیے جن میں فیہہ جیسی حسین لڑکیاں بھی تھیں، محسنہ جیسی بے مثال بھی اور خولہ جیسی مسحور کن بھی لیکن وہ سب منزل تک کیوں نہ پہنچ پائیں؟''

اس نے غور سے سوال سنا اور دھیرے سے کہا۔

''حصولِ منزل کے لیے سفر ہی نہیں، صحیح راستے کا تعین کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔''

تبھی دوڑ کر آنے والے عاطر نے پکارا۔ ''امی......!'' اور ثنا بنتِ سعد نے اُسے بازوؤں میں لے لیا۔ وائل بن عمار کے رخ پر سکون ہی سکون تھا۔

☆☆......☆☆☆

ماہِ دسمبر کی خصوصی کہانی

سقوطِ ڈھاکہ، بنگلہ دیش کے قیام کے حوالے سے چشم کشا تحریر

کھڑکی میں رکھی آنکھ

(دوسرا اور آخری حصہ)

علی آذر کی پروازِ فکر

اک سمت ہیں دشمن مرے اک سمت ہیں احباب
میں سوچتا ہوں تیر یہ آیا ہے کدھر سے

رئیسہ خالد

ان میں اختلافات ہوئے اور ہوتے ہی گئے۔ ہر ایک کو اپنی زندگی جینے کا حق حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ بھائی بھائی بھی تو زمین کا بٹوارا کر لیتے ہیں اس لین دین میں جھگڑے بھی

ہوتے ہیں' بعض اوقات انسان قتل بھی ہوتے ہیں' خون کی ندیاں بھی بہتی ہیں' عورتوں کی بے حرمتی بھی ہوتی ہے' یہ سب غلط ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

غالباً 28 ستمبر کا دن تھا' ٹکا خان واپس مغربی پاکستان جارہے تھے ہم لوگوں نے انہیں دیکھا تک نہ تھا لیکن ان کے جانے کا افسوس ہو رہا تھا' ایسا لگ رہا تھا کہ اب ہم بے آسرا ہو جائیں گے۔

ہمیں جو خبر ملتی تھی وہ یہی تھی کہ حالات قابو میں ہیں مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ جو دن گزر رہے تھے حالات بد سے بدتر ہی ہوتے جارہے تھے۔ عید سے دو دن قبل سحری کے لیے اٹھے تو پتہ چلا کہ ڈھاکہ شہر میں کرفیو لگ گیا ہے۔ میرے شوہر نے پڑوسیوں سے جا کر معلوم کیا تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ اعلان ہو رہا تھا کہ جس کے پاس بھی اسلحہ ہے وہ اسے اپنے گھر کے باہر رکھ دے' اسے کوئی سزا نہیں ہوگی۔ لیکن تلاشی لینے پر اگر گھر سے کوئی اسلحہ برآمد ہوا تو اسے ہرگز معاف نہیں کیا جائے گا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے لیکن ہر طرف ایک سناٹا طاری تھا' یہ سناٹا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہو رہا تھا۔

19 نومبر کو عید تھی۔ مکتی باہنی نے پھر افواہ اڑائی کہ عید کے دن تخریبی کارروائی کریں گے۔ وہ عید بدحواسی اور مایوسی کا دن تھا۔ نہ بچوں نے نئے کپڑے پہنے نہ عید کی چہل پہل کہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ہر چہرے پر خوف تھا' ہر چہرہ اُداس تھا۔ مردوں نے کسی طرح قریبی مسجد میں نماز ادا کی اور گھر واپس آ گئے بچے سہمے تھے اور سب چہروں پر ایک خوف طاری تھا۔ خدا کا کرم کہ عید کسی حادثے کے بغیر گزر گئی۔ میرے شوہر نے مجھے حکم دیا کہ میں بچوں کو لے کر کراچی چلی جاؤں' حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ بھی چلے آئیں گے۔ انہوں نے بینک سے پانچ ہزار روپے نکال لیے لیکن میں کسی بھی حال میں انہیں تنہا چھوڑ کر جانے کو راضی نہ ہوئی۔ میرے شوہر نے بہتیری کوشش کی لیکن میں پھر بھی انہیں تنہا چھوڑ کر کراچی جانے کو راضی نہ ہوئی' یہاں تک کہ حالات دسمبر کے المیہ تک پہنچ گئے۔ دسمبر میں ملک کے دونوں حصوں میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ دن انتہائی مایوسی اور افسردگی میں گزرتے رہے' میں سجدہ ریز ہو کر اللہ کریم کی بارگاہ میں گڑگڑانے لگی اے میرے پروردگار' اے میرے رحیم و کریم! ہم پر رحم فرما اور ہمیں اپنے حبیب کے صدقے اپنے حفظ وامان میں رکھ۔

جب ہمارے سپاہی ہتھیار ڈال رہے تھے تو ہماری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مگر بنگالی فتح و کامرانی کے نعرے لگا رہے تھے۔ شادیانے بجارہے تھے۔ ایک ہی دن مغربی پاکستان میں غم اور مشرقی پاکستان میں خوشی کا دن کیسے بن گیا۔ تعجب کی بات ہے کہ بغاوت کرنے والے کوئی غیر نہ تھے ہمارے اپنے ہی تھے۔ 3 دسمبر رات بارہ بجے زوردار آواز سے آنکھ کھل گئی' ہندوستانی ایئرفورس کے بمباروں نے وار کرنا شروع کر دیا تھا' شروع میں وہ نیچی پرواز کر کے بمباری کرتے جس سے تقریباً پورے علاقوں کے گھروں کے شیشے چور چور ہو کر گھر میں بکھر جاتے۔ لیکن اب وہ بلندی سے بمباری کر رہے تھے۔ ان کی بمباری سے ایئرپورٹ مکمل تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری ایئرفورس کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہو سکی' پاکستان ایئرفورس کے

بہادروں کی پرواز بند ہوتے ہی ہر طرف مایوسی طاری ہونے لگی اور سب کے حوصلے پست ہو گئے۔ 14 دسمبر کو صبح ناشتے کے بعد خطرے کا سائرن سنائی دیا۔ چند منٹوں بعد ہندوستانی طیارے آئے اور چکر لگا کر واپس چلے گئے۔ ہماری توپیں خاموش رہیں۔ لوگوں کو کہتے سنا کہ ہماری طرف سے سرنڈر ہو گیا ہے' اب کھیل ختم ہو چکا' اتنا بڑا سانحہ کسی فوری غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا۔ ذلت اور ناکامی کے لمحے شروع ہو گئے' ملک کا ٹوٹ جانا اور لاکھوں افراد کا دشمن کے نرغے میں چلا جانا بلاشبہ ایک بڑا المیہ ہے۔ اکثر سوچتی ہوں کہ کون سے عوامل تھے کہ یہ روز سیاہ ہمارا مقدر بن گیا۔ ہمارا ایک بازو ہمارا اپنا وطن بے مقصد سیاست کی نذر ہو گیا۔

16 دسمبر کو بی بی سی نے بتا دیا کہ جنرل نیازی اور مانک شاہ کے درمیان جنگ بندی کی شرائط طے ہو رہی ہیں۔ فوج نے 16 دسمبر کو ہتھیار ڈال دیے جبکہ ملک کے مغربی حصے میں 'سب کچھ بہتر ہے اور حالات قابو میں ہیں' کی رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔ خبریں آ رہی تھیں کہ بھارتی فوج اپنا گھیرا ہر طرف سے تنگ کر رہی ہے' پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں سمٹنے لگیں۔

فوج کے جانی تحفظ کی پوری کوششیں کی جا رہی تھیں۔ بھارت نے کئی جگہ پاکستانی فوج کی پیش قدمی کے راستے مسدود کر دیے تاہم اسے ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کرنے میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ 16 دسمبر کی صبح تک کچھ بھارتی فوج ڈھاکہ کے گرد و نواح پہنچ چکی تھی۔ فوج کو ریس کورس میں ہتھیار ڈالنے کے لیے اہتمام ہو رہا تھا۔

یہ پاکستان کی زندگی کا پچیسواں سال تھا۔ پاکستان کی قسمت میں اس کی سلور جوبلی شاید اسی طرح منائی جانی لکھی تھی۔

ڈھاکہ میں کہیں کہیں گولیوں کے چلنے اور بم دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ ریس کورس میں جمع ہو رہے تھے' بھارتی کمانڈر جنرل اروڑا سنگھ کا ہیلی کاپٹر ڈھاکہ کے خستہ حال ہوائی اڈہ پر اترا' جنرل نیازی نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ ایک کار انہیں ریس کورس لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ساڑھے چار بجے جنرل نیازی اور اروڑا سنگھ ریس کورس میں آئے۔ جنرل نیازی کا بایاں ہاتھ آگے بڑھا اور انہوں نے میز پر پڑے ہوئے سرنڈر کے توہین آمیز مسودے پر دستخط کر دیے۔ دستخط کرنے کے بعد انہوں نے اپنا ریوالور گولیوں سے خالی کر کے اروڑا سنگھ کے حوالے کر دیا۔ نیازی کے تمغے اور رینک اتار لیے گئے۔ وہ جانے کے لیے گاڑی کی طرف بڑھے تو ہجوم کی طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ قصاب' قاتل اور بھیڑیے کا شور بلند ہوا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر جنرل نیازی کے سر پر جوتا کھینچ مارا۔ (نوٹ: یہ واقعات ڈاکٹر حمود الرحمن کی رپورٹ سے لیے ہیں)۔

عوام کو ہمیشہ اصل حالات سے اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ ہر محاذ پر پاک فوج کی کامیابیوں اور بھارتی افواج کی پیش قدمی روک دینے کی خبریں آ رہی تھیں۔ لیکن جب حقیقت کا پتہ چلا تو اس منحوس خبر پر اعتبار کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ صدیوں کی جدوجہد اور لاکھوں قربانیوں کے عوض حاصل کیا گیا ملک اتنی تیزی سے دشمن کی گود میں چلا جائے گا۔ لاکھوں سپاہی اس طرح بے کسی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیں گے۔ آخری دم تک

لڑنے کی حسرت پوری کیے بغیر یوں ہار مان لی جائے گی۔ اس قسم کے سوالات ذہنوں میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ فوج ہتھیار ڈال چکی تھی۔ اُن کے دستے مارچ پاسٹ کرتے ہوئے آئے اور لائنوں میں کھڑے ہوگئے۔ پھر باری باری ہر دستہ آگے بڑھا اور اپنے ہتھیار اور بیلٹ اسلحے کے ڈھیر کی نذر کردیے۔ افسران کے امتیازی نشانات اور تمغے کندھوں سے اور سینے سے نوچ کر پھینک دیے گئے۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد فوج واپس کیمپ میں آگئی۔

کرنل رضوی جوانوں سے جدا ہونے سے پہلے تقریر کرنے اٹھے۔ انہوں نے بہ مشکل چند الفاظ ادا کیے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مسلمان ہوکر آج ہم نے پہلی دفعہ ہتھیار ڈالے ہیں' پھر ان کے آنسو بہہ نکلے' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے دوبارہ زبان کھولی اور کہا آج ہم انڈیا کی قید میں ہیں۔' اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

وہ رات تو ہم لوگوں نے پلابی میں ہی گزاری۔ بھائی اور ان کے بیوی بچے ہمارے گھر میں آگئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کب کیا ہوگا' بنگالی ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ مقامی لوگوں کے دلوں میں نفرت بڑھ چکی تھی۔ لوگ پنجابیوں کو ظالم سمجھتے تھے کیونکہ مغربی پاکستان سے آنے والی زیادہ تر فوج اور پولیس کا تعلق پنجاب سے تھا۔ انہوں نے لوگوں کو تین گروپ میں بانٹ دیا تھا۔ پنجابی' بہاری اور بنگالی' بہاری تو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اُن کی نظر میں بہاری اس لیے برے تھے کہ انہوں نے فوج کا ساتھ دیا تھا اور بنگالیوں کی خاموش نگاہوں نے بتادیا تھا کہ ہم جو بھی ایک تھے اب کبھی ایک نہ ہوسکیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری راہیں جدا ہوجائیں گی۔ ہم اپنے قومی المیہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے' ہم اپنے مستقبل سے بالکل مایوس ہوچکے تھے' ہمیں پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے۔

رات تو کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ صبح ہوتے ہی پتہ چلا کہ پلابی کے سارے اردو بولنے والے پلابی خالی کرکے گیارہ نمبر میر پور جاچکے ہیں۔ صرف ہم لوگ ابھی تک یہاں موجود تھے۔ پورا علاقہ بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم لوگوں کی جان نکل گئی۔ گیارہ نمبر محفوظ علاقہ تھا اس لیے اور جگہوں سے بھی لوگ اس علاقے میں آکر پناہ لے رہے تھے۔ صبح کے وقت ہمارے میاں کے قریبی رشتہ دار اور ہمارے پڑوسی ظفر ہمارے گھر آئے اور ہم لوگوں سے گیارہ نمبر چلنے کے لیے کہا کیونکہ لوگوں کے خیال میں پلابی غیر محفوظ ہوگیا تھا۔ ظفر نے وہاں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا جس میں اُن کی فیملی کے علاوہ تیس پینتیس افراد اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ مکان میں صرف دو کمرے اور صحن تھا۔ چونکہ ہر جگہ سے لوگ وہاں آکر پناہ لے رہے تھے اس لیے مکان کرایہ پر دستیاب نہیں ہورہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں میں کئی کئی خاندان ایک ساتھ وقت گزار رہے تھے۔ ہم لوگ بھی بچوں کے ساتھ اسی گھر میں چلے گئے۔

بچوں کو جو گرم کپڑے پہنا سکتے تھے پہنائے اس کے علاوہ بچی کے دودھ کا ڈبہ اور دودھ کی بوتل ساتھ لی۔ ہم نے بھرے گھر کو حسرت سے دیکھا اور اس سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر گھر سے نکل گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بھرے پڑے گھر سے کیا اٹھائیں۔ الماری سے وہ رقم ضرور نکال لی

جو میرے شوہر کچھ دن پہلے لے کر آئے تھے۔
گیارہ نمبر کے اس مکان میں ہم لوگ کئی روز رہے۔ پہلے دن تو عجیب عالم تھا۔ ساری عورتیں اور بچے کمروں میں بند تھے۔ شہر کے جن علاقوں میں اردو بولنے والے تھے وہ سب گیارہ نمبر میں اپنے عزیز و اقارب کے یہاں آ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب اردو بولنے والے پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا اور کرفیو کے باوجود بہاریوں کا خون ارزاں ہوگیا تو کچھ حوصلہ مند نوجوان اسلحہ کے نام پر لاٹھیاں اور ڈنڈے اور جو کچھ انہیں ملا' لے کر چھتوں پر سے مقابلہ کر رہے تھے' کم از کم مقابلہ تو کیا...... باقی زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد جے بنگلہ کی آوازیں آتیں اور ایسا لگتا کہ مکتی باہنی حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ ہر لحہ ایک خوف سا چھایا رہتا' ذہن و دماغ ماؤف سا ہوگیا تھا۔ کھانے پینے کا کسے ہوش تھا لیکن چند عورتوں نے ہمت کر کے بچوں کے لیے بڑی دشواری سے کھچڑی بنانے کی کوشش کی۔ فائرنگ اس قدر ہو رہی تھی کہ بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص جان بچانے کی کوشش میں تھا۔ مکان میں تو صرف دو ہی کمرے تھے' یلغار بڑھتی گئی ہم لوگ ساری رات صحن میں گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ دسمبر کی کڑاکے کی سردی اور رات کا وقت ہم نے اور ہمارے بچوں نے کس طرح گزارا ہم مائیں ہی جان سکتی ہیں۔
بنگلہ دیش بننے سے قبل جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور ڈبل ڈیکر بس سے جایا کرتی تھی تو میں نے بات محسوس یہ کی کہ ایک بس کا ڈرائیور جو مجھ سے عمر میں کافی چھوٹا بیس بائیس سال کا ہوگا۔ مجھے بڑے غور سے دیکھا کرتا ہے۔ پہلے تو میں نے اسے ایک اتفاق سمجھا لیکن جب اکثر ایسا ہونے لگا تو میں پریشان ہوگئی۔ ہمارا گھر سڑک سے زیادہ دور نہیں تھا جب میں گھر سے بس کے لیے نکلتی تو مجھے دیکھتے ہی گاڑی روک کر میرے وہاں تک پہنچنے کا بے قراری سے انتظار کرتا اور جیسے ہی بس میں سوار ہوتی' وہ بس کا شیشہ اس زاویے سے کر دیتا کہ میں اسے شیشے میں صاف نظر آ ؤں۔ پہلے تو میں نے اسے وہم سمجھا لیکن جب اکثر ایسا ہونے لگا تو میں ڈر سی گئی۔ کوشش یہی کرتی کہ اس بس پر نہ چڑھوں' شوہر کو بھی بتاتے ہوئے خوف آتا کہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے اور خواہ مخواہ کوئی بدنامی ہاتھ نہ آ جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا آخر وہ ایسا کیوں کرتا ہے جبکہ عمر میں وہ مجھ سے کافی چھوٹا ہے۔ اس بات کا پتہ تب چلا جب ہم لوگوں نے ہتھیار ڈالے اور گیارہ نمبر کے اس مکان میں پہنچے جہاں ظفر کا کنبہ مقیم تھا۔ وہ لڑکا بھی وہیں ٹھہرا ہوا تھا اس کا کنبہ ساتھ ہی تھا' مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی نظر آئی۔ جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا اپنی ماں اور بہنوں کو بلا کر لے آیا۔ اس کی امی اور بہنیں مجھے دیکھ کر ایسے خوش ہو رہی تھیں جیسے انہیں بہت بڑا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ اس کی امی میرے پاس آ کر مجھے پیار کرنے لگیں۔ وہ ساتھ ہی ساتھ روتی بھی جاتی تھیں۔
میں کچھ گھبرا سی گئی میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ لوگ آخر ایسا کیوں کر رہے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اس کی امی نے مجھے پیار کرتے ہوئے بتایا کہ میری بیٹی کا چند سال قبل انتقال ہوگیا۔ اس سے چھوٹا میرا یہ بیٹا تھا جو اپنی بہن سے بے حد محبت کرتا تھا آج بھی اس کی یاد میں اکثر روتا رہتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ چند دنوں سے بہت خوش نظر آ رہا ہے اور اکثر بتایا کرتا

ہے کہ ایک صاحبہ ہماری بس میں سفر کرتی ہیں جو بالکل میری باجی کی ہم شکل ہیں' انہیں دیکھ کر میرا جی کرتا ہے کہ اپنی باجی سے لپٹ کر بہت روؤں۔

اب یہ راز میرے سامنے کھل چکا تھا۔ جگہ کی تنگی کی بنا پر مجھے گھر بدلنا پڑا جو ظفر کے گھر سے بالکل قریب تھا' میں آج بھی نہ تو اس لڑکے کو بھول پائی ہوں جو مجھے باجی سمجھتا تھا اور نہ اس کے کنبہ کے افراد کو' پھر کبھی ان سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔

اب حالات پہلے سے بدتر ہو رہے تھے۔ مکتی باہنی کے لوگ کسی بھی وقت گھر میں گھس جاتے جو چیز انہیں پسند آتی اٹھا کر لے جاتے' گھر کی کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ ہم جس گھر میں رہ رہے تھے وہ نہایت چھوٹا سا گھر تھا جس میں دو کمرے اور صحن تھا' برآمدہ اور باورچی خانہ تک نہ تھا ٹوٹا پھوٹا سا ایک غسل خانہ تھا جو دروازے سے محروم تھا' روشنی اور پانی تو پورے علاقے سے غائب تھا۔ قریب ہی ایک دریا تھا جہاں سے پینے کے علاوہ سب کاموں کے لیے مرد پانی لے کر آتے تھے۔ گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک ہینڈ پمپ تھا لیکن یہ واحد ہینڈ پمپ تھا جہاں سے پورے گیارہ نمبر کو پینے کا پانی ملتا تھا لیکن مرد وہاں نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ان کی جانوں کو خطرہ تھا اس لیے گھر کے ہر بچے کو ذمہ داری اٹھانی پڑی کہ پانی لائیں۔ رات کے دو بجے ہم اپنے اور بھائی کے بیٹے کو گرم کپڑے پہنا کر پانی لانے کے لیے بھیجتے تھے۔ ہمارا بیٹا اور بھتیجا جن کی عمریں دس سے بارہ سال تھیں اس گھر میں آنے کے بعد میرے شوہر کی خالہ' خالو اور ان کے دو بچے بھی ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آ گئے تھے۔ ان کا بیٹا چودہ سال کا ہوگا۔ تینوں بچے ایک ایک دیگچی لے کر جاتے' بالٹی وغیرہ تو تھی نہیں' اس لیے جو برتن تھا اسی میں پانی لانا پڑتا۔ ہینڈ پمپ پر بچوں کی لمبی لائن ہوتی۔ یہ لوگ بھی لائن میں جا کر لگ جاتے۔ وہاں بچوں کا ہجوم ہوتا اس لیے خاصی دیر کے بعد ان کا نمبر آتا۔ اگرچہ ہم انہیں رات کے دو بجے وہاں بھیجتے لیکن گھر واپس آتے ہی انہیں دن کے دو بج جاتے' درمیان میں ایک ایک بچہ آ کر ناشتہ کر جاتا۔ وہ جگہ اتنی دور تھی کہ گھر پہنچتے پہنچتے آدھے سے زیادہ پانی راستے میں گر جاتا۔

پہلے تو میری اور بھائی کی فیملی ملا کر نو بندے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد میری ایک رشتے کی خالہ اور میرے شوہر کی خالہ اور خالو اور بچے ملا کر چودہ بندے ہو گئے۔ مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ بھائی اور اُن کی فیملی کے لیے دوسرے کمرے میں ہماری اور خالہ کی فیملی والے رہ رہے تھے۔ بس کسی طرح وقت گزر رہا تھا۔ پینے کے پانی کی بڑی قلت تھی' کھانے میں صرف ابلے چاول کے علاوہ اور کچھ نہ تھا' نمک بھی ندارد......

جب حالات تھوڑے بہتر ہوئے تو ہم عورتیں چھپ چھپا کر باہر نکلتیں لیکن مردوں کے لیے باہر نکلنے میں خطرہ ہی خطرہ برقرار تھا۔ ایک دن ہم بہاری عورتوں نے پروگرام بنایا کہ اپنے گھروں کو چل کر دیکھا جائے جنہیں ہم چھوڑ کر بھاگ آئے ہیں۔ وہ جگہ اتنی قریب نہ تھی پھر بھی ہم پیدل چل کر وہاں پہنچے۔ ضرورت کا جتنا سامان ہم اٹھا کر لا سکتے تھے لانے کی کوشش کی۔ غریب امیر دونوں کا ایک ہی حال تھا۔ ایک ہزار روپے دے کر بھی ایک پلیٹ چاول نہیں ملتے تھے۔ عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ اللہ کا کرم ہے کہ میں اپنے گھر سے چاول لے آئی تھی' اچار بھی لے آئی تھی' کسی طرح گزارہ ہو رہا تھا' پانی کی تنگی نے اتنا مجبور کیا

تھا کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھونے کا تصور ہی ختم ہو چکا تھا۔ چاول کی پیچ سنبھال کر بچوں کے لیے رکھ دیتی تھی۔ ہم چودہ بندے صرف ایک اچار کے ٹکڑے کے چودہ ٹکڑے کرتے اور کسی طرح چاول کے چند نوالے حلق سے اتار پاتے۔ پانی صرف حلق تر کرنے کے لیے پیتے کیونکہ چاول بغیر نمک کے گلے سے اترتا نہیں تھا۔ بہتیرے تو ایسے تھے جن کو یہ بھی میسر نہ تھا۔ ریڈ کراس والے بہت تھوڑا سامان دیتے جن میں مکئی کا آٹا' چینی اور خشک دودھ ہوتا۔

گھر میں کچن نہیں تھا آنگن میں اینٹیں جوڑ کر لکڑی سے کھانا بناتے' دن میں تو کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ دسمبر کا مہینہ تھا لیکن رات اس قدر سرد ہوتی تھی کہ کھلے آسمان کے نیچے کھانا بنانا دشوار ہو جاتا۔ لوگ بھی زیادہ تھے اور کچھ ان دنوں میں کھایا بھی زیادہ جاتا تھا۔ چھوٹے بچے بھی تین تین روٹیاں بغیر کسی سالن کے کھا جایا کرتے تھے۔

ان دنوں پیسوں کی کوئی اہمیت نہ تھی مانگنے والے بچے بھی پیسہ لینا نہیں چاہتے تھے۔ دن میں مانگنے والے بچوں کا تانتا لگا رہتا۔ چاول کی پیچ بھی اگر انہیں ملتی تو اسے بڑے شوق اور چاؤ سے پیتے۔ ایک دفعہ ہم کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ مانگنے والے بچے آ گئے اور ہمیں انہیں مجبوراً بھگانا پڑا کیونکہ ہمارے پاس خود بھی جو کھانا تھا وہ ناکافی تھا۔

ایک دن صبح اعلان ہونے لگا کہ ساری عورتیں اور بچے ایک خاص میدان میں جمع ہو جائیں' مردوں کو کسی اور جگہ جانے کی ہدایت دی جا رہی تھی۔ اعلان یہ تھا کہ گھر میں یا گھر کی کسی چیز کو تالا نہ لگایا جائے کیونکہ مکتی باہنی گھر کی تلاشی لیں گے۔ وہ میدان جہاں عورتوں کو جمع ہونا تھا ہمارے گھر سے قریب ہی تھا۔ مردوں کو جہاں جانا تھا وہ جگہ کافی دور تھی اور ہمیں پتہ بھی نہ تھا کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سب گیارہ نمبر والے میدان میں جمع ہو گئے جو کافی وسیع تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان بچوں اور عورتوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ سارے علاقے کو چاروں طرف سے مکتی باہنی نے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس طرح اسلحہ کی نمائش کر رہے تھے کہ ہمارا دل خوف سے پریشان تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مکتی باہنی ہم سب ہی کی موت بن کر ہمارے سر پر سوار ہے۔ شام تک ہم لوگ اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ دوبارہ اعلان ہوا کہ ساری عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ تلاشی کے نام پر وہ گھر کا قیمتی سامان اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ہم لوگوں کے گھر پہنچتے ہی مرد حضرات بھی واپس آتے دکھائی دیے۔ زیادہ تر مردوں کو وہ ساتھ لے گئے۔ کسی گھر کا ایک مرد یا سارے مرد واپس نہیں آئے تو کہرام سا مچ گیا۔ ظفر کے گھر میں صرف ظفر کو چھوڑ کر سارے مردوں کو وہ ساتھ لے گئے۔ اس وقت تک یہی لگتا تھا کہ انہیں لے جا کر مار دیں گے۔ ان میں سے بہتوں کو گھر آنا نصیب نہ ہو گا مگر خدا کا شکر کہ ہمارے گھر کے تینوں مرد واپس آ گئے۔ ہر طرف سے رونے پیٹنے اور آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ قیامت کا سماں بندھا تھا۔ دو تین دن بعد ان میں سے کچھ لوگ لوٹ آئے اور جو نہیں آئے انہیں پھر کبھی لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد پھر اعلان ہونے لگا کہ ہر فرد قریب ندی میں چھلانگ لگا کر ہتھیار تلاش کرے کیونکہ ان کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ

اردو داں طبقے نے ہتھیار ندی میں پھینک دیے تھے۔ دسمبر کا مہینہ کڑاکے کی سردی اور صبح سویرے کا وقت' ویسے بھی مشرقی پاکستان میں سردی کچھ زیادہ ہی پڑتی ہے۔ تمام افراد ہتھیار تلاش کرتے' کہیں کچھ ہتھیار ملتے کہیں نہ ملتے۔ یہاں بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ہمارے بھائی اور شوہر جلد ہی ہتھیار کے ساتھ باہر نکل آئے۔ لیکن میرا ایک دیور بچی عمر کا تھا کئی گھنٹے پانی میں ڈوبا رہا لیکن کوئی ہتھیار تلاش نہ کر سکا۔

کچھ دنوں بعد مکتی باہنی کی طرف سے پھر اعلان ہونے لگا ساری عورتیں اور بچے فلاں میدان میں جمع ہو جائیں۔ گھر سے جو قیمتی سامان لے جا سکتی ہیں وہ ساتھ لے جائیں۔ قیمتی سامان سے مراد روپیہ' پیسہ اور زیور تھا۔ گھر میں اور صندوق وغیرہ میں تالا نہ لگائیں۔ سب چیزیں کھلی رکھیں۔ مردوں کو کسی اور جگہ جانے کی ہدایت کی جا رہی تھی۔ اس بار دونوں جگہیں گیارہ نمبر سے بہت دور تھیں۔ ہم لوگوں کے پاس کوئی قیمتی سامان نہ تھا سوائے اس پانچ ہزار کے وہ میں نے اپنے ساتھ لے لیے۔ اس کے علاوہ بچی کے دودھ کا چھوٹا ڈبہ' اس کی بوتل اور ایک تھرماس میں گرم پانی' دو چادریں زمین پر بچھانے کے لیے۔ بھابی کی بچی بھی چھوٹی تھی۔ پتہ نہیں تھا کہ وہاں کتنی دیر رکنا پڑے گا۔ بڑے تینوں بچے بھی زیادہ بڑے نہ تھے۔ لیکن ان کو کھلانے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد عورتوں اور بچوں کا قافلہ گیارہ نمبر سے چل پڑا۔ سردی کا موسم تھا اس لیے سب بچوں کو گرم کپڑے پہنا دیے گئے تھے۔ سب عورتوں اور بچوں کو ایک ہی جگہ جانا تھا' دور دور تک صرف عورتیں اور بچے ہی نظر آ رہے تھے'

وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ یہاں بھی چیکنگ ہوگی۔ چاروں طرف مکتی باہنی پوزیشن لیے نظر آ رہے تھے۔ چیکنگ کے لیے انہوں نے جن لوگوں کو بلایا تھا وہ زیادہ تر سبزی فروش' ماسیاں اور اس علاقے کی بنگالی عورتیں تھیں۔ مردوں کے بجائے انہوں نے عورتوں کو ترجیح دی تھی۔ تلاشی چاروں کونوں سے شروع ہوئی اس لیے کوئی بھی بچ نہیں سکتا تھا۔ چاروں کونوں پر ایک چھوٹی سی جگہ گھیر کر ایک کمرہ سا بنا لیا گیا تھا ایک ایک عورت کو وہاں لے جایا جاتا اور اُس کی تلاشی لی جاتی' ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا یا انہوں نے کہیں چھپایا ہوتا وہ عورتیں نکال لیتیں۔ اس طرح چاروں کونوں سے لوگوں کو اٹھا کر ان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اسی طرح شام ہوگئی ہمارے بچے بھوکے پیاسے تھے مگر ہم ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ہماری باری آنے والی تھی۔ اس دن شام تک تقریباً پچاس بچے ماؤں کی گود میں دم توڑ چکے تھے۔ کئی ضعیف عورتیں بھی اس دن تکلیف برداشت نہیں کر سکیں اور انہوں نے بھی دم توڑ دیا۔ ہم عورتیں درخواست کرتیں کہ ہمیں اتنی مہلت دی جائے کہ ان مردہ بچوں کو گھر چھوڑ آئیں لیکن مکتی باہنی ہمیں اجازت نہیں دیتے' ان کا کہنا تھا کہ بچے کو یا تو یہیں پھینک دیں یا گود میں لے کر یہیں بیٹھیں رہیں' گھر جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ مائیں مردہ بچوں کو لے کر سارا دن بیٹھی رہیں۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت ہو گیا۔ تلاشی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن اندھیرا ہونے سے قبل پھر اعلان ہونے لگا کہ سب عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں اگر وہ پیچھے رہ گئیں تو ہم لوگ اس کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ اب جو عورتوں اور بچوں نے بھاگنا شروع کیا تو بھگدڑ سی

مچ گئی۔ ایک قیامت کا سماں تھا جو گر جاتا اسے اٹھانے والا نہ تھا' لوگ اس کے اوپر سے گزر جاتے۔ سب کو یہ خوف تھا کہ ہم پیچھے نہ رہ جائیں اور ہم پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔ چھوٹے بچوں کی ماؤں کو اس لیے زیادہ مشکل تھی کہ بچوں کو گود میں لے کر بھاگنا تھا۔ وہ جگہ گیارہ نمبر سے بھی بہت دور تھی اس لیے گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ گھر جاتے ہی پتہ چلا کہ آج بھی کئی گھروں کے مرد گھر واپس نہیں آئے۔ پورے محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر کا سارا سامان بھی وہ اٹھا لے گئے تھے۔

اس بار سارے مردوں کو بہت دور کسی جگہ لے جایا گیا اور انہیں کئی قطاروں میں بٹھا دیا گیا پتہ نہیں کتنی قطاریں تھیں' یہاں بھی پہلے دن والا سماں تھا۔ انہوں نے لوگوں کی پہچان کرانے کے لیے نوکروں' دکانداروں اور محلے کے سبزی اور مچھلی فروشوں کو بلایا تھا۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ یہ اچھا آدمی نہیں ہے تو اسے کالر سے اُٹھا کر ٹرک پر پھینک دیتے 'ایسے جیسے بھیڑ بکریوں کو پھینکتے ہیں اور پھر وہ ٹرک مقتل کی طرف جاتا یا جیل کی طرف...... میرے شوہر اور بھائی کی طرف کئی دفعہ وہ لوگ آئے ایک انہیں کالر پکڑ کر کھڑا کر دیتا تو دوسرا کہتا یہ تو بھالو مانش ہے اسے چھوڑ دو۔ صبح سے شام تک یہی سلسلہ چلتا رہا ایک اٹھاتا دوسرا منع کر دیتا۔ اس طرح کسی کو بھی اگر کسی سے دشمنی تھی تو اس نے اس دن بدلہ لے لیا۔ میرے شوہر اور بھائی کے آگے اور پیچھے سے تمام لوگ اٹھا لیے گئے۔ ان میں بہت سارے ہمارے رشتہ دار اور قریبی جاننے والے لوگ بھی تھے جو پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئے۔ شوہر اور بھائی رات گئے واپس آئے اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا۔ اس اثناء ہم نند بھاوج کا برا حال ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب انہیں کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔ جس گھر میں ہم لوگوں کا قیام تھا وہ بہت ہی غیر محفوظ تھا اس لیے عموماً جب رات کے وقت فائرنگ شروع ہو جاتی تو ہم لوگ ظفر کے گھر کی طرف بھاگتے۔ میرے پاس جو پانچ ہزار روپے تھے ان کا سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ گھر میں بھی انہیں مختلف جگہوں پر چھپا کر رکھنا پڑتا تھا کیونکہ مکتی باہنی کسی وقت بھی گھر میں گھس جاتے تھے اور جو چیز انہیں پسند آتی اس پر اپنا حق سمجھ کر لے جاتے۔ خصوصاً رات کے وقت جب فائرنگ ہوتی اور گھر سے بھاگنا پڑتا تو میں سب سے پیچھے رہ جاتی کیونکہ اندھیرے میں ان روپیوں کو مختلف جگہ سے نکالنا بہت دشوار تھا۔ میرے بھائی ہمیشہ ناراض ہوتے اور کہتے ان پیسوں کے چکر میں ایک دن تمہاری جان جائے گی' لیکن میں کیا کرتی بھاگتے وقت اسے لے جانا بھی ضروری سمجھتی تھی' کیونکہ اگر زندگی بچ جاتی تو اس کی ضرورت یقیناً پڑتی' اور کہیں سے پیسہ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا میں نے سوچا کہ کیوں نہ ان گڈیوں کو ہزار کے نوٹ میں تبدیل کرا لیا جائے سو میں نے ویسا ہی کیا' لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ ابھی ہزار کے نوٹ تبدیل کیے کچھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ اچانک یہ اعلان ہونے لگا کہ ہزار کا نوٹ اب نہیں چلے گا۔ جس کے پاس ہزار کا نوٹ ہو وہ اسے تبدیل کرا لے۔ ہم لوگ تو سب قیدی تھے باہر آنے جانے پر پابندی لگ گئی تھی آخری دن چند بنگالی آ گئے اور انہوں نے ہزار روپیہ کے بدلے صرف تین سو روپے دیے مرتی کیا نہ کرتی اسی قیمت پر قانع ہو گئی۔

اب حالات قدرے بہتر تھے۔ دل دہلانے

دینے والی فائرنگ کی آواز نہیں آتی تھی لیکن اردو بولنے والے اپنے علاقے سے کہیں باہر آجا نہیں سکتے تھے۔ لوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مکتی باہنی جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتے آپ انہیں منع نہیں کر سکتے تھے۔ ہم لوگ اپنا بھرا پورا گھر چھوڑ کر آئے تھے' وہاں بھی اب کچھ نہیں بچا تھا۔ تالا توڑ کر گھروں پر مقامی لوگ قبضہ کر رہے تھے۔ اس دن کے بعد ہم لوگوں نے گھروں کی شکل تک نہیں دیکھی۔ بس زندگی ایسے حالات سے گزر رہی تھی کہ ایک دن میرے چچا' جن کے ایک بنگالی دوست بہت بڑے عہدے پر فائز تھے ان سے اجازت لے کر ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ وہ اپنے ساتھ بہت ساری روزمرہ کی چیزیں لے کر آئے کئی دنوں بعد سبزی نصیب ہوئی تھی۔

مشرقی پاکستان میں بعض فوجی افسروں نے جو مظالم ڈھائے اس کا تذکرہ حمود الرحمن کمیشن کی رپورٹ میں مل جاتا ہے مگر جو خوفناک جرائم باغی' بنگالی فوجیوں اور مکتی باہنی کے گوریلوں نے کیے ان کا انکشاف بعد میں غیر جانبدار بنگالی مصنفین کی کتابوں میں ہوا ہے۔

1971ء میں پاکستانی فوج کے خلاف تین بڑے الزامات لگائے گئے۔ پہلا انہیں تیس لاکھ بنگالیوں کو بے دردی سے قتل کیا' تین سے چار لاکھ عورتوں کی آبروریزی کی اور یہ کہ گاؤں کے گاؤں جلا دیے۔

مشہور بھارتی صحافی شرمیلا بوس کے مطابق بھارت نے مختلف اوقات میں لگ بھگ اسی ہزار بھارتی گوریلے خفیہ طور پر مشرقی پاکستان میں داخل کیے۔ یہ لوگ علاقے کے مختلف راستوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ان لوگوں نے غربی پاکستانیوں اور خاص کر بہاریوں پر قیامت ڈھادی' ان کی دکانیں جلادی' مردوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے گولی ماردی' عورتوں کی آبروریزی کے بعد ان کے پیٹ چاک کیے' شہید ہونے والے تمام لوگ مغربی پاکستانی یا بہاری تھے۔ اس قتل و غارت گری کا اندازہ اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو 30 مارچ 1971ء کو Michael Laurent Times کے حوالے سے شائع ہوئی۔ رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ سات ہزار پاکستانی اور پاکستان پسند بنگالی دو دنوں میں صرف ڈھاکہ میں مارے گئے۔

جنگ کے شروع میں مشرقی پاکستان میں فوج کی کل تعداد لگ بھگ 20 ہزار تھی' دسمبر تک یہ تعداد بڑھ کر 34 ہزار ہوگئی' تقریباً 11 ہزار سول' پولیس اور رضاکار تھے۔ یہ لوگ وہاں گوریلا اور حقیقی جنگ کا مقابلہ کر رہے تھے۔ شرمیلا بوس کی 6 سالہ تحقیق کے مطابق پاکستان آرمی نے کہیں بھی کسی عورت' بچے یا بوڑھے پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ سنی سنائی باتیں تو بہت تھیں لیکن کسی نے بھی ایسے قتل کی گواہی نہ دی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں ضرورت پڑی انہوں نے ایسے لوگوں کی مدد کی۔

اسی طرح 9 دسمبر 1971ء کی رات کو ڈھاکہ میں یتیم خانہ پر بمباری کی گئی جس میں تین سو معصوم بچے ہلاک ہوئے۔ یہ شرمناک جھوٹا الزام بھی پاکستان ایئرفورس پر لگا جبکہ پاکستان ایئرفورس کے جہاز تو 6 دسمبر کو ڈھاکہ میں گراؤنڈ کر گئے تھے۔

اسی طرح 14 دسمبر کی رات بمبار جہازوں نے نارائین گنج کا پاور اسٹیشن تباہ کرنے کے لیے بمباری کی۔ جب وہ بمباری کر کے چلے گئے تو پتہ چلا کہ پاور ہاؤس تو سلامت رہا' لیکن اس کے نزدیک ایک پورا گاؤں تباہ ہوگیا جس میں 500

لوگ ہلاک اور 150 زخمی ہوئے۔ الزام پاکستان پر لگا...... اس کی تفصیل ڈیلی آبزور میں چھپی۔ بہت سے لوگوں کو جیسور میں مکتی باہنی والوں نے قتل کیا۔ بین الاقوامی میڈیا میں وہ بھی پاکستان آرمی کے مظالم کے عنوان سے دکھائے گئے۔ عوامی لیگ کے ایک معتبر صحافی کی رپورٹ کے مطابق کئی لاکھ بنگالی' بھارتی مہاجر کیمپ میں مختلف وجوہات کی بنا پر مر گئے' پانچ لاکھ' دسمبر 1970ء کے سمندری طوفان میں مارے گئے۔ بین الاقوامی میڈیا میں یہ سب بھی پاکستان فوج کے کھاتے میں ڈالے گئے۔

بنگلہ دیش میں ایک مشہور صحافی مسٹر جوہری نے لکھا ہے کہ 'میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آٹھ ماہ کی معمولی نوعیت کی گوریلا کارروائیں میں 30 لاکھ لوگ کیسے مارے گئے۔ مزید بدقسمتی یہ ہے کہ قتل و غارت بنگلہ دیش بننے کے بعد زیادہ ہوئی۔ 16 دسمبر کو جب پاکستان آرمی نے ہتھیار ڈالے مکتی باہنی اور عوامی لیگ نے لوٹ مار اور قتل و غارت اس انداز میں شروع کی جیسے کوئی دشمن ملک فتح کر لیا ہو۔ اب انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ جس کو چاہا پھانسی دی' جسے چاہا جان سے مارا۔ جنگ آزادی کی کتب میں یہ تمام قتل و غارت گری بھی پاکستان فوج کے ذمہ لکھی گئی۔ بھلا ہو بین الاقوامی پریس کا جس نے یہ بھانڈا پھوڑا۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شیخ مجیب نے علیحدگی کی بنیاد پنجاب کے خلاف رکھی۔ جیسے پنجاب ہی سارا پاکستان تھا۔ اسی نفرت کی لپیٹ میں فوج بھی پنجابی کہلائی۔ تمام بنگالیوں کے لبوں پر شالا پانجابی ہی گالی ہوتی ان کی نظر میں بلوچ پٹھان' کشمیری یا سندھی سب پنجابی ہی تھے۔

تقدیر کا ایک اور سنگین مذاق دیکھیں کہ شیخ مجیب پاکستانی فوج کے خلاف لڑے لیکن 25-26 مارچ 1971ء کی رات جب پاکستانی فوج انہیں پکڑنے کے لیے ان کے گھر دھان منڈی پہنچی تو بیڈ روم میں چھپ گئے۔ کمانڈو نے باہر بلایا اور بغیر گولی چلائے انہیں بہت عزت و احترام سے کینٹ ایریا لے آئے۔ لیکن جب 15 اگست 1975ء کو ان کی اپنی فوج' جو بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے لڑی تھی دھان منڈی ان کے گھر پہنچی تو شیخ مجیب خود ان کے استقبال کے لیے باہر آئے اور ان کی اپنی فوج نے ان کے پورے خاندان کو مع رشتہ داروں کے بھون دیا۔ بنگلہ دیش کی موجودہ وزیراعظم حسینہ واجد سمیت صرف دو بیٹیاں بچیں جو اس وقت وہاں موجود نہ تھیں۔

بہت سے بنگالی جو بظاہر آزادی اور عزت کی جنگ لڑ رہے تھے بے تحاشہ مظالم کے مرتکب ہوئے اور بہت سے پاکستانی فوجی آفیسرز نے جو سیاسی بغاوت کے خلاف فوجی کارروائی کر رہے تھے غیر روایتی جنگ حدود کے اندر لڑ کر شرافت کا مظاہرہ کیا۔ اب تو ساری بین الاقوامی تحقیق سامنے آ چکی ہے۔ جو پاکستان آرمی اور اس کا ساتھ دینے والی پاکستان دوست تنظیموں کے اراکین کی بے گناہی کا واضح ثبوت ہے۔

لوگ اب دلال کے ذریعے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محمد پور محفوظ جگہ تھی اور وہاں سے ہندوستان کے لیے نکلنا آسان تھا۔ ہمارے بہت سے جاننے والے ہندوستان جا چکے تھے۔ بینک میں خاصی رقم موجود تھی لیکن بینک نے ہمیں رقم نکالنے کی اجازت نہیں دی۔ ہم نے ایک بلینک چیک ایک واقف کار بنگالی کو دے دیا کئی سال بعد انہوں نے وہ رقم ہمیں بھجوائی' یہ ان کی بڑی

مہربانی تھی۔
محمد پور میں ہماری ایک رشتہ دار رہتی تھیں۔ ہم لوگ کئی دن ان کے گھر ٹھہرے پھر ان صاحب کی مدد سے ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ہمارے پاس پہننے کے جو کپڑے تھے وہ بھی وہیں چھوڑنے پڑے‘ جسم پر جو کپڑے تھے اس کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اسی بے سروسامانی کے عالم میں ہم اپنے والدین کے پاس پہنچے‘ یہ کیا کم تھا کہ ہماری جانیں بچ گئی تھیں۔
ایک دن میرے والد نے میرے شوہر کو کسی سے ملانے کے کی بات کی اور کہا کہ وہ تیار ہو کر آئیں۔ تیار ہونے کو تھا ہی کیا‘ بس وہ فوراً بال سنوار کر باہر چلے آئے اور کہا کہ چلیے۔ میرے ابا نے انہیں کئی بار تیار ہونے کو کہا مگر وہ اندر جاتے اور اسی طرح واپس آجاتے‘ آخری بار بھی جب ابا نے ان کو اسی لباس میں دیکھا تو کہنے لگے۔
”ابھی تک آپ تیار نہیں ہوئے۔“ میرے شوہر شرمندہ ہوتے ہوئے پھر کمرے میں آگئے۔ اتفاق سے اسی وقت میں کمرے میں داخل ہوئی‘ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ آپ اپنے ابا کو بتائیں کہ میرے پاس دوسرا کوئی جوڑا ہے ہی نہیں۔ میں جب باہر آئی تو میں نے سنا ابا اماں سے کہہ رہے تھے بھئی خالد میاں بھی عجیب آدمی ہیں میں کب سے انہیں تیار ہونے کو کہہ رہا ہوں لیکن وہ تیار ہی نہیں ہوتے۔ میں یہ سن کر رونے لگی۔ جب انہیں اصلیت کا پتا چلا تو وہ بہت شرمسار ہوئے اور بار بار داماد سے معافی مانگتے رہے۔ اسی وقت انہیں بازار لے گئے اور ان کے لیے کئی جوڑے ریڈی میڈ کپڑے لیے۔ اس واقعہ کو میں اور میرے شوہر کبھی بھی نہیں بھول پاتے۔
جب ہم رانچی پہنچے تو پڑوس کے بہت سے لوگ ملنے آئے جن میں زیادہ تر ہندو بنگالی سہیلیاں تھیں۔ میری بیٹی اس وقت تقریباً چار سال کی تھی اس نے جب میری سہیلیوں کو بنگلہ میں بات کرتے سنا تو گھبرا گئی‘ کہنے لگی۔
”مما یہ بنگالی ہیں ہمیں مار ڈالیں گے کیا؟“
میں نے بیٹی کو گلے سے لگایا اور اسے سمجھایا کہ نہیں یہ تمہیں بہت پیار کریں گی۔
ہم لوگ ہندوستان میں صرف پندرہ دن رکے‘ پیسوں کا انتظام ہوتے ہی کھٹمنڈو روانہ ہو گئے۔ میرے بھائی اپنے کنبے کے ساتھ نیپال پہنچ چکے تھے۔ آگے کا سفر ہم نے ساتھ ساتھ کیا۔ آخر کار ہم کراچی پہنچے‘ وہاں ہمیں نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ میرے شوہر ڈھاکہ میں چونکہ E.P.I.D.C میں تھے اس لیے W.P.I.D نے انہیں بحال کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے چچا ان دنوں اسلام آباد میں جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے‘ انہی کی کوششوں سے انہیں جوائننگ ملی۔ یہ غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا۔ کراچی پہنچتے ہی چچا نے ہم لوگوں کو اسلام آباد بلا لیا۔ پہلی تنخواہ ملتے ہی ہم سب کراچی آگئے۔ اب بچوں کے اسکول میں داخلے کا مسئلہ درپیش تھا‘ بیٹے کا ایک سال ضائع ہو چکا تھا۔ ان دنوں فائنل امتحان دسمبر میں ہوا کرتا تھا۔ بچے نے ایک سال سے کتاب کی شکل نہیں دیکھی تھی اس لیے خدشہ تھا کہ اس کے داخلے میں کوئی مسئلہ نہ پیش آجائے۔ بہر حال اس کا داخلہ چھٹی جماعت میں اس شرط پر ہو گیا کہ اگر یہ پاس نہ ہوا تو اسے پچھلی کلاس میں بھیج دیا جائے گا۔
جمشید روڈ میں میری نند کا گھر تھا وہ لوگ ان دنوں اوکاڑہ میں رہتے تھے۔ گھر خالی تھا اور اسکول کے بالکل قریب ہی تھا اس لیے ہم لوگ

اسی گھر میں آ کر ٹھہرے۔ فائنل امتحان کو کچھ ہی دن تھے اس لیے ہم دونوں میاں بیوی نے جان توڑ محنت کی اور میرا بیٹا تیسری پوزیشن لے کر ساتویں جماعت میں داخل ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں بعد میں بھی ٹیچر کی حیثیت سے اسی اسکول کے عملے میں شامل ہوگئی، لیکن اللہ کو شاید ہمارا اور امتحان مقصود تھا یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میرے شوہر کی ایک آنکھ کی روشنی بالکل ختم ہوگئی اور دوسری آنکھ کی بینائی بھی بہت تیزی سے کم ہونے لگی۔ کراچی کا کوئی آنکھ کا ڈاکٹر ایسا نہیں بچا جس کے پاس وہ علاج کے لیے نہیں گئے ہوں، لیکن انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور اب یہ عالم ہوا کہ انہیں دفتر میں کام کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

انہی دنوں میں میرے وہ بھائی جو کیمبرج یونیورسٹی میں انگلش کے پروفیسر تھے انہوں نے انہیں لندن بلا لیا تاکہ وہاں بہتر علاج ہو سکے۔ کراچی کا کوئی ڈاکٹر تو ان کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکا اور نہ ہی کسی کے علاج سے کوئی فائدہ ہوا تھا۔ دفتر والے چھٹی دینے کو تیار نہیں تھے، بڑی مشکلوں سے چھٹی منظور ہوئی لیکن یہ بغیر تنخواہ رخصت تھی۔ اب مشکل یہ تھی کہ صرف میری تنخواہ سے تو گھر نہیں چل سکتا تھا۔ جمع پونجی بھی ہمارے پاس کچھ نہ تھی۔ بلکہ کچھ ماہ پہلے ہی ہندوستان میں لیے گیے قرضے چکائے تھے۔ اگرچہ وہ جگہ جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے اسکول سے بہت قریب تھی لیکن شوہر کے بغیر میں وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے طے پایا کہ میں اپنی اُن رشتہ دار جن کے پاس محمد پور کچھ دن رہی تھی، ان کے پاس چلی جاؤں۔ وہ مجھے اپنے گھر میں ایک کمرہ اور ایک اسٹور (جسے کچن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا) دینے کو راضی تھیں۔ وہ علاقہ پاکستان کوارٹر کہلاتا تھا۔ شوہر کے جانے سے پہلے میں وہاں شفٹ ہوگئی لیکن یہ جگہ جمشید روڈ سے بہت دور تھی۔ دو بسیں بدل کر اسکول پہنچنا پڑتا تھا۔ میری کلاس صبح میں تھی جبکہ بیٹے کی کلاس سیکنڈ شفٹ میں تھی۔ وہ تقریباً چھ بجے اسکول سے واپس آتا تھا۔ بیٹی کو میں اپنے ساتھ لے کر جاتی اور لاتی۔ ان دنوں حالات آج کی طرح نہیں تھے کوئی افراتفری نہیں تھی، اس لیے بیٹے کے دیر سے آنے پر میں پریشان نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اسکول کی پرنسپل کو اپنے حالات بتائے اور ان سے گزارش کی کہ شوہر کے آنے کے بعد میں دونوں بچوں کی پوری فیس ایک ساتھ ادا کر دوں گی لیکن وہ راضی نہیں ہوئیں، اس لیے اسکول کے بعد مجھے ٹیوشن بھی پڑھانی پڑی۔ گھر پر تو بچوں کے آنے کا سوال ہی نہیں تھا ایک تو جگہ کی کمی تھی دوسرے گھر والے اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے دو تین ٹیوشن میں بچوں کے گھر جا کر پڑھاتی۔

شوہر کو واپس آنے میں کئی ماہ لگ گئے، ہم دونوں کی خواہش تھی کہ بی ایڈ کر لیا جائے۔ شوہر اپنی آنکھ کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ اسکول چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، اس لیے شام کی شفٹ میں داخلہ لیا۔ بنگلہ دیش کا ایم ایڈ تو مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ شروع کے چند برسوں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ڈگری مل جائے۔ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ قدوائی صاحب سے بھی رابطہ کیا جو ان دنوں امریکہ میں تھے لیکن وہ بھی اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہ کر سکے سوائے اس کے امریکہ آ جاؤں اور ایک سمسٹر جو رہ گیا ہے اسے مکمل کروں تو مجھے ڈگری مل جائے گی۔ لیکن نہ تو ان دنوں میرے اتنے وسائل تھے اور نہ وہاں

پہنچنے کے لیے اتنی رقم...... بچی بھی بہت چھوٹی تھی' اسے کس کے پاس چھوڑتی' اور امریکہ میں اس وقت تک ہمارا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ کراچی میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جو بچی کی ذمہ داری اٹھا سکتا۔ کراچی یونیورسٹی میں براہ راست ایم ایڈ نہیں ہوتا تھا اس لیے پہلے میں نے بی ایڈ میں اور اس کے بعد ایم ایڈ میں داخلہ لیا۔

داخلہ تو میں نے بی ایڈ میں شام کی شفٹ میں لے لیا' لیکن اب سارا دن مصروفیت میں گزرتا۔ صبح اسکول جاتی' پھر ٹیوشن اور شام کو کلاس اٹینڈ کرتی۔ بچی کو اسکول سے واپسی پر گھر چھوڑتی پھر ٹیوشن کے لیے جاتی پھر کلاس کرنے جاتی۔ گھر واپسی میں آٹھ بج جاتے۔ بچوں کو بالکل وقت دے نہیں پاتی' بیٹا تو بڑا تھا اور سمجھدار تھا۔ اپنا ہوم ورک کرتا اور بہن کو بھی سنبھالتا' اس کا ہوم ورک کرواتا' جب تک میں گھر نہیں آ جاتی بچے بھوکے رہتے' دونوں بڑے صابر تھے' مجھ سے کبھی ضد نہیں کہ کہ انہیں کچھ چاہیے' جو بھی کھانے کو مل جاتا خاموشی سے کھا لیتے۔ مجھ سے ایسی کوئی فرمائش کبھی نہیں کی جو میں پوری نہیں کر سکتی۔ رات کو جب گھر پہنچتی تو بہت تھک چکی ہوتی تھی لیکن بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ پکاتی' گھر میں کافی لوگ تھے وہ اکیلے نہیں ہوتے تھے لیکن میری غیر موجودگی میں وہ کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے' دوسرے کمرے میں ٹی وی چل رہا ہوتا تھا لیکن وہ کبھی دیکھنے نہیں جاتے تھے۔

یہ پریشانی کئی ماہ رہی پھر میرے شوہر اپنی آنکھوں کے علاج کے حوالے سے ناکام واپس آ گئے تھے۔ اب وہ اپنی آنکھوں کی بینائی سے مایوس ہو چکے تھے۔ دفتر میں جوائننگ مل گئی تھی مگر وہ بڑے مایوس سے رہنے لگے تھے۔ دفتر کے کام میں انہیں دشواری پیش آتی تھی۔ دس ماہ کے قریب ہم لوگ پاکستان کوارٹر میں رہے پھر واپس اپنے سابقہ محلے' جمشید روڈ آ گئے۔ یہاں سے اسکول بہت قریب تھا بچے پیدل ہی اسکول جاتے تھے۔ میرے شوہر دو بجے دفتر سے آ جاتے تھے' اس لیے بچی کو سنبھالنے کی ذمے داری انہوں نے لے لی 1972ء میں میرا بی ایڈ ہو گیا۔

شوہر کی غیر موجودگی میں جو وقت گزرا وہ میرے لیے بہت مشکل وقت تھا۔ پیسوں کی سخت کمی تھی' تنخواہ بہت زیادہ نہ تھی۔ گھر میں جو آمدنی آ رہی تھی اس میں ضروریات پوری نہیں ہو پا رہی تھیں۔ روکھا سوکھا کھا کر گزارہ تو ہو جاتا تھا پھر بھی اکثر و بیشتر ہم بھوکے ہی سو جاتے تھے۔ لیکن اس کی خبر ان لوگوں کو بھی نہیں ہوتی جن کے ساتھ ہم رہ رہے تھے۔ اس دوران میں نے کسی سے قرض بھی نہیں لیا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہماری پریشانیوں کا کسی کو پتہ چلے۔ وقت تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے۔ سدا برا وقت بھی نہیں رہتا۔ اس یقین کے ساتھ میں نے جم کر حالات کا مقابلہ کیا۔

عید کے لیے بچوں کے پاس نئے کپڑے نہیں تھے۔ بیٹا تو سمجھدار تھا' وقت کی نزاکت کو سمجھ گیا' بیٹی بہت چھوٹی تھی شاید وہ سمجھ نہ پائی لیکن بیٹے نے پتہ نہیں اسے کیا سمجھایا کہ اس نے بھی نئے کپڑوں کے لیے بالکل ضد نہیں کی۔ 27 رمضان کو میرے شوہر کے چچازاد بھائی ہمارے گھر آئے اور زبردستی ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سب کے کپڑے بنوائے۔ عید تک ہم لوگ ان کے یہاں رہے' بچی نئے جوڑے دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی' اللہ ان کو اجر عظیم عطا کرے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی نوازش ہم کبھی نہیں

بھول سکتے' اللہ ان پر اور ان کے خاندان پر اپنا کرم فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔

اپنے شوہر کے بارے میں کیا بتاؤں اس قدر ہنسنے بولنے والے اور چہکنے والے اچانک خاموش ہوگئے بہت کم بولتے اور بہت کم کسی سے بات کرتے' میں ان کے درد کو سمجھتی تھی مگر کچھ نہیں کرسکتی تھی اسی لیے خاموش رہتی۔

بیٹے نے انٹر پاس کرلیا تھا اور اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہوگیا تھا۔ اس دوران مشکلات بھی کچھ کم ہوگئی تھیں۔ انہی دنوں میرا ایم ایڈ کا رزلٹ آگیا میں نے اسکول دوبارہ جوائن نہیں کیا بلکہ جمشید روڈ میں چھوٹے پیمانے پر اپنا ایک اسکول کھول لیا۔ علاقہ ایسا تھا کہ فیس بہت کم رکھنی پڑی۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی اور آج بھی ہے کہ میں ان غریب بچوں کو تعلیم دوں جو پیسے نہ ہونے کے باعث تعلیم حاصل نہیں کرپاتے۔ اس اسکول سے میری یہ خواہش پوری ہوتی نظر آئی۔ میں مطمئن تھی مگر شوہر ناراض ہوتے کہ یہ کس طرح کا اسکول ہے جہاں گھر سے پیسے لگائے جاتے ہیں۔ اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد میں کئی گھنٹے بچوں کو ٹیوشن دیتی اور اس سے جو پیسے آتے اس سے اسکول کی ضروریات پوری ہوتی۔ اسکول کا معیار شروع سے ہی اچھا رکھا تھا۔ اسکول صرف پرائمری تک تھا' بعد میں چھٹی اور ساتویں کلاسیں بھی شروع ہوگئیں۔ پڑھائی اچھی ہونے کی بنا پر والدین خوشی خوشی اپنے بچوں کو اسکول میں بھیجتے۔ ہر سال ہمارے بچے جب اسکول چھوڑ کر جاتے تو انہیں دوسرے اسکولوں میں آسانی سے داخلہ مل جاتا۔ ان کی بنیاد اتنی مضبوط ہوتی کہ آگے جا کر انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ والدین ہمیشہ مطمئن رہے اور کبھی کوئی شکایت نہیں آئی۔ ہمارے اسکول کے زیادہ تر بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہ اسکول 28 سال تک جاری رہا' درمیان میں کئی مالی مشکلات بھی آئیں لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔

1980ء میں ہم لوگ جمشید روڈ چھوڑ کر گلشن کے فلیٹ معمار گارڈن میں منتقل ہوگئے جہاں ہم لوگ تقریباً 13 سال رہے' بہت اچھا وقت گزرا۔

بیٹا اب ڈاکٹر بن چکا تھا۔ بیٹی فارمیسی کررہی تھی۔ شروع سے اس کا ارادہ میڈیکل میں جانے کا تھا' پڑھائی میں بھی بہت تیز تھی۔ نرسری سے میٹرک تک اس نے اپنی کلاس میں ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لی۔ انٹر میں بھی اس کے نمبر بہت اچھے آئے تھے۔ اگر اس سال کی سیٹیں 20 فیصد کم نہ ہوتیں تو اس کا داخلہ آسانی سے ہوجاتا۔ کراچی سے باہر اسے آسانی سے داخلہ مل رہا تھا لیکن اس کے ابو کراچی سے باہر اسے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملنے کا اسے بہت دکھ تھا۔

اسکول بھی ٹھیک چل رہا تھا اب میں نے دوسری برانچ بھی کھول لی تھی جو یونیورسٹی کے قریب تھی۔ دونوں اسکول میں خاصا فاصلہ تھا۔ شروع میں تو دونوں برانچ خود ہی دیکھتی بعد میں دوسری برانچ میں ایک علم دوست خاتون کو پرنسپل رکھ لیا تاکہ یکسوئی سے ایک طرف رہ کر میں کام کرسکوں۔ اب میں ہفتہ میں ایک دن دوسری برانچ جاتی۔ نئی برانچ کی پرنسپل بہت اچھی اور محنتی خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑی محنت اور کامیابی سے اسکول کو چلایا آج وہ بھی ہم میں نہیں ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے آمین۔

1987ء میں ہم لوگوں نے حج کا پروگرام

بنایا' جانا تو بہت دنوں سے چاہ رہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا نہیں آیا تھا اس لیے دیر ہوتی رہی۔ اس بار حج اگست میں تھا۔ ہم لوگوں کی بکنگ سعودیہ ایئر لائن سے تھی۔ فلائٹ غالباً چار بجے تھی لیکن ہم لوگ گھر سے دو بجے نکل گئے۔ احرام گھر سے باندھ کر نکلے۔ ایئرپورٹ پر ہر طرف احرام میں ملبوس لوگ نظر آ رہے تھے۔ کراچی سے جدہ کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ زندگی بھر کے گناہوں سے پاک ہونے کی ترغیب میرے لیے انتہائی پُرکشش تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھی رب کا شکر ادا کر رہی تھی' میری برابر والی سیٹ پر میرے شوہر احرام میں لپٹے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سعودی ایئر لائن نے تمام عازمین حج کو ایک ایک چھتری اور ایک قرآن پاک لا کر دیا۔ جہاز کو جدہ ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔ روانگی کے کچھ گھنٹے بعد کیپٹن نے اعلان کیا کہ اب ہم میقات سے گزر رہے ہیں' لبیک اللھم لبیک' کی آواز پورے جہاز میں گونجنے لگی سارا ماحول بہت مقدس لگ رہا تھا۔

جہاز جدہ پہنچا کیسا حسین منظر تھا روشنی نے شہر کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ میں ایک ہیجانی کیفیت سے دوچار تھی' لگتا تھا مارے تشکر کے زمین میں گڑ جاؤں۔

ہم جہاز سے اترے اور حج ٹرمینل جانے کے لیے بس میں بیٹھ گئے۔ ٹرمینل تک پہنچنے کے راستے پر جہاز قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ جیسے ہی عمارت میں داخل ہوئے نوجوان سعودیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ سب کو ایک بڑے ہال میں لے جایا گیا۔ ایک طرف عورتوں نے لائن لگائی جبکہ دوسری طرف مردوں کی قطار تھی۔ وہاں پر ہمارے ہیلتھ سرٹیفکیٹ کی جانچ ہونے والی تھی۔

ان دنوں گردن توڑ بخار کے لیے ٹیکے یا انجکشن لازمی نہیں تھے اس لیے ہم لوگوں نے بھی یہ ٹیکے نہیں لگوائے تھے۔ ہمارے گروپ کے لوگ آس پاس ہی تھے' چالیس لوگوں کا گروپ تھا اور ہمیں 45 دن وہاں رہنا تھا۔ ایک گھنٹے بعد تمام مسافروں کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جو اس کمرے کے برابر میں تھا۔ نوجوانوں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور رہنمائی بھی کی۔

خاصی دیر بعد امیگریشن آفیسر نے لوگوں کو کاؤنٹر پر بلانا شروع کیا۔ مرد عورت الگ الگ بیٹھے تھے اس لیے مجھے اپنے طور پر امیگریشن والوں سے نمٹنا پڑا۔ سامان کے حصول کے لیے ہم نے دوسرے حصے کا رخ کیا' ہم لوگوں نے صرف ایک بکس اور ایک ہینڈ بیگ ساتھ رکھا تھا جس میں چار چار جوڑے کپڑے رکھے تھے ایک ایک چادر اور دو دو جوڑی چپل اضافی ضرور رکھ لیے تھے' دو جائے نمازیں بھی رکھ لی تھیں۔ پاسپورٹ کے ساتھ ایک کتاب بھی رکھی ہوئی تھی جس میں اہم اور ضروری معلومات درج تھیں۔ مثلاً ناگہانی ضرورت کے لیے فون نمبر' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا نقشہ اور سعودی قوانین کی پابندیاں درج تھیں۔ پھر ہم کسٹم کاؤنٹر کی طرف روانہ ہوئے' کسٹم کے بعد دوسرے عازمین کے ساتھ امیگریشن سے نکل آئے۔

جب باہر نکلے تو رات کے بارہ بجے تھے۔ گروپ لیڈر دروازے پر کھڑے تھے اور سب کو ہدایت دے رہے تھے۔ قلیوں نے سامان انتظار گاہ تک پہنچا دیا۔ وہاں یہ خبر ملی کہ گاڑیاں مکہ جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم لوگ مکہ والی بس میں سوار ہو گئے۔ مکہ معظمہ کا سفر زیادہ تر خشک اور بنجر زمین پر تھا۔ چونکہ رات کا سفر تھا اس لیے گرمی

زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ ڈرائیور نے اعلان کیا کہ ہم آدھے گھنٹے میں مکہ معظمہ پہنچنے والے ہیں۔ جہاز ہی کی طرح لبیک اللھم لبیک کی صدائیں گونجنے لگیں۔ گروپ لیڈر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم اپنی رہائش گاہ تک جائیں گے‘ وہاں سامان رکھ کر کھانا کھانے کے بعد خانہ کعبہ جائیں گے۔ ہماری رہائش گاہ خاصی اونچائی پر تھی۔ اس مکان میں تین کمرے تھے جو خاصے بڑے بڑے تھے۔ مردوں کی تعداد زیادہ تھی عورتیں صرف دس تھیں۔ ہم سب نے ایک کمرہ لے لیا اپنا اپنا سامان اپنے بستر کے سامنے جمالیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا بس سامان کے نام پر فوم کے گدے تھے جس پر ایک تکیہ اور ایک چادر بچھی تھی‘ ہاں مگر باتھ روم صاف ستھرے تھے۔

کھانے کے بعد تقریباً تین بجے ہم لوگ خانہ کعبہ پہنچے۔ جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھ رہے تھے ہر شخص کا ہیجان اور اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ جیسے ہی خانہ کعبہ پر نظر پڑی ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی‘ آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے‘ دل بے قرار ہوگیا۔ جب میں مطاف پر پہنچی تو بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ کعبہ کے پاس پہنچ کر اس کو چھوؤں‘ اس کا لمس محسوس کروں‘ مگر اس کے گرد لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ میں دور ہی سے اسے دیکھتی رہی اور دعا مانگتی رہی۔ آبِ زم زم کا پہلا گھونٹ پیتے ہوئے دعائیں کرتے رہے۔ خانہ کعبہ کے مشرقی کونے سے طواف کے ساتوں چکر شروع ہوتے ہیں اگر ہم حجرِ اسود کو چھو نہ سکیں تو اس صورت میں اپنا ہاتھ حجرِ اسود کی طرف اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کر دوسرا طواف شروع کردیں۔ ہم نے بھی وہی کیا‘ بھیڑ اتنی تھی کہ میں سارے وقت اپنے شوہر کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہی‘ ورنہ لوگوں کا ریلا کہیں سے کہیں پہنچا دیتا۔ ہر چکر میں کچھ حصہ بہتر ہوتا لیکن حجرِ اسود کے پاس ناقابل برداشت بھیڑ ہوتی۔ جب ہمارے سات چکر پورے ہوگئے تو ہم نے مطاف کے باہر دو رکعت نماز ادا کی۔ طواف کے بعد وہاں پر نماز پڑھنی سنت ہے لیکن بھیڑ کی وجہ سے ہم نے نماز باہر ہی ادا کی۔

گروپ لیڈر نے بتادیا تھا کہ ہمیں عمرے میں کیا کرنا ہے۔ کعبہ کے گرد سات چکر مکمل کرکے دو رکعتیں نماز نفل ادا کرنی تھی اور پھر ہمیں صفا اور مروہ کے درمیان سات پھیرے لینے تھے‘ سو ہم نے کیے۔ اس کے بعد مرد حضرات حلق کروانے گئے‘ عورتوں کو اپنے بالوں کی ایک لٹ کٹوانی تھی سو وہ بھی ہم نے کی‘ پھر اس کے بعد ہم احرام کی پابندیوں سے آزاد ہوگئے۔

حرم شریف میں جو پہلی نماز میں نے ادا کی اسے تازندگی کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ رب کریم ہمارے بالکل سامنے ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔

فجر کی نماز پڑھ کر ہم لوگ اپنی رہائش گاہ پر واپس آئے‘ رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے سرنگ سے گزرنا پڑتا تھا‘ فاصلہ کافی تھا لیکن سرنگ کے اندر رہنے کی وجہ سے دھوپ سے بچاؤ ضرور ہوجاتا تھا۔ سرنگ کے اندر پنکھے لگے ہوئے تھے اس لیے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ رہائش گاہ پہاڑی پر تھی اس لیے ظہر کے وقت مسجد حرام میں جاکر اکثر عشاء کے بعد ہی ہم وہاں سے واپس ہوتے تھے۔ واپسی میں رات کا کھانا ساتھ لے کر آجاتے تھے‘ کوشش یہ ہوتی تھی کہ تہجد بھی مسجد حرام میں ہی ادا کریں۔ ہم لوگوں کو مکہ میں صرف چار دن ہی رکنا تھا۔ یہ چار دن عبادتوں اور کھانے اور تھوڑے وقفوں کے لیے نیند حاصل کرنے میں

کب گزر گئے' پتا ہی نہ چلا' ہم نے روانگی سے قبل ایک عمرہ اور کیا باقی وقت طواف کرنے اور عبادت میں گزر گیا۔

واپسی میں بس میں بیٹھتے ہی ہم سب کو شناختی کارڈ دیا گیا جو ایک ڈوری میں پرویا ہوا تھا جس پر مکتب نمبر' لیڈر کا نام اور رابطے کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ حج کے ختم ہونے تک اسے گلے میں پہنے رہنا تھا۔ یہاں ہر گھڑی عذاب کے خوف سے ہونٹوں پر لرزہ طاری تھا اور یہی دعا تھی اے اللہ میں تیری گناہ گار بندی ہوں تو مجھ پر رحم فرما۔ اے مالک بے نیاز میں تیری بارگاہ میں اپنے تمام گناہوں کا اقرار کرتی ہوں' تو نے جو کچھ اس ناچیز بندی کو عطا کیا میں ہرگز اس کے لائق نہ تھی۔ اے میرے پروردگار میں تری بارگاہ میں اپنے گناہوں کا بوجھ لیے حاضر ہوں تو میرے گناہوں کو بخش دے اور مجھے اپنے در سے خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ' تو رحیم و کریم ہے' میرے گناہوں سے درگزر کر' مجھے یقین ہے کہ میں کتنی ہی گناہ گار صحیح' لیکن میرے گناہوں سے تیری بخشش کہیں زیادہ ہیں۔ یہ حرم پاک رحمتوں کا خزانہ ہے' یہ وہ دربار ہے جہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' بس مانگنے کا سلیقہ ہونا چاہیے' اے اللہ مجھے یہ بھی اقرار ہے کہ مجھے مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا' مگر تو رحیم و کریم ہے تو بخشنے والا ہے تو مجھے بخش دے تاکہ میں تیری بخشش پا کر تیرے گھر سے سرشار ہو کر لوٹوں۔

مکہ میں قیام کے دوران ہم انتہائی کوشش کرتے تھے کہ ساری نمازیں مسجد حرام میں ہی ادا کریں۔ خانہ کعبہ میں ہر وقت لوگوں کا ہجوم ہی رہتا تھا۔

ان دنوں ایسا لگتا تھا کہ ساری دنیا مکہ میں جمع ہو گئی ہے۔ ہمارے گروپ میں مختلف صوبوں کے لوگ تھے۔ ایک صاحب اپنی ضعیف ماں کو لے کر آئی تھیں۔ ایک خاتون اور تھیں جو اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں' بڑی ہی خلیق اور محبت والی خاتون تھیں۔ ان کا بستر ہمارے بستر کے برابر تھا۔ عموماً ہم ساتھ ہی خانہ کعبہ جاتے اور ساتھ ہی لوٹتے۔ وہ ہمارے گروپ کی سب سے رحم دل اور نیک خاتون تھیں۔ چار دن گزرتے ہی ہمارے گروپ نے مدینہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ تہجد کے بعد ہم لوگ گھر واپس آئے۔ حرم کے اندر اس قدر صفائی تھی' بڑی بڑی مشینیں سنگ مرمر کو صاف کرتی رہتیں۔ مکہ میں ہمارا وقت بڑے بڑے علماء سے وعظ سننے میں بھی گزرا۔ پانچویں دن ہم لوگ مدینہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پر ہم لوگوں کو جو جگہ ملی وہ مسجد نبوی کے بالکل قریب تھی اور وہ علاقہ بالکل بازار میں تھا۔ بازار سے ہی گزر کر سڑک کی دوسری جانب مسجد نبوی کا احاطہ شروع ہوتا تھا۔ وہاں ہمیں آٹھ روز رہنا تھا اور چالیس نمازیں مکمل کرنی تھیں۔ دور سے ہماری نظر مینار پر پڑی۔ خانہ کعبہ میں عظمت اور طاقت ہے اس میں ایک عجیب انداز کا جاہ و جلال ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا' مگر مسجد نبوی کی بالکل الگ خصوصیت ہے۔ اس کا حسن پُرسکون ہے جو دیکھنے والوں کی روح کو تسکین بخشتا ہے۔

ڈرائیور نے بس ایک پُررونق بازار میں کھڑی کی' یہ کئی منزلہ عمارت تھی۔ چاروں طرف دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ دکانوں سے گزر کر ہی ہمیں رہائش گاہ تک پہنچنا تھا۔ عشاء کا وقت ہو چکا تھا' ہم لوگوں نے اپنا سامان اپنے اپنے بستروں کے سامنے رکھا اور نماز کے لیے مسجد نبوی چلے گئے۔

زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے بڑی بے بسی محسوس ہورہی تھی۔ ہم لوگوں نے ایک دو دن مقدس مقامات کی زیارت میں گزارے کیونکہ حج کے بعد مدینہ واپس نہیں آنا تھا۔

سب سے پہلے جبل اُحد دیکھا' یہ درحقیقت پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جو خاصی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مسجد ذوالقبلتین اُحد کے قریب ہی تھی' کچھ منٹوں میں ہی مسجد کے قریب پہنچ گئے۔ اندر جا کر دو رکعت نماز پڑھی۔ وہاں سے مسجد قبا گئے۔ وضو کر کے دو رکعت نفل مسجد قبا میں ادا کی۔ مسجد قبا مسلمانوں کی بنائی ہوئی پہلی مسجد ہے۔

اب ہم مدینہ منورہ کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسجد نبوی واپس آئے۔ یہ تقریباً مغرب سے کچھ قبل کا وقت تھا۔ عشاء کی نماز تک کا وقت ہم نے مسجد نبوی میں گزارا اور رہائش گاہ جاتے ہوئے قریبی ہوٹل سے کھانے کا سامان خرید کر واپس آ گئے۔

عبادتوں میں وقت ایسا گزرا کہ سات دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اب عرفات جانے میں صرف دو دن باقی تھے۔ ساتویں روز بھی ہم اسی طرح عشاء کی نماز کے بعد واپس آئے تو پتا چلا کہ گروپ کی ایک صاحبہ جن کے ساتھ اُن کی بہت ہی ضعیف ماں بھی تھیں' وہ بیمار ہوگئی ہیں۔ انہیں سخت الٹیاں لگ گئی تھیں اور سر میں شدید درد کے ساتھ پورے جسم میں بڑے بڑے آبلے بھی ہوگئے تھے۔ گروپ لیڈر کو حالات سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے اسپتال سے رابطہ کیا۔ رات خاصی گزر چکی تھی پھر بھی بہت کم وقتوں میں کئی ڈاکٹر ایمبولینس کے ساتھ آئے اور مریضہ کو اسپتال لے گئے' مختلف جانچ کے بعد پتا چلا کہ اُن پر گردن توڑ بخار کا حملہ ہوا ہے۔ اُن کی حالت بہت ہی تشویشناک تھی۔ وہ دن تو کسی طرح گزر گیا مسجد نبوی سے آنے کے بعد رات ہی کو اپنا سامان باندھ لیا تھا' کیونکہ صبح سویرے روانگی تھی۔

رات کو مسجد نبوی سے آتے ہوئے ہم لوگوں نے کھانا ہوٹل سے لیا تھا' کھانے کے بعد ہم لوگ جلد سو گئے کیونکہ صبح عرفات کے لیے روانہ ہونا تھا۔ رات کے تقریباً دو بجے اچانک میری آنکھ کھلی تو سر میں شدید درد تھا ساتھ میں الٹیاں بھی لگ گئی تھیں۔ دو تین مرتبہ تو میں باتھ روم تک جا سکی اس کے بعد میری حالت اس قدر نازک ہوگئی کہ میرے لیے بیٹھنا بھی دشوار ہوگیا۔ الٹیوں کے ساتھ سر کا درد اس قدر شدید تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ اب سر پھٹ جائے گا۔ خالہ میرے برابر والے بیڈ پر تھیں' وہ فوراً اٹھ گئیں میں بار بار اُن سے التجا کر رہی تھی کہ کچھ پڑھ کر مجھ پر دم کیجیے میرا سر پھٹ جائے گا۔ انہوں نے گھبرا کر میرے شوہر کو دوسرے کمرے سے بلایا' کمزوری سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں' اُلٹیاں کسی طرح بند نہیں ہورہی تھیں' ہم لوگوں کے پاس جو دوائیں تھیں اسے بھی کچھ افاقہ نہیں ہورہا تھا' ساری رات پلاسٹک کے بیگ میں منہ ڈالے بیٹھی رہی۔ اب صبح ہورہی تھی چمکدار دن نکل آیا۔ آٹھ بجے بس آ گئی' روانگی شروع ہونے ہی والی تھی میں بیماری کی حالت میں بھی یہی دعا کر رہی تھی کہ اللہ حج مکمل کرادے' اس مبارک دن کے لیے میں نے بہت انتظار کیا۔

روانگی سے قبل کئی ڈاکٹر پھر آئے اور دریافت کیا کہ کوئی اور تو بیمار نہیں میرے شوہر نے میرے بارے میں بتایا۔ میں اسپتال جانا نہیں چاہتی تھی' ڈاکٹروں نے کہا آپ کو اسپتال جانا ہی ہوگا' آپ کا ٹیسٹ ہوگا اگر یہ گردن توڑ بخار کا

حملہ نہیں ہے تو انشاء اللہ آپ دوا سے ٹھیک ہو جائیں گی اور عرفات بھی ضرور جائیں گی۔

مجھے اسپتال لے جایا گیا' اس وقت تک میں ہوش میں تھی لیکن جب ریڑھ کی ہڈی سے پانی نکالا گیا پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ کئی روز بعد جب میں ہوش میں آئی تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ بڑی عجیب عجیب آوازیں ہر طرف سے آرہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گائے یا بکری ذبح کی جارہی ہے۔ ہر بیڈ پر ایک ہی کیفیت تھی۔ نرسیں عربی کے سوا کوئی زبان نہیں سمجھتی تھیں' اب کچھ پوچھا جائے تو کس سے پوچھا جائے۔ ڈاکٹر جو میرا علاج کر رہا تھا وہ مصری تھا اور انگلش بول سکتا تھا۔ میں نے جب اس سے اپنے شوہر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ حج کر رہے ہیں یہ سن کر میں بہت رونے لگی۔ ڈاکٹر مجھے بہت تسلی دیتا رہا کہ حج کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے آپ اتنی دور سے حج کی نیت سے آئی ہیں بیمار ہونا آپ کے ہاتھ میں نہیں تھا یہ اللہ کی مرضی تھی' آپ کے علاوہ اور جتنے لوگ بیمار ہیں ان سب کا حج ہو چکا ہے اس سال اس بیماری سے کافی لوگ ہلاک بھی ہوئے اور جو بچ گئے ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے اپنے جسم کے کسی نہ کسی حصے کو کھویا ہے' بہت سارے لوگ دماغی طور پر معذور ہو گئے' کچھ لوگوں کے جسم کا نچلا دھڑ بے کار ہو گیا' کچھ لوگوں کے ہاتھ بیکار ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ مکمل طور پر صحت مند ہیں۔ مجھے اٹھارہ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ میرے شوہر نے میرے سارے حج ارکان پورے کیے' جب حج اختتام پذیر ہوا تو وہ مدینہ لوٹ آئے۔

اسپتال میں جب تک رہی اُبلے ہوئے کھانے کھاتی رہی' دوپہر کے کھانے کے ساتھ نمکین پنیر کے بڑے بڑے پیس اُبال کر نمک کے ساتھ کھانے کو دیے جاتے' دوپہر میں پھل دیا جاتا' رات کے کھانے میں کوئی میٹھی چیز بھی ضرور ہوتی۔ ڈرپ لگا لگا کر میرا پورا جسم نیلا ہو گیا تھا۔ جب ہاتھ میں جگہ نہ رہی تو انہوں نے پیر میں ڈرپ لگانا شروع کیا۔ ڈرپ کے اندر وہ ایک دوا ڈالتے تھے جس سے شدید تکلیف ہوتی تھی۔ سارا وارڈ اس دوا کی وجہ سے بے ہوشی میں بھی بڑی تکلیف دہ چیخیں نکالتا تھا۔

اٹھارہواں دن میرے لیے خوشی کا دن تھا۔ مجھے اسپتال سے ڈسچارج کیا جارہا تھا۔ میں نے مدینہ سے روانگی کے وقت احرام باندھ لیا تھا اور ارادہ تھا کہ عمرہ کے بعد رہائش گاہ جاؤں گی۔ عمرہ تو کسی طرح ادا کیا لیکن اب ٹانگوں میں جان نہیں تھی کیونکہ میں نے عمرہ کے لیے کوئی سہارا نہیں لیا تھا۔ سعی کرنے کے دوران میں کافی تھک گئی تھی' مجھ سے چلا نہیں جارہا تھا اس لیے کئی بار ستانے کے لیے بیٹھنا پڑا۔

ابھی ہم لوگوں کو مزید کئی دن مکہ معظمہ میں رہنا تھا۔ اس لیے کئی عمرے اور بھی کیے۔ شروع شروع میں ہر نماز میں خانہ کعبہ نہیں جاتی تھی بلکہ ساری نمازیں گھر پر ہی پڑھتی تھی' لیکن جب حالت بہتر ہوئی اور کمزوری بھی کم ہوئی تو صبح نماز پر جاتی تو رات کو عشاء کے بعد ہی واپس آتی۔ تہجد گھر پر ہی ادا کرتی تھی' وقت کا پتا ہی نہ چلا اور ہماری واپسی کا دن بھی آ گیا۔

جدہ واپسی ہماری توقع کے مطابق زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم لوگ جلد ہی حج ٹرمینل پہنچ گئے۔ ظہر کی نماز کے لیے ایک بار رُکے' ہماری بس ایک اسٹینڈ پر رُکی' مسافروں کا سامان چھت پر تھا' سامان اترنے کے بعد سارے مسافر بھی بس سے

اتر گئے۔

کاؤنٹر پر سامان پڑا تھا۔ پتا چلا کہ پرواز سے کچھ گھنٹے پہلے اسٹاف ممبر آئیں گے۔ ہماری فلائٹ 3 بجے سے پہلے تھی۔ ہمیں اپنے کاؤنٹر کے قریب ہی رہنا تھا تاکہ جیسے ہی کھلے ہم اپنا بورڈنگ کارڈ لے لیں۔ کمزوری کی وجہ سے مجھ سے زیادہ بیٹھا نہیں جارہا تھا' لیٹنے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرے شوہر نے بتایا کہ ایئرلائن کا اسٹاف آگیا ہے' میں نے محسوس کیا کہ کاؤنٹر میں جو لوگ بھی ذمہ دار تھے بڑے ڈھیلے ڈھالے تھے کام بڑی سستی سے نمٹا رہے تھے۔

ہم امیگریشن سے نکلے تو اپنے آپ کو اسی طرح کمرے میں پایا جس طرح پہلی بار پایا تھا۔ فوراً بورڈنگ شروع ہوگئی لیکن کچھ دیر بعد پتا چلا کہ فلائٹ کئی گھنٹے لیٹ ہے۔ خدا خدا کرکے 5 بجے ہم لوگوں کو جہاز پر بٹھایا گیا۔ کیونکہ جہاز لیٹ جارہا تھا اس لیے ایئرپورٹ پر سب لوگوں کو کھانے کے ڈبے تقسیم کیے گئے۔ جہاز نے پرواز شروع کی تو زیادہ تر لوگ سو رہے تھے۔ تقریباً رات کے 9 بجے ہم لوگ کراچی ایئرپورٹ پہنچے۔ جہاز لیٹ ہونے کی وجہ سے سفر کچھ زیادہ لمبا محسوس ہوا۔ مجھے آج بھی خلش ہے کہ میں حج کے ارکان خود مکمل نہ کرسکی دوبارہ جانے کا اتفاق اس لیے بھی نہیں ہوا کہ چند برس بعد میرے شوہر کا ہی انتقال ہوگیا۔ اب وسائل ہیں لیکن محرم کا مسئلہ ہے۔ بغیر محرم کے ویزا نہیں ملتا' آپ لوگ میرے لیے دعا کریں کہ میں دوبارہ کعبہ کی زیارت کرسکوں (آمین)

اسکول بھی ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور میں بڑی مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ انہی دنوں میرے شوہر کے ایک کلاس فیلو جو اسٹیل مل میں ڈائریکٹر تھے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم لوگ ان کے مکان میں منتقل ہوجائیں۔ میرے شوہر بھی اسی مل میں تھے اور دونوں اچھے دوست تھے' اس لیے ہم سب ان کے مکان میں منتقل ہونے کے لیے راضی ہوگئے۔ یہ مکان شرف آباد میں ٹیلی ویژن اسٹیشن کے بالکل قریب تھا۔ نیچے کی منزل میں وہ خود رہتے تھے اوپر کی منزل ہمیں ملی۔ ان کے تین بیٹے تھے اور تینوں امریکہ میں تھے۔ وہ خود بھی سال دو سال بعد بچوں کے پاس امریکہ جایا کرتے تھے۔ ہم لوگ اس مکان میں تقریباً آٹھ سال رہے۔

بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ بیٹی فارمیسی کے آخری سال میں تھی۔ بیٹا ان دنوں نیوکلیئر میڈیسن میں ایم ایس سی کرنے اسلام آباد چلا گیا تھا۔ پڑھائی دو سال مکمل کرنے کے بعد اسے اٹامک انرجی کمیشن' اسلام آباد میں ملازمت مل گئی لیکن اب وہ کراچی واپس آنا چاہتا تھا' بڑی کوششوں سے اس کا ٹرانسفر کراچی ہوگیا اور اس نے جناح اسپتال میں ملازمت شروع کردی لیکن اس کی خواہش آگے پڑھنے کی تھی' وہ برابر کوشش کرتا رہا اور آخر کار اسے جاپان میں ریڈیولوجی میں پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مل گیا۔

میرے پاکستان آنے کے بعد بھی میرے والدین یا میرے شوہر کے والدین یا بھائی بہن کبھی پاکستان نہیں آئے۔ میں ہی ان سے ملنے اکثر ہندوستان جایا کرتی اور کئی مواقع پر ویزا کی مدت ختم ہونے سے قبل وہاں مزید رہنے کی تشنگی رہ جاتی۔ گھر کا وہ خطہ جہاں بچپن میں آنکھیں کھولیں' جہاں جوانی آئی اور آراستہ ہوئی اور جہاں کی تعلیم و تربیت نے زندگی کو سلیقہ دیا اس کی مٹی کی کشش خود سے دور نہیں ہونے دیتی تھی۔

☆......☆......☆

میرا بیٹا تین سال بعد ایک بار پاکستان آیا وہاں اسے چار سال رہنا تھا لیکن شادی کے لیے وہ اب بھی راضی نہ تھا۔ میں اس کی شادی کے لیے بے چین تھی۔ لڑکیاں بھی میں نے اس کے لیے دیکھنی شروع کردیں مگر وہ کسی طرح شادی کرنے کو رضا مند نہیں تھا۔ میں نے کوشش چھوڑ دی۔

ایک دن جب میں اسکول سے واپس گھر لوٹی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو یہ میرے لاڈلے بیٹے کا ہی فون تھا۔ جو کچھ اس نے مجھے بتایا میں سن کر خوشی سے جھوم اٹھی۔ ایک انہوتی سی مسرت کا احساس میرے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ وہ کسی جاپانی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس سے شادی کی اجازت مانگ رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے بانہوں میں بھر کر خوب پیار کروں۔ لیکن جب میں نے یہ خبر اس کے ابو کو سنائی تو پہلے تو وہ خاموش رہے' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس خبر سے خوش نہیں تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ شادی کے لیے تیار نہیں تھا اور اب وہ راضی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے اور اس نے ہم لوگوں سے اجازت مانگی ہے شادی تو نہیں کرلی۔ زندگی اسے گزارنی ہے آپ کو چاہیے اسے بخوشی اجازت دیں اور اس سے کہیں کہ لڑکی کو لے کر یہاں آئے مسلمان کر کے اس سے شادی کرلے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن وہ خاصے ناراض تھے اور کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ میری بیٹی اس وقت اسلام آباد میں تھی۔ میں نے اسے یہ خبر سنائی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی اور بولی کہ ابو کو تو خوش ہونا چاہیے اگر وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ امی' محبت مذہب اور ملک دیکھ کر نہیں کی جاتی پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ میرا بھائی آپ لوگوں کا کتنا فرمانبردار بیٹا ہے' زندگی میں پہلی بار وہ اپنی مرضی سے کچھ کرنا چاہ رہا ہے تو آپ پر بھی اس کی خواہش کا احترام لازم ہے۔ اس اثناء اس کا کوئی فون نہیں آیا پھر ایک دن جانے کیا اس نے فون پر اپنے ابو سے کیا بات کی کہ وہ اچانک وہی محبت کرنے والے باپ بن گئے جو اولاد کی خوشی کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ انہوں نے بخوشی اجازت دی لڑکی کے والدین اور بہن پاکستان آئے' شادی میں شریک ہوئے اور خوشی خوشی لوٹ گئے اگرچہ دلہن ہماری زبان نہیں سمجھتی تھی مگر پھر بھی وہ ہم لوگوں سے بہت خوش تھی۔

☆......☆......☆

ایک سال بعد ہمارا بیٹا پاکستان واپس آ گیا۔ ابھی بیٹے کو آئے ہوئے دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ کراچی کے حالات خراب ہونے لگے۔ خاص طور پر ڈاکٹروں کے لیے حالات بالکل ہی ناسازگار تھے۔ میرے بیٹے کے کئی کلاس فیلوز جب قتل کر دیے گئے تو ہم لوگ اور بھی پریشان ہوگئے۔ آغا خان اسپتال ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ ہم لوگ کے ڈی اے آفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے تھے' لیکن جب تک بیٹا گھر نہیں لوٹ جاتا ہم ساس بہو بے چین رہتے۔

میرا بیٹا اپنے پیشے سے بہت خوش تھا اور خدمت کے جذبے سے پاکستان لوٹا تھا مگر یہاں کے حالات دیکھ کر بددل ہوگیا۔ ڈاکٹروں پر زمین تنگ ہونے لگی' غریب پرور کراچی' جس نے ہمیشہ سب کو پناہ دی' جہاں ہر نسل اور ہر عقیدہ کے

لوگ مل جل کر رہتے تھے وہاں جانے کیسی آگ لگی کہ سب کچھ جل گیا۔ پہلے شیعہ ڈاکٹروں کا قتل ہوا پھر ساتھ ہی سنی ڈاکٹر مارے جانے لگے۔ کراچی جو ملک کا سب سے بڑا شہر تھا' جہاں شامیں سہانی تھیں اور جو پورے پاکستان کا دل تھا اور پورے پاکستان سے مختلف بھی' آخر اسے کس کی نظر کھا گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب یہاں کے حالات ٹھیک ہونے والے نہیں۔ ہم لوگ بہت زیادہ خوف زدہ رہنے لگے تھے' ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا کوئی بری خبر نہ آ جائے۔ آخر ہم نے سوچا کہ اب بیٹے کو واپس چلے جانا چاہیے۔ وہ آیا تھا اپنے ملک کے غریبوں کی' ناداروں کی اور بیکسوں کی مدد کرنے لیکن یہاں اس نے دیکھا کہ انہی لوگوں کے بیٹے اور رشتہ دار بے گناہ انسانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اسے لگا کہ پرانا کراچی کہیں کھو گیا ہے ہم پاکستان میں نہیں کہیں اور آ گئے ہیں۔ کبھی اس نے سوچا کہ اس شہر میں بھی امن و امان قائم ہو جائے گا مگر حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ آخر کار میرا بیٹا واپس چلا گیا' سال دو سال میں وہ ہم لوگوں سے ملنے آ جاتا ہے۔ ان دنوں اس کا قیام آسٹریلیا میں ہے اور وہ ماشاءاللہ خوش باش زندگی گزار رہا ہے۔

پتا نہیں ہمارا ملک کس ڈگر پر چل نکلا ہے۔ حکومت کی ناک کے نیچے بم دھماکے ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی موج مستی میں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کتنے گھروں کے چراغ بجھ گئے' کتنے گھروں کے چولہے ٹھنڈے پڑ گئے' عوام بھی بے حس سے ہو گئے ہیں سب کچھ دیکھتے سنتے اور جانتے بوجھتے بھی گویا شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپائے بیٹھے ہیں۔ حکومت ایوانوں میں عوام کے ووٹ سے ہی پہنچتی ہے۔ عوام کی طاقت انہیں ایوانوں میں سے باہر نکال بھی سکتی ہے' عوام چپ چاپ مار کھا رہے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ ہمارے ملک میں معدنی دولت کی کمی نہیں پھر بھی پتا نہیں کیوں ہمارا ملک غریب کہلاتا ہے' مجھے لگتا ہے کہ آج بھی اگر ہم متحد ہوں' ہمت کریں اور اپنے اعمال درست کریں تو اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کا پھل اچھی حکومت کی صورت میں ضرور دے گا۔

مشرقی پاکستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو بنگالیوں کی محرومی سے متعلق اُن کو اس حد تک احساس کمتری میں مبتلا کر دیا گیا تھا کہ معاشرہ فساد سے بچ نہیں سکا۔ آج کراچی میں بھی بہترین دماغوں کو فتنہ قرار دے کر کوٹے کے ذریعہ اور پھر جعلی ڈگریوں کے باوجود نوکریوں میں نااہل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آخر نفرت کے یہ بیج ان کے درمیان کس نے بوئے؟ مغربی پاکستان میں لسانی بل پاس کر کے بچے کھچے پاکستان کو ٹکڑے کرنے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ملک کے اگر مزید حصے بخرے ہوئے تو پھر غلامی اس ملک کا مقدر بن جائے گی۔ اونچے طبقے کی عیاشیاں ایک دن ملک کا بال بال قرض میں باندھ دیں گی۔ کیا بنگلہ دیش کی داستان یہاں بھی دہرائی جائے گی؟ کراچی میں ہو بہو وہی حالات ہیں بلکہ اس سے بھی بدتر جو ہم نے بنگلہ دیش میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ شہر آسیب بن چکا ہے۔ انسانیت یہاں زندہ نہیں رہی۔ کسی بھی انسان میں زندگی کی امنگ ہی نظر نہیں آتی۔ اندھی گولی موت کا پیغام بن کر کب آ جائے کہا نہیں جا سکتا۔ انسانیت' انسانی ہمدردی' اخوت و احترام ہمارے معاشرے سے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم کی کمی' گندی غلیظ سیاست' حب الوطنی سے دوری'

مذہب سے روگردانی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ سچ کہیے تو یہ سب غلط سیاسی حکمت عملی کے کارنامے ہیں۔ رنگ و نسل، قوم، ذات، زبان اور فرقے کو لے کر دنیا کے کئی بڑے ممالک بڑی خوش اسلوبی سے بڑے زبردست انداز میں چل رہے ہیں مگر صد افسوس کہ ہم یہ بھی نہ کر سکے۔

رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے رواداری، ہمدردی اور مہمان نوازی، دوسروں کی خدمت کرنے کا جذبہ اور ایمان داری کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بے ایمانی، کرپشن اور وطن فروشی جیسے برے خصائل عام و خاص میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ دیانت داری سے فرائض انجام دینا گویا عیب ہو گیا ہے۔ جنہیں سیکھ کر ہم ترقی کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے، انہی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر کے ان ہی کے محتاج بن گئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کیوں اتنے بے حس ہو گئے ہیں۔ کیوں جیتے جاگتے انسان پتھر کے بت بن گئے ہیں۔ ان کے سارے احساسات کیوں مردہ ہو چکے ہیں۔ زندگی کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں مگر موت کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے، اس لیے کہ موت فطرت کا ایک رویہ ہے اور یہ حالات اور روایات کے ساتھ کبھی بدلتا نہیں۔

فضائی کمپنی کے حوالے سے ہمارے ملک کا بول بالا تھا۔ پی آئی اے کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم زعم میں مبتلا رہے کہ ہم سا کوئی نہیں۔ اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بداعمالیوں کی وجہ ہمارا ایسا ناگفتہ بہ حال ہو سکتا ہے۔ سنگاپور ملائیشیا اور یو اے ای جیسے ملکوں کی فضائی کمپنیاں ہم لوگوں نے ہی شروع کیں۔ اب وہی فضائی کمپنیاں دنیا کی مشہور، آرام دہ اور خوش حال کمپنیاں ثابت ہو رہی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے جہازوں میں آرام دہ سفر کرنے کے بعد دل میں ہوک سی اٹھتی ہے کہ ہمارے ایئر لائن کو کیا ہو گیا، سب ہم سے آگے نکل گئے اور ہم بہت ہی پیچھے رہ گئے۔ کراچی جیسا شہر جو سیاحوں سے بھرا رہتا تھا، مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے ٹورسٹ اور جہازوں کے سیلر جہاں کثرت سے نظر آتے تھے، آج کے حالات بالکل ہی مختلف ہیں۔ عورتیں تو ایک طرف مردوں کو بھی جہازراں کمپنیاں ہدایت جاری کرتی رہتی ہیں وہ جتنے دن بھی کراچی میں رہیں بندرگاہ سے باہر ہرگز نہ نکلیں۔ پڑوسی ملک میں اکثر جانا ہوتا ہے وہاں مقامی لوگوں اور سیاحوں کو رات دیر تک سڑکوں پر گھومتے دیکھ کر دل میں خواہش جاگتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے بھی ایسے ہی دن لوٹ آئیں۔ 60 کی دہائی میں اور 70 کی ابتدائی برسوں میں کراچی بھی اسی طرح امن و امان کا گہوارہ تھا لیکن اب تو کراچی کی ہی کی بات کیا، لاہور اور اسلام آباد میں بھی حالات بدتر ہو رہے ہیں۔

ایک سال پہلے میں اپنے بیٹے کے پاس آسٹریلیا گئی ہوئی تھی، ایک دن میری بہو مجھے ایسی جگہ لے گئی جہاں مقامی عورتوں تھیں مگر وہاں پنجابی اور کچھ اردو بولنے والے مسلم بھی تھے۔ ہندوستان کے گجراتی ہندو اور تامل بھی تھے۔ سب بہت پیار و محبت سے مل رہے تھے۔ یہاں کوئی آسمان نہیں ٹوٹتا، کسی کو اسلام خطرے میں محسوس نہیں ہوتا جیسا ہمارے یہاں محسوس ہوتا ہے یا محسوس کرایا جاتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں کسی ایسی جگہ گئی جہاں زیادہ تر مقامی عورتیں تھیں، جب انہیں پتا چلا کہ میں پاکستان آئی ہوں تو حیرت سے مجھے تکنے لگیں اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں، انہوں نے پوچھا اس پاکستان سے

آپ آئی ہیں جہاں دہشت گرد ہوتے ہیں؟ جہاں روز بم پھٹتے ہیں' جہاں عورتوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے' جہاں بچوں کو تاوان کے لیے اغواء کیا جاتا ہے' جہاں روزانہ ٹارگٹ کلنگ میں لوگوں کو مارا جاتا ہے۔ میں خاموش اُن کی بات سنتی رہی میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اُن کی معلومات پر مجھے حیرت ہوئی لیکن دراصل بیرونی دنیا کے بارے میں یا ہمارے ملک کے بارے میں اُن کی معلومات کا وسیلہ مقامی ٹی وی اسٹیشن کا خبرنامہ ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ملک کے لوگ کس قدر افلاس' بے روزگاری اور بیماریوں میں جکڑے ہوئے ہیں آخر اس کا حل کیا ہے؟ کب یہ چین وسکون کی زندگی گزار سکیں گے آخر کب؟ آخر کب؟ آخر کب؟

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ملک کے لوگ کس قدر ناانصافیوں کے ستائے ہوئے ہیں۔ جو ظالم ہیں وہ دوسروں کے پورے پورے خاندان اپنی ذاتی جیلوں میں قید کردیتے ہیں' زمین جائیداد کو بچانے کے لیے اپنی بیٹیوں کی شادی قرآن سے کردیتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو کاری قرار دے کر ہلاک کردیتے ہیں' عورتوں کے تقدس کو پامال کردیتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں اور ڈاکہ ڈالتے ہیں اور تاوان کے لیے بچوں اور مردوں کو اغواء کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ ان ظالموں نے ہمارے ملک کو پوری دنیا میں کس طرح رسوا کیا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے ہمارا ملک دہشت گردوں اور ڈاکوؤں کا ملک گردانا جاتا ہے' حالانکہ اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یورپ اور امریکہ تو ایک طرف عرب ملکوں میں بھی پاکستانیوں کو ملازمت دیتے ہوئے سو بہانے تراشے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو ہم اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو اعلیٰ مقام دیتے ہیں تو دوسری طرف عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک...... اس قسم کے فیصلے کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نیکی کا کام کررہے ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ ظلم کی ایک حد ہوتی ہے۔ آج انٹرنیٹ اور سٹیلائٹ کا دور ہے۔ آج چھوٹے چھوٹے قصبوں میں ہونے والی زیادتیوں اور قتل جیسی خبر کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ ان جاہلوں کے کرتوت پردیس میں رہنے والے بھائیوں اور بہنوں کے لیے بھی مشکلات کا باعث بنتے ہیں۔

بیٹے کے جاپان جانے سے پہلے 1994ء میں بیٹی کی شادی کردی اس کا شوہر پی ٹی وی اسلام آباد میں پروڈیوسر تھا۔ اب اتنے بڑے گھر میں ہم دو آدمی رہ گئے تھے کیونکہ زین صاحب بھی اب مستقل طور پر امریکہ جاچکے تھے۔

میرے چچا دوبار انڈونیشیا اور رومانیہ کے سفیر رہ چکے تھے۔ اب ریٹائرڈ ہوکر کراچی آگئے تھے۔ ہماری ایک سگی نند جو میرے شوہر کی سب سے بڑی بہن تھیں انہی کے چھوٹے بیٹے سے میں نے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی ان کے علاوہ ہم لوگوں کا کوئی سگا رشتہ دار کراچی میں نہ تھا۔

☆......☆......☆

گئے لمحے لوٹ کر نہیں آتے مگر اپنے پیچھے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ عملی زندگی گزارنے کے بعد یہی یادیں زندگی کا انمول سرمایہ بن کر رہ جاتی ہیں' یہ یادیں خوش گوار بھی ہوتی ہیں اور تلخ بھی......

میرے صاحب بچوں کے رخصت ہونے کے بعد خاصے غم زدہ رہنے لگے تھے۔ باتیں تو پہلے بھی کم کرتے تھے اب بالکل خاموش ہی ہوگئے تھے۔ آنکھوں سے نظر بھی کم آتا تھا۔ کسی تقریب میں شرکت بھی نہیں کرتے' مطالعہ کا بڑا

شوق تھا اب مطالعہ سے بھی محروم ہو گئے۔ خبریں سننے کے عادی تھے اب اس سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ بہت افسردہ رہنے لگے طبیعت میں انتہائی سادگی اور دھیما پن تھا۔ ان کی بڑی بہن کراچی میں رہتی تھیں کبھی کبھی اُن سے ملنے جایا کرتے تھے مگر اب اس سے بھی مجبور ہو گئے تھے۔ انہی مایوسیوں اور صدمے نے ان کی جان لے لی۔

اپنے رفیقِ حیات کے دنیا سے چلے جانے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی لق ودق صحرا میں تنہا رہ گئی ہوں۔ لاکھوں دل کی باتیں ہیں کس سے کہوں، کوئی ہمدم و ہم ساز نہیں، آج میرا ہمسفر جا چکا ہے لیکن میرا سفر ابھی باقی ہے۔

اب جو ملک کے حالات ہیں اُن سے خوفزدہ رہتی ہوں۔ اللہ سے اپنے بچوں کی سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔ اللہ اب انہیں کوئی غم نہ دکھائے۔ اماں کی ایک بات اکثر یاد آتی ہے، کہتیں تھیں کہ شوہر جب گزر جاتا ہے تو عورت کے لیے سب دروازے بند ہو جاتے ہیں، اور واقعی اپنے رفیقِ حیات کے گزر جانے کے بعد مجھے اس صداقت کا اندازہ ہوا۔ اگرچہ میرے بچے بہت ہی فرمانبردار ہیں، میرا بہت ہی خیال رکھتے ہیں پھر بھی نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں خوشیوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے یکدم چلچلاتی دھوپ میں آن کھڑی ہوئی ہوں اور کہیں مجھے سایہ نہیں ملتا۔ کیوں یادوں کے زخم رستے ہی رہتے ہیں، ہمیں جینے کیوں نہیں دیتے۔

میں اب بڑھاپے کی دہلیز پر ہوں، بڑھاپا کسی خاص شے کا نام نہیں، صرف انداز فکر بدلتا ہے۔ بعض لوگ تیس سال میں خود کو بوڑھا سمجھنے لگتے ہیں جبکہ کچھ لوگ ستر سال میں بھی خود کو بوڑھا نہیں سمجھتے۔ بعض بوڑھوں کا مشغلہ پرانی یادیں اور پرانی تصویریں ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ پرانی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ بڑھاپے میں سب سے بڑا مسئلہ صحت ہوتی ہے جو اسے ریت کی دیوار کی طرح گرتی نظر آتی ہے۔ بھاگنے دوڑنے والا جسم اب کسی قابل نہیں رہتا۔ جس بوڑھے کو اپنے ماضی سے شکایت نہ ہو، وہ جانتا ہے کہ اس نے وہی کیا ہے جو اسے کرنا چاہیے تھا، وہ بوڑھا پُرسکون زندگی گزارتا ہے اور ہر لمحہ وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے بچوں اور جوانوں کے لیے ایسی دعائیں کرتا ہے جو دعائیں اس کی جوانی میں کسی بوڑھے نے نہیں دی۔ بوڑھے کو جب پیار سے پکارنے والا کوئی قریب میں نہ ہو تو وہ اپنے دل کو بہلانے کے لیے پاس پڑوس کے بچوں سے پیار کرنا سیکھتا ہے اور ہر حال میں خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

موسم گزر جاتے ہیں مگر یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ میں نے زندگی کو مشاغل کی نذر کیا تاکہ سب کچھ بھول سکوں لیکن یادوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، میرے ساتھ میری یادیں ہر دم رواں ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کیا ہو چکا ہے، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ میرے اللہ یہ کیسی بے حسی ہے۔ اے میرے رب کریم اس طوفان کو روک دے جس سے ہم آج گزر رہے ہیں، اے اللہ مجھے تو بچا میری ان یادوں کے زخموں سے۔ یارب ہمیں آج کا شعور عطا فرما، ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی تمام تر روشنی ماضی میں ہے، ہمارے پاس صرف طاقتور یادیں رہ گئی ہیں، اے میرے اللہ، میرے مالک ہماری یادوں کے زخم جو کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے مجھے ان یادوں کے جزیرے سے نکال، میری مدد فرما، اپنی نئی شان دکھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

طویل کہانیاں

ایسی کہانیاں، جن کا حُسن ہی موضوع کے حوالے سے طوالت میں پوشیدہ ہے

بخت گزیدہ

باقی صدیقی کا ایقان

اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو
تیر پر اُڑ کے نشانے لگے

سلیم اختر

میری عمر ابھی دو سال تھی کہ میں ماں کی متا سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ابا جان

نے دوسری شادی کر لی۔ یہ ان کی اور حالات کی مجبوری تھی۔ میری سوتیلی ماں کا تعلق میری برادری سے نہیں تھا۔ وہ میرے نانا مرحوم کے ایک دوست کی بیٹی تھیں۔ پھر انہوں نے ہی میری پرورش کی' مجھے پروان چڑھایا اور یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ میں ان کا سگا بیٹا نہیں ہوں۔ میرے بعد میرے ایک بھائی جمیل اور بہن گلشن نے جنم لیا تو ہمارا گھر ایک مکمل گھر بن گیا۔ ابا جان ایک سرکاری ادارے میں ملازمت کرتے تھے۔ تنخواہ معقول تھی' ہماری گزر بسر بہت ہی آسانی سے ہو رہی تھی۔ ہم بہن بھائیوں میں بے حد پیار تھا' ہمیں کوئی دکھ اور پریشانی نہ تھی۔ ہم جس محلّہ میں رہتے تھے وہاں ہمارے اور بھی کچھ رشتہ دار رہائش پذیر تھے۔

اخلاق میرے ایک دور کے چچا کا بیٹا تھا۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ ہماری دوستی بچپن میں بہت گہری تھی۔ ہم ایک ہی اسکول اور ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ میرے اور اخلاق کے ابا جان میں بھی محبت اور دوستی کا رشتہ استوار تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے تھے۔

ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ میری بہن گلشن کا رشتہ اخلاق سے بچپن میں ہی زبانی کلامی طے ہو گیا تھا لیکن اس سلسلے میں کوئی رسم ادا نہیں کی گئی تھی اور یہ بات گھر کے چند بزرگوں کے ہی علم میں تھی۔ شاید یہ محبت اور دوستی کے رشتے کو مزید پکا کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ پھر اُن ہی دنوں اخلاق کے والد کو کویت جانے کا موقع مل گیا اور ان کے دن پھر گئے۔

اخلاق کے والد نے کچھ ہی عرصہ بعد اپنے دونوں بھائیوں کو بھی کویت بلا لیا اور جلد ہی اُس خاندان میں دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ دولت انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے کہ اسے اپنے غریب چاہنے والے نظر ہی نہیں آتے مگر وہ یہ بھول جاتا ہے کہ یہ دولت ہمیشہ کسی کی باندی بن کر نہیں رہتی' آج یہ کسی کے گھر کی باندی ہے تو کل کسی اور گھر کی باندی بھی بن سکتی ہے۔

اخلاق کے خاندان والوں کو دولت کیا ملی کہ ان کی زندگی کا چلن ہی بدل گیا' خاص طور پر اخلاق کی ماں کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ اخلاق کے والد دو تین بار پاکستان آئے تو اپنے ہمراہ ڈھیروں سامان لائے۔ انہوں نے تمام رشتہ داروں کو تحفے دیے اور میری بہن گلشن کے لیے بھی سوٹ کا کپڑا بھیجا گیا جسے ابا جان نے شکریہ کے ساتھ وصول کیا۔ اخلاق کی ماں کی گردن فخر اور غرور سے کچھ اور اونچی ہو گئی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی اسی وجہ سے محلّہ والوں کے گھر میں جاتی اور اپنی امارت کے قصے مزے لے لے کر سناتی کہ ہمارے گھر میں فلاں فلاں چیز ہے' اب ہمارا شمار دولت مند گھرانوں میں ہونے لگا ہے اور جن کے گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں' وہ ان کی برابری نہیں کر سکتے۔

وہ ہمارے گھر بھی آتی رہتی تھی اور ایسی ہی دل جلانے والی باتیں کر کے میری ماں کے سینے میں آگ لگا کر چلی جاتی۔ اس کا اثر رفتہ رفتہ یوں پڑا کہ شام ڈھلے ابا جان تھکے ہارے گھر واپس آتے تو میری امی اپنی غربت کا رونا روتے ہوئے اُن سے جھگڑا شروع کر دیتیں کہ گھر کا خرچ پورا نہیں ہو رہا۔ وہ اخلاق کی والدہ کی باتوں سے متاثر ہو کر کہتیں کہ......

''اُن کو دیکھو' کیسے مزے کی اور بے فکری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اخلاق کا والد تمہارا دوست ہی نہیں رشتہ دار بھی ہے اسے خط لکھو کہ وہ تمہارا ویزا بھیج کر تمہیں بھی کویت بلا لے۔ اس تنخواہ میں گھر کا خرچ نہیں چل سکتا۔'' ابا جان صبر اور تحمل سے امی کی باتیں سنتے اور انہیں یقین دلاتے کہ میں کل ہی الیاس کو خط لکھ دوں گا۔ وہ میرا دوست ہے یقیناً مجھے کویت بلا لے گا۔

ایسا کئی بار ہو چکا تھا اور ہر بار ابا جان امی کو اسی طرح تسلی دے دیا کرتے تھے' مگر انہوں نے کبھی بھی الیاس چچا کو خط نہ لکھا کیونکہ یہ ان کی غیرت کے خلاف تھا' مگر امی جان تو جیسے ان کو ایک پل کے لیے بھی اپنے وطن میں رہنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا ابا جان امی کی ہر بات سن

لیتے اور اس پر عمل کرنے کی یقین دہانی کرتے مگر عملی طور پر انہوں نے کچھ بھی نہ کیا کیونکہ وہ اپنے وطن سے دور جانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن تھے۔ میں اُن دنوں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔ اس لیے مجھے ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مجھے تو بس پڑھنے کا شوق تھا۔

ویسے تو اخلاق بھی پڑھنے کے معاملے میں مجھ سے کم نہ تھا مگر اب آہستہ آہستہ وہ کلاس سے غائب ہونے لگا تھا۔ کویت سے آنے والی دولت کا رنگ اس پر بھی چڑھنے لگا تھا۔ قیمتی کپڑے جوتے اور گولڈن کلر کی گھڑی باندھنا اس کا معمول بن گیا۔ اُن دنوں کم ہی لڑکوں کے پاس گھڑی ہوتی تھی۔ اخلاق نے اپنی امارات کا رعب خوب جمایا۔ اس نے جو بھی چیز پہن رکھی ہوتی خواہ وہ پاکستان کی بنی ہوئی کیوں نہ ہوتی وہ یہی کہتا تھا کہ یہ کویت سے آئی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی عادتیں بھی بدلتی گئیں' اس نے پڑھائی میں دلچسپی بالکل چھوڑ دی' اس کے دل و دماغ اور خواب و خیال میں کویت ہی رچ بس گیا۔ وہ ہر لمحہ کلاس اور کلاس سے باہر بھی اپنے کلاس فیلوز کو کویت کی دولت اور اپنے گھر میں رکھی ہوئی قیمتی اشیاء کے قصے سناتا رہتا۔

کلاس کے کئی لڑکے اسے شہزادہ سمجھنے لگے تھے کیونکہ وہ روزانہ جیب خرچ کے نام پر بہت پیسے اڑاتا تھا' جبکہ کئی لڑکے اُس کی امارات اور تکبر آمیز باتوں سے نفرت کرتے تھے اور میں بھی ان میں بھی شامل ہو گیا تھا۔ ہم نے تو اس کا نام ہی 'میڈان کویت' رکھا ہوا تھا۔

اسکول کے کچھ استاد بھی اس کی امارات سے مرعوب ہو گئے تھے کیونکہ وہ اُن کو اکثر کویت سے آئے ہوئے تحائف میں سے کچھ نہ کچھ لا کر دے دیتا تھا' جس وجہ سے اُسے ڈانٹ کم ہی پڑتی لیکن اس کے باوجود نتیجہ یہ نکلا کہ آٹھویں کلاس میں اخلاق فیل ہو گیا مگر اسے کوئی فکر اور پریشانی نہ ہوئی' کہنے لگا۔

''میں نے پاکستان میں تھوڑا ہی رہنا ہے' ایک دو سال بعد تو میں بھی کویت چلا جاؤں گا' ابا جان مجھے بلالیں گے پھر میں بھی وہاں ڈھیروں دولت کماؤں گا۔''

میں اخلاق کی تکبرانہ باتیں سنتا رہتا' اندر ہی اندر کڑھتا مگر خاموش رہتا کیونکہ وہ میری غربت کا بھی مذاق اڑانے لگا تھا' باتوں باتوں میں وہ مجھے ذلیل کر ڈالتا۔ کئی بار میں برداشت نہ کر سکا اور اس سے اُلجھ بھی پڑا مگر دوستوں نے بات بڑھنے نہ دی اور ہماری صلح کرا دی مگر مجھے اخلاق سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

اُن دنوں ہم دسویں کلاس میں پڑھ رہے تھے جب مجھے معلوم ہوا کہ اخلاق اور میری بہن گلشن ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ اس دن سے میں نے اخلاق کا احترام کرنا شروع کر دیا اور اس کی ہر بات برداشت کرنے لگا مگر میری شرافت کا اخلاق نے مزید اور ناجائز فائدہ اٹھایا۔

پھر میں نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا جب کہ اخلاق نے رشوت اور سفارش کے بل بوتے پر میٹرک کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی بجائے کویت جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اُن دنوں چچا الیاس پاکستان آئے تو وہ اخلاق کا ویزا لے کر آئے تھے۔ اخلاق بہت ہی خوش اور اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

چچا الیاس نے اس بار واپس کویت جانے سے قبل ایک تقریب منعقد کی اور اخلاق سے میری بہن گلشن کی منگنی کا باقاعدہ طور پر اعلان کیا۔ چچا الیاس اس رشتہ میں مخلص تھے' میرے امی ابا مطمئن اور خوش تھے۔ میری امی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہ بات جو ابا ابھی تک چچا الیاس کو نہ کہہ پائے تھے امی نے کہہ دی۔

چچا الیاس نے امی کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی میرے ابا کا ویزا بھیج دیں گے۔ امی' ابو' جمیل اور گلشن بہت ہی خوش تھے مگر مجھے یہ سب خوشیاں عارضی اور پھیکی پھیکی لگ رہی تھیں۔

اخلاق کا کویت جانے کا مرحلہ آیا تو ہم اسے

ایئرپورٹ پر چھوڑنے گئے۔ روانگی سے قبل ایئرپورٹ پر وہ مجھ سے کہنے لگا۔

''وسیم! تم بھی پڑھائی چھوڑ دو اور پاکستان سے باہر چلے جاؤ' فائدے میں رہو گے وطن میں رہو گے تو بھوکے ہی مرو گے۔''

اس وقت مجھے اخلاق کی بات بری لگی تھی لیکن میں نے اسے جواب دیا۔

''میں وطن چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا میں یہاں ہی علم حاصل کر کے محنت سے کام کروں گا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوگی' میں اپنے وطن کی خدمت کروں گا' یہ ہی مجھے رزق دے گا...... صرف محنت اور ہمت کی ضرورت ہے۔'' اخلاق نے میری بات کا جواب نہ دیا اور ایک طنزیہ سی مسکراہٹ لیے لاؤنج میں داخل ہوگیا۔

اخلاق کو کویت گئے ہوئے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ ہمارے کانوں میں اخلاق کی والدہ کی یہ بات پہنچی کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اسی خاندان سے کرے گی جوان ہی کی طرح امیر ہوگا' جو اپنی لڑکی کو لاکھوں کا جہیز دے گا۔ گلشن سے منگنی تو محض ایک رسم ہے جو کسی وقت بھی توڑی جا سکتی ہے۔ ہمیں یہ باتیں سن کر بہت ہی رنج ہوا۔ ابا جان نے تو اس بات کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا۔

انہوں نے اس سلسلے میں چچا الیاس کو کویت خط لکھا کہ تمہاری بیوی ایسی دل جلانے والی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ چچا الیاس نے فوراً اُس خط کا جواب دیا اور لکھا کہ اخلاق کی والدہ کی باتوں پر آپ کان ہی نہ دھرا کریں۔ اخلاق اور گلشن کی شادی ضرور ہوگی آپ بےفکر رہیں۔

چچا الیاس کے تسلی آمیز خط نے ہماری پریشانی ختم کردی مگر پھر بھی ابا جان کی صحت دن بدن بگڑنے لگی۔ نہ جانے اُن کو کون سا غم لگ گیا تھا کہ جسے انہوں نے مستقل روگ بنالیا اور ایک دن تو یوں گرے کہ پھر چارپائی سے نہ اٹھے۔ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ میں اُن کو فوراً اسپتال لے گیا۔ پہلے تو ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی مگر رات دس بجے انہیں پھر دورہ پڑا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ اپنے ہاتھوں میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ابا کو مرتے دیکھ کر میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے' میں ان کے بےجان جسم سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ گھر کا کوئی فرد وہاں موجود نہ تھا جو مجھے تسلی دلاسا دیتا۔ میں نے اکیلے ہی اتنا بڑا صدمہ سہنا تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹر نے مجھے ابا جان کے جسم سے علیحدہ کیا اور تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

''پروردگار کو یہی منظور تھا اس دنیا میں آنے والے ہر شخص نے ایک نہ ایک دن لوٹ کر جانا ہے۔'' میں نے کانپتے ہاتھوں سے ابو کا چہرہ تھام لیا۔ اُن کی پیشانی پر بوسے دیے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ابا اس جہاں سے کیا گئے ہماری خوشیاں ہی لٹ گئیں ہمارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ ابا کا وجود ہمارے گھر کے لیے ایک ستون کی مانند تھا وہ ہمارے لیے سائبان تھے مگر اب کچھ بھی نہ رہا۔ امی' جمیل اور گلشن کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ دو ماہ تک ہمارے گھر کی حالت دگرگوں رہی' نہ وقت پر کھانا پکتا تھا اور نہ ہی کوئی وقت پر کھانا کھاتا تھا۔ دکھ اور درد کے اس عالم میں عزیزوں اور رشتہ داروں نے وقتی ہمدردی کی۔ مگر پھر وہ بھی ہمیں بھول گئے۔

اخلاق کی والدہ چند دن تو ہمارے گھر آتی رہیں مگر بعد میں اس نے بھی منہ پھیر لیا۔ چچا الیاس نے افسوس کا خط لکھا مگر اخلاق نے زبان نہ کھولی۔ جس سے میرے اس شک کو اور بھی تقویت مل گئی کہ وہ گلشن سے شادی کے مسئلے میں سنجیدہ نہیں ہے' مگر میں اپنی طرف سے کوئی بات کر کے اسے موقع سے فائدہ نہیں اٹھانے دینا چاہتا تھا کیونکہ اخلاق کے برعکس گلشن اس رشتے کے حوالے سے نہایت ہی سنجیدہ تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اخلاق کو پسند کرتی تھی۔

ابا جان کی وفات کے بعد گھر کا نظام چلنا مشکل ہوگیا تھا کیونکہ وہ ہی صرف کمانے والے اور ہم سب کھانے والے تھے۔ میں نے پڑھائی کا سلسلہ ختم کر ڈالا اور سروس کی تلاش شروع کردی تاکہ میرے

بھائی کی تعلیم مکمل ہو اور بہن کی ڈولی بھی اٹھ جائے۔ مجھے پڑھائی ختم کرنے کا ذرا بھی دکھ نہ ہوا کیونکہ میں نے اپنی ماں اور بہن بھائی کی خاطر جینے کا عہد کر لیا تھا۔ میں نے اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ ڈالا' تمام ارمانوں کو بھی سلا دیا اور اپنے آپ کو ماں اور بہن بھائی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ وقتی طور میں ایک اسٹور میں سیلز مین کا کام کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کسی گورنمنٹ جاب کی تلاش بھی جاری رکھی۔

چچا الیاس کا بھی اس کے بعد کوئی خط نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ہم سے نہ پوچھا کہ ہم کس حال میں ہیں' زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟ میری غیرت بھی یہ گوارہ نہیں کرتی تھی کہ میں اُن کو خط لکھوں اور کسی قسم کی مدد طلب کروں' چچی جان سے کبھی کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہمارے گھر آ جاتی تھیں مگر اُن کی عادت نہ بدلی تھی غرور اور گھمنڈ اور بھی سوا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل جلانے والی باتیں کر کے چلی جاتی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک سال مزید بیت گیا مگر مجھے گورنمنٹ کے ادارے میں ملازمت نہ مل سکی اس لیے کہ میرے پاس نہ ہی سفارش تھی اور نہ ہی رشوت...... البتہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اسٹور کیپر لگ گیا۔ تنخواہ نہایت ہی قلیل تھی جس سے گھر کا نظام بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ ان دنوں کئی لوگ کویت' دوبئی اور سعودی عرب جا رہے تھے۔

میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں بھی دیارِ غیر کی خاک چھانوں مگر حالات مجھے اس موڑ پر لے آئے تھے کہ میں نے بھی غیر ملک جانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ گھر کے دگرگوں حالات کو سنبھالا دینے کے لیے ایک یہی حل میری نظر میں تھا۔ مگر میرے پاس رقم نہ تھی جو میں دیارِ غیر جانے پر خرچ کر دیتا۔ جہاز کا کرایہ' ایجنٹ کی فیس اور دیگر اخراجات میری اوقات سے بڑھ کر تھے۔ میں خواب تو دیکھنے لگا مگر ان کی تعبیر ملنی مشکل نظر آنے لگی۔ ان مشکل حالات میں میری

ماں نے میری ڈھارس بندھائی کہ اگر انسان محنت کرے اور کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کر لے تو منزل خود بخود چل کر قدموں میں آ جاتی ہے۔ انہیں بخوبی یہ احساس تھا کہ میں اس گھر کے کسی بھی فرد کو ابا کی کمی محسوس نہیں ہونے دینا چاہتا ہوں۔ اتنی عمر میں بھی میں نے اپنی تمام خواہشات اور ارمانوں کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ میرے من میں کوئی ارمان نہ تھا' میں تو اپنے ابا جان کے خوابوں کی تکمیل کرنا چاہتا تھا اور وہ تھے بہن گلشن کی رخصتی اور جمیل کا شاندار مستقبل......

میرے دفتر کے ایک ساتھی نصیر نے ایک ٹیکسی قسطوں پر لے رکھی تھی اور چھٹی کے بعد وہ رات گئے تک ٹیکسی چلاتا تھا۔ اس کے گھریلو حالات بھی میرے جیسے ہی تھے اس لیے وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے مجھے بھی ٹیکسی چلانے کا مشورہ دیا۔ مجھے اس کا مشورہ بھلا لگا۔ میں نے گھر آ کر امی جان سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی اجازت دے دی۔ اس لیے میں نے پہلے تو ڈرائیونگ سیکھی اور لائسنس حاصل کیا پھر نصیر نے سیٹھ یوسف سے ملایا جو چند ٹیکسیوں کا مالک تھا۔ سیٹھ یوسف نے مجھ سے کچھ سوالات کر کے معلومات حاصل کیں اور پھر ٹیکسی میرے حوالے کر دی۔

اب میں صبح دفتر روانہ ہوتا' وہاں سے بعد دوپہر واپسی ہوتی تو شام سے لے کر رات بارہ بجے تک میں ٹیکسی چلاتا' میں محنت اور دیانتداری سے کام کرتا رہا اور یوں کچھ گھریلو حالات اچھے ہو گئے مگر اس کے ساتھ ساتھ میری صحت خراب رہنے لگی' نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میرے سر میں ہر وقت ہلکا ہلکا درد رہنے لگا۔ مگر میں نے اپنی کسی بھی تکلیف کی پرواہ نہ کی اور اپنے آپ کو مشین بنا لیا۔ یوں ہی چار سال مزید بیت گئے۔ میں نے ایک ٹیکسی قسطوں پر خرید بھی لی مگر میرے مالی حالات پھر بھی نہ بدلے۔ اس دوران میں میری ماں نے ایک دو بار میری شادی کا تذکرہ چھیڑا مگر میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ان حالات میں' میں کبھی بھی شادی نہ کروں گا۔ ان چار

برسوں میں گلشن کی رخصتی کر دینا چاہتا تھا۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ شادی کے معاملہ میں پہلے اخلاق کی طرف سے ہو مگر اُن کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔

میں نے اپنی امی سے کہا تھا کہ وہ خود اخلاق کی ماں سے بات کریں۔ پہلے تو امی نے میری بات سے اتفاق نہ کیا مگر بعد میں مان گئیں۔ وہ اخلاق کے گھر گئیں اور باتوں باتوں میں چچی سے کہا۔

"گلشن اب جوان ہو گئی ہے اور جوان لڑکی کا گھر میں بٹھائے رکھنا اچھی بات نہیں' اس لیے تم اخلاق کو لکھو کہ وہ اور اس کے والد زیادہ دنوں کی چھٹی لے کر پاکستان آئیں اور اپنی امانت اپنے گھر لے جائیں۔"

چچی نے امی کی بات کا برا منایا اور کہنے لگیں۔

"جب ہم کو جلدی نہیں ہے تو تمہیں کیا جلدی ہے' تمہاری لڑکی بھاگی تو نہیں جا رہی؟ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے اسی وجہ سے تم جلد رخصتی پر زور دے رہی ہو...... ٹھیک ہے میں اخلاق کو لکھ دوں گی پھر جو فیصلہ باپ بیٹا کریں گے۔ اس سے تمہیں آگاہ کر دوں گی۔ جہیز تو تم نے بنا ہی لیا ہوگا۔ پھر بھی ہمیں جو کچھ درکار ہوا تمہیں بتا دیں گے۔"

امی نے وہاں سے واپس آ کر یہ باتیں بتائیں تو میں نے امی کی طرف سے خط چچا الیاس کو لکھا کہ آپ جلد از جلد اپنی امانت لے جائیں تاکہ ہم سرخرو اور پرسکون ہو جائیں۔ میری ٹیکسی کی چند ہی قسطیں باقی رہ گئی تھیں اس لیے میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اخلاق کی طرف سے زیادہ جہیز کی مانگ پڑی تو اپنی ٹیکسی فروخت کر دوں گا مگر بہن کو خالی ہاتھ نہیں جانے دوں گا۔

چند دنوں بعد اخلاق کا خط میرے نام آیا۔ میں چونکہ دفتر میں تھا اور خط گھر کے پتہ پر آیا تھا اس لیے گلشن نے ہی وہ خط کھول کر پہلے پڑھا تھا۔ مجھے تو اس خط کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا' میں تو اپنے دفتر میں کام میں مشغول تھا کہ محلہ کے کسی شخص نے مجھے فون کر کے بتایا کہ گلشن کی حالت بہت نازک ہے اور وہ اس وقت سول اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میں نے اس سے آگے نہ سنا اور دیوانہ وار اسپتال کی طرف دوڑ پڑا۔ امی اور جمیل تو مجھے وارڈ کے باہر ہی مل گئے۔ وہ بھی گھبراہٹ کا شکار تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے' دونوں کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔

"امی جان' گلشن کیسی ہے...... اسے کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا مگر امی اور جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل نے خاموشی سے ایک خط اپنی جیب سے نکالا اور میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! اسے پڑھ لیں' آپ کو سب پتہ چل جائے گا۔"

وہ اخلاق کا ہی خط تھا جو میرے نام آیا تھا۔ لفافہ کھلا ہوا تھا اس لیے جلد ہی میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ میں نے خط کو نظر انداز کرتے ہوئے جمیل سے پوچھا۔

"گلشن کی حالت اب کیسی ہے؟"

"پہلے سے بہتر ہے...... مگر ابھی بے ہوشی طاری ہے...... اگر میں اتفاق سے بروقت گھر نہ پہنچتا تو گلشن کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا ہوتا۔"

جمیل نے مجھے بتایا اور پھر میں وارڈ کی جانب بڑھ گیا۔ میں گلشن کے قریب پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر خود میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ ڈیوٹی پر موجود نرس نے مجھے تسلی دی کہ اب مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہے اس لیے آپ مطمئن ہو کر باہر بیٹھیں جیسے ہی مریضہ کو ہوش آیا ہم آپ کو بلا لیں گے' میں وارڈ سے باہر نکلا اور اسپتال سے ملحقہ پارک میں آ بیٹھا۔ امی اور جمیل کو میں وارڈ کے باہر ہی رہنے کی تاکید کر آیا کہ ڈاکٹر کسی وقت بھی بلا سکتا ہے۔ اخلاق کا خط میرے ہاتھوں میں تھا' پہلے خیال آیا کہ اسے پڑھے بغیر ہی پھاڑ دوں مگر میں نے ایسا نہ کیا اور کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کھولا اور پڑھنا شروع کیا' لکھا تھا۔

وسیم! اسلام علیکم

تمہارا خط جو تم نے اپنی امی کی طرف سے ابا جان کو لکھا تھا مل چکا ہے۔ ابا جان کی بجائے تمہارے خط کا

جواب میں دے رہا ہوں اس لیے کہ اس کا تعلق میری ذات سے ہے...... وسیم! یہ خط اصل میں تمہارے جذبات کی عکاسی کرتا ہے اس لیے میں جواب بھی تمہیں ہی دے رہا ہوں۔ تم نے اپنی بہن گلشن کی جلد رخصتی کا لکھا ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ تو تم بھی بخوبی جانتے ہی ہو کہ رشتہ میری مرضی اور پسند کا نہیں ہے' میں شروع ہی سے اس کے خلاف تھا مگر ابا جان کے سامنے چپ رہا اور اب ابا جان اور امی بھی منگنی کر کے پچھتا رہے ہیں' وہ اس لیے کہ تمہاری بہن گلشن کے لچھن کچھ اچھے نہیں ہیں۔

اس کے محلے کے کچھ لڑکوں سے تعلقات ہیں اور اس سچائی کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔ امی کے خطوط اور میرے ایک راز دان کے خطوط سے مجھے گلشن کی ایک ایک بات معلوم ہوتی رہی ہے مگر میں خاموش تھا کہ وقت آنے پر حقیقت بتاؤں گا۔ بھلا ایسی لڑکی میری بیوی کیسے بن سکتی ہے؟ گلشن کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے محبت نامے اور اس کی تصویریں میرے پاس موجود ہیں' ثبوت کے طور پر ایک خط کی کاپی میں بھیج رہا ہوں' تمہیں بھی ممکن ہے اپنی بہن کے کرتوتوں کا علم ہو مگر تم بے غیرت بن کر خاموش رہے۔

لیکن میں نے کیا جرم کیا ہے کہ گلشن سے شادی کر کے تمام عمر سزا بھگتا رہوں۔ آج سے منگنی ختم سمجھو اور جہاں مرضی آئے گلشن کی شادی کر ڈالو' آج سے ہمارے اور تمہارے راستے جدا ہیں' نہ تم ہمارے رشتہ دار ہو نہ ہی ہم تمہارے......

اخلاق نے نہ جانے اور کیا کچھ لکھا تھا مگر اس سے آگے مجھ میں کچھ پڑھنے کی ہمت نہ رہی اخلاق نے جو کچھ لکھا تھا وہ جھوٹ' الزام تراشی اور گلشن سے شادی نہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ وہ ویسے بھی تو انکار کر سکتا تھا۔ مگر اس نے میری معصوم بہن پر جو الزام تراشی کی تھی وہ میری برداشت سے باہر تھی...... کاش! وہ اُس وقت میرے سامنے ہوتا' تو میں اس کی زندگی ختم کر ڈالتا مگر میں اس وقت بہت ہی بے بس تھا...... میں نے اخلاق کا خط ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ دکھ درد کی کیفیت سے آنکھوں کا موم پگھل پگھل کر پانی کی صورت میں ابلنے لگا۔ اخلاق کی اس حرکت نے میرے من میں اس کے خلاف نفرت کی چنگاری کو سلگا دیا۔ بہن گلشن کی خودکشی کرنے کی وجہ میں جان گیا۔ میں جانتا تھا کہ گلشن نیکی کا مجسمہ ہے جس کی پاکیزگی کی قسم کھائی جا سکتی ہے' اتنا بڑا الزام وہ برداشت نہ کر سکی اور زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا۔

گلشن کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو یہی کچھ کرتی' بھلا کوئی لڑکی اپنی محبت کو یوں برباد ہوتا دیکھ سکتی ہے؟ وہ جو محبت اور چاہت کی آنچ برسوں دھیمے دھیمے سہتی ہیں' زمانے کی نگاہوں سے چھپا کر محبوب کو اپنی نگاہوں کا نور بنا لیتی ہیں' چپکے چپکے نازک لبوں پر جان سے عزیز ہستی کے نام کی تسبیح کرتی رہتی ہیں اور ساری عمر کے لیے یہ عہد کرتی ہیں کہ وہ اپنے دیوتا کے حضور اپنی پوجا اور اپنی آشاؤں کا نذرانہ چڑھاتی رہیں گی' مگر جب اُن کی محبتوں اور وفاؤں کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے اور کوئی اُن کے ارمانوں کا گلا گھونٹ ڈالتا ہے تو وہ محبوب اور مجازی خدا کی بے رخی کے اس سمندر میں گر کر مر جاتی ہیں' ایسا روگ پال لیتی ہیں۔ جس کی کوئی دوا نہیں ہوتی' اپنی آرزوؤں کا لاشہ دفن کر ڈالتی ہیں۔

گلشن نے جو کچھ کیا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا وہ تو اخلاق کو دیوتا جان کر اس کی پوجا کر رہی تھی۔ مگر اخلاق نے اس کے خوابوں کے محل کو مسمار کر ڈالا۔ میں نے قسم کھائی کہ اخلاق سے اس ذلت اور رسوائی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ اخلاق کی بھی ایک جوان بہن تھی' میں چاہتا تو اس کو بدنام کر کے اپنا انتقام لے سکتا تھا مگر میں ایسا گھٹیا کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ اخلاق نے نہ جانے مجھ سے کس زیادتی کا بدلہ لیا تھا حالانکہ میں نے ہمیشہ اُس کی عزت کی تھی۔ اس نے شاید ہمیں غریب جان کر دولت کے گھمنڈ میں آ کر رسوا کر ڈالا تھا۔ میں ابھی اس بے کسی اور رسوائی کا ماتم کر رہا تھا کہ جمیل نے آ کر بتایا کہ گلشن کو ہوش آ گیا ہے۔ میں فوراً وارڈ میں جا پہنچا۔ گلشن کو دیکھ کر میرے آنسو پھر بہہ نکلے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کو دلاسہ دیا اس کی

پیشانی پر بوسے دیئے تو وہ بھی رونے لگی۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا اور آنکھوں میں ستاروں کی شمعیں جھلملانے لگیں' اس کے لب خزاں رسیدہ پتوں کی طرح کانپنے لگے...... میں نے اسے ڈھیروں پیار کیا تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

گلشن تین روز اسپتال میں رہی۔ گھر آنے پر ایک دن میں نے گلشن سے کہا۔

''جو کچھ ہوا' اسے بھول جاؤ' ہم غریب لوگ ہیں' ہم نے بڑا اور اونچا خواب دیکھا تھا جس کے ہم حقدار نہ تھے۔ خواب زندگی سے بڑے نہیں ہونے چاہئیں کہ یہ خواب کبھی کبھی عذاب بن جاتے ہیں' یہ دیتے کچھ نہیں مگر بہت کچھ چھین لیتے ہیں۔ یہ تو جونک کی مانند ہوتے ہیں' ایک بار آنکھوں میں بس جائیں تو زندگی کی خوشیوں کا رس کشید کر لیتے ہیں۔ اس لیے آئندہ خواب دیکھنے چھوڑ دو۔ جو کچھ مقدر میں ہوا ضرور ملے گا۔ ماضی کو بھول جاؤ زندگی خدا کی امانت ہے اسے ضائع مت کرو بلکہ اس کی حفاظت کرو......''

آہستہ آہستہ گلشن کی صحت بہتر ہونے لگی اور وہ زندگی کی رعنائیوں کی طرف لوٹنے لگی۔ میں جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا تھا مگر اخلاق اور اُس کی والدہ نے ہمیں برادری میں بدنام کر ڈالا تھا اس لیے برادری کا کوئی بھی شخص گلشن کو بیاہ کر لے جانے کو تیار نہ تھا' مجبوراً میں نے برادری سے باہر رشتے دینے کا فیصلہ کر لیا۔

نصیر میرا دیکھا بھالا تھا۔ اس میں کوئی برائی نہ تھی۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا وہی واحد کفیل تھا۔ وہ بھی ماں اور بہن بھائیوں کی طرح ہی دن رات ایک کر رہا تھا۔ ہم میں دوستی اور محبت کا رشتہ بھی استوار ہو چکا تھا اس لیے ہم ایک دوسرے کے گھریلو حالات سے آگاہ تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی شروع ہو گیا تھا' ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے تھے۔ نصیر میری پریشانی سے بخوبی آگاہ تھا' وہ جانتا تھا کہ میں گلشن کی وجہ سے پریشان رہتا ہوں۔ اسے اخلاق سے منگنی ہونے اور بعد میں ٹوٹنے کا بھی معلوم تھا۔ ایک دن وہ مجھے اسی معاملہ میں حوصلہ دے رہا تھا تو میں نے بے اختیار ہو کر اس سے درخواست کر دی کہ وہ گلشن سے شادی کر کے میرے غم بانٹ لے۔ نصیر نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی امی سے بات کرے گا۔ نصیر کی ماں مان گئیں تو کچھ ہی عرصہ بعد ایک سادہ سی تقریب میں گلشن کی شادی نصیر سے ہو گئی' اُس نے جہیز میں کچھ بھی نہ مانگا تھا مگر پھر بھی میں نے حسب توفیق گلشن کو بہت کچھ دیا۔ نصیر کی ماں اور بہن بھائیوں نے بھی گلشن کو بہت محبت دی۔

ان ہی دنوں چچا الیاس اور اخلاق پاکستان آ گئے تھے۔ اب تو ان کے ٹھاٹھ باٹھ اور بھی نرالے ہو گئے تھے انہوں نے ایک شاندار کوٹھی بنائی اور گھر میں دو گاڑیاں بھی آ گئیں۔ چچا الیاس کی صحت اب کچھ خراب رہنے لگی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر وطن آ گئے۔ چچا الیاس جب پاکستان میں تھے تو اس وقت وہ کسی اسپتال میں کام کرتے تھے۔ کویت میں بھی وہ اس شعبہ سے منسلک رہے۔

اب یہاں آ کر انہوں نے ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم بنا لیا جس میں جدید علاج کی تمام سہولتوں کے علاوہ ہر بیماری کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ تمام ڈاکٹر صبح کے وقت تو سرکاری اسپتالوں میں کام کرتے اور شام کو چچا الیاس کے نرسنگ ہوم میں آ جاتے تھے۔ وہ ہمارے شہر میں پہلا نرسنگ ہوم تھا' اب تو کئی نرسنگ ہوم کھل گئے ہیں۔

ایک دن اخلاق سے میری ملاقات اچانک ایک محفل میں ہو گئی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ضبط سے کام لوں مگر اس کا چہرہ دیکھ کر میں بے اختیار ہو گیا۔ میں نے خود ہی اسے مخاطب کیا اور اس پر برس پڑا۔ میں نے اُسے کھری کھری سنائیں کہ دولت نے تمہارا دماغ خراب کر ڈالا ہے' بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک آ گئی۔ میں نے دو تھپڑ اخلاق کے چہرے پر جڑ دیئے۔ بات مزید آگے بڑھنے سے قبل دیگر لوگوں نے ہمیں چھڑا لیا۔ اخلاق نے مجھے دھمکی دی اور کہنے لگا کہ میں تم سے ان تھپڑوں کا بدلہ ضرور لوں گا۔ میں بھی

خاموش نہ رہا اور کہا کہ آج سے میں تمہارا دشمن ہوں۔ تم نے میرے خاندان کی جو رسوائی برادری میں کرائی ہے اس کا بدلہ تم سے ضرور لوں گا اور اگر میں نے بدلہ نہ لیا تو اوپر والا انتقام تم سے ضرور لے گا۔

اب اخلاق اور اس کے گھر والوں نے دولت کے بل بوتے پر میرے خلاف محاذ بنا لیا۔ انہوں نے تمام برادری کو میرے خلاف کر ڈالا اور کئی لوگوں نے ہمیں اپنے گھروں میں آنے سے منع کر دیا مگر میں نے کسی کی پرواہ نہ کی البتہ آہستہ آہستہ یہ احساس شدید ہونے لگا کہ محض غریب ہونے کی بنا پر لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں' اگر میں چچا الیاس اور اخلاق کی طرح دولت مند ہوتا' میں بھی کویت میں ہوتا تو یہ لوگ میری بھی اس طرح عزت کرتے اب بھی وقت ہے اگر میں کوشش کروں تو اپنی عزت دولت کے بل بوتے پر کرا سکتا ہوں۔ اس کے لیے میں نے دیار غیر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میں نے جب نصیر سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ میں ایسے خواب نہ دیکھوں مگر میری ضد کے آگے اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور میری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ اُس نے ہی بتایا کہ میرا ایک جاننے والا راجا نواز نامی ایجنٹ ہے جو یورپی ممالک میں کافی لوگوں کو بھیج چکا ہے۔

اگلے دن راجا نواز سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے روایتی طور پر میری حوصلہ افزائی کی اور کہنے لگا کہ انشاء اللہ میں آپ کا کام کر دوں گا۔ چالیس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے یورپی دنیا کا نقشہ کچھ ایسے انداز میں کھینچا کہ میری بے تابی اور بھی بڑھ گئی میں نے بھاگم بھاگ پاسپورٹ بنوایا اور راجا نواز نے بتایا کہ جب پندرہ آدمیوں کا گروپ مکمل ہو جائے گا تو پھر ہم روانہ ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ میں خود بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا اور تمام لوگوں کو یونان پہنچا کر اور بحری جہاز پر ملازمت دلوا کر واپس آؤں گا۔ راجا نواز کی لچھے دار باتوں نے مجھے اس کا گرویدہ بنا ڈالا۔ یوں ہی ایک سال کا عرصہ بیت گیا مگر گروپ مکمل نہ ہوا۔ میں پھر بھی ناامید نہ تھا۔ اب تو دن رات میں یہی خواب دیکھنے لگا تھا کہ میں بہت امیر ہو گیا ہوں۔ میرے پاس گاڑی اور کوٹھی بھی ہے مگر روانگی کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔

ہمارے شہر سے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے۔ لوگ وہاں جا کر منتیں مانتے اور مرادیں پا کر واپس آتے۔ میں نے جب ان کے بارے میں سنا تو میں نے روزانہ وہاں جانا شروع کر دیا۔ ٹیکسی میرے پاس ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے وہاں آنے جانے میں کسی قسم کی دشواری نہ تھی میں روزانہ وہاں جاتا اور گڑگڑا کر اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے دعا مانگتا۔ میرے علاوہ بھی روزانہ وہاں کئی لوگ اپنی اپنی مرادیں لے کر جاتے اور یہ سب کے سب غریب بستیوں کے لوگ لگتے تھے...... ہم غریب لوگ ہی قدامت پرست ہوتے ہیں اور موجودہ وقت میں بھی کرامات اور معجزات پر یقین رکھتے ہیں' ہمارا ذہن یہی سوچتا رہتا ہے کہ ابھی آسمان پھٹے گا اور نوٹوں سے بھری ہوئی تھیلی ہماری گود میں آن گرے گی' لاکھ دو لاکھ کا لفافہ راہ چلتے ہی مل جائے گا یا پھر کسی دن کوئی ملنگ کوئی فقیر دروازے پر دستک دے کر ہمارے ہاتھوں میں سونے کی اینٹ رکھ دے گا۔ یہ سوچتے سوچتے سال پر سال گزر جاتے ہیں اور پھر ایک دن اسی کسمپرسی کی حالت میں زندگی کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں...... میں اب بھی پُرامید تھا۔ راجا نواز کو میں دس ہزار روپے ایڈوانس دے چکا تھا اور باقی رقم روانگی کے وقت دینی تھی۔ اب تو اس نے کہہ دیا تھا کہ بہت جلد ہماری روانگی ہو جائے گی۔ میں نے مزید رقم کا بھی بندوبست کر لیا تھا کہ کسی وقت بھی راجا نواز کا بلاوا آ سکتا ہے۔

اس رات میں ایک سواری مزار کے علاقہ میں اُتار کر اور مزار پر دعا مانگ کر واپس شہر اور گھر کی طرف آ رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور موسم بھی ابر آلود تھا۔ میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا ابھی میں شہر سے ایک دو کلومیٹر پیچھے ہی تھا کہ ایک لڑکی کی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ آواز سڑک کے قریب ہی سے آئی تھی۔ میں نے ٹیکسی روک لی۔ لڑکی ارے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا کہ

اس کی مدد کروں یا خاموشی سے چلا جاؤں؟ اگلے ہی لمحے میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور ٹیکسی سے باہر نکل آیا۔ سڑک کے ساتھ ہی ایک گھنے درخت کے نیچے ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھ کر میں آگے بڑھا۔ احتیاطاً میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے والا لوہے کا ہینڈل ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

وہ شخص لڑکی کو قابو کرنے کی کوشش میں تھا جبکہ لڑکی فرار چاہ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر لوہے کا ہینڈل اس شخص کی کمر پر پورے زور سے مارا تو وہ کراہ کر گر پڑا۔ وہ اٹھنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ وہ شاید اچانک حملہ سے گھبرا گیا تھا اسی وجہ سے اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور سڑک پر لا کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے اندر بیٹھنے کو کہا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ میں نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ راستے میں میں نے اسے پوچھا۔

''کہاں جانا ہے؟ مجھے اپنے گھر کا پتہ دو' میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔'' لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے پھر پوچھا۔ اس مرتبہ بڑے دھیمے لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے' جہاں مرضی ہے چلو مگر ایسی جگہ جہاں کریم خان نہ ہو۔'' یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا جواب سن کر میں اُلجھن میں مبتلا ہو گیا کہ اب کیا کروں؟ میں نے نیکی تو کی ہے مگر کہیں اس کا خمیازہ ہی بھگتنا نہ پڑ جائے' کہیں یہ لڑکی میرے لیے مصیبت ہی نہ بن جائے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے اور یہاں کیسے پہنچی ہے؟ اس کی سسکیاں میرے ذہن پر ہتھوڑے بن کر برسنے لگیں تو میں نے پھر پوچھا۔

''تم کون ہو اور یہاں کیسے پہنچی ہو؟'' جواب میں وہ کہنے لگی۔

''یہ لمبی کہانی ہے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی مگر اس وقت مجھے کہیں دور لے جاؤ جہاں میرا باپ نہ ہو' کریم خان نہ ہو۔'' میں نے گاڑی کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا اور اسے بتا دیا کہ میں تمہیں اس وقت اپنے گھر لے جا رہا ہوں جہاں میرا چھوٹا بھائی ہے میری ماں ہے۔ ان لوگوں کو مجھ پر اعتماد ہے اس لیے میرے گھر میں تمہیں کوئی کچھ نہ کہے گا بلکہ بالکل اسی طرح تمہارا استقبال ہو گا۔ جس طرح میرا ہوتا ہے مگر یہ بتا دوں کہ میرے ساتھ دھوکہ مت کرنا' میں غریب ضرور ہوں مگر غیرت مند بھی ہوں۔ اگر تم یہ سب کچھ ڈرامے کے طور پر کر رہی ہو تو اسی وقت ٹیکسی سے نیچے اتر جاؤ' میں اپنے جذبات کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

''آپ تو میرے محسن ہیں' آپ نے تو مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں آپ کا احسان تمام عمر نہ بھلا سکوں گی۔ مجھے اپنے گھر ضرور لے چلیں' میں تو نہایت ہی غریب' کمزور اور بے بس سی لڑکی ہوں' میں بھلا کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہوں؟ مجھ پر اعتماد کریں اور مجھے ان درندوں سے بچا لیں۔''

اس نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا تو میں بھی خاموش ہو گیا۔ جب میں گھر پہنچا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ جمیل تو سو چکا تھا مگر امی حسب معمول جاگ رہی تھیں۔ میں نے اس لڑکی کو گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے دیا اور خود جا کر امی کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگیں کہ اسے اندر لے آؤ۔ میں اسے لے کر اندر کمرے میں چلا آیا۔ روشنی میں جب اس کا سراپا دیکھا تو میں ششدر رہ گیا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ میری روح میں اتری جا رہی ہو۔ ہلکے سے میک اپ پر بالوں کا جوڑا خوبصورت لگنا چاہیے تھا مگر اب اس کے بال بکھر چکے تھے' پھر بھی وہ حسین لگ رہی تھی۔ میں نے اس کمرے میں زیادہ کھڑا ہونا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے کپڑے بدلے' ہاتھ منہ دھویا' اتنے مین امی میرے لیے کھانا گرم کر چکی تھیں' میں نے کھانا شروع کر دیا تو اسے بھی کھانے کو کہا مگر اس نے بھوک نہ ہونے کا کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا۔ میں کھانا کھا چکا تو واپس اسی کمرے میں چلا آیا جہاں وہ میری امی

کی گود میں سر رکھ کر یوں لیٹی ہوئی تھی جیسے وہ اس کی سگی ماں ہوں۔

میں اس کے سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

''اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور اس حالت میں گھر سے کیوں بھاگی ہو؟'' میرے استفسار پر اس نے اپنے ماضی سے پردے اٹھا دیے۔

☆......☆......☆

میرا نام سیما ہے۔ میرا گھر غریبوں کی بستی میں ہے۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی اکرم ہے جو اپنے آپ میں مست رہنے والا ہے، گھر کے حالات اور معاملات سے اُسے ذرا بھی غرض نہیں ہے، بس آوارہ دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ میرا باپ اسی محلہ میں کریانہ کی دکان کرتا ہے۔ ہم کئی سالوں سے اس علاقے میں رہ رہے ہیں۔ کریانہ کی دکان سے ابا جان کی اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ جس سے گزر بسر ہو جاتی۔ امی اور ابا میں بہت ہی پیار اور اتفاق تھا۔ محلہ کے لوگ میرے ابا جان کا احترام کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات بدلنا شروع ہو گئے، نہ جانے ہمارے گھر کو کس کی نظر کھا گئی کہ خوشیاں روٹھ گئیں۔ اب گھر میں امی اور ابو روزانہ ہی جھگڑا کرتے اور معمولی سی بات پر ابا جان میری امی کو بری طرح پیٹ ڈالتے۔ وہ صرف اتنا ہی کہا کرتیں۔

''سیما کے ابا! نشہ کرنا چھوڑ دے، نشہ اچھے اور بھلے کی تمیز بھلا دیتا ہے۔ یہ زندگیاں برباد کر ڈالتا ہے۔''

ابا جان کو یہ روک ٹوک گوارہ نہ تھی۔ وہ اچھے بھلے ہوا کرتے تھے، وہ سگریٹ تک نہ پیتے تھے مگر نہ جانے تقدیر کو ہم سے کیا بیر تھا کہ ابا جان کی دوستی چند اوباش قسم کے لوگوں سے ہو گئی۔ وہ سارا دن دکان پر بیٹھے رہتے۔ انہوں نے میرے باپ کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ پہلے ان کو سگریٹ پینے کی عادت ڈالی اور پھر سگریٹ میں ہیروئن یا چرس بھر کر پلانے لگے۔ ابا جان آہستہ آہستہ اس نشہ کے عادی ہو گئے۔ وہ گھر میں بھی نشہ کی حالت میں آنے لگے۔ امی نے ابا جان کی یہ حالت دیکھی تو تڑپ اٹھیں۔ انہوں نے بہت روکا، منتیں کیں، خدا رسول اور اپنی جوان بیٹی کے واسطے دیے مگر ابا جان اس گرداب سے نہ نکل سکے۔ صبح وہ دیر گئے تک سوئے رہتے اور جب دکان پر جاتے تو گھر کو بھول جاتے۔ دکان پر بھی سارا دن ان کے دوست بیٹھے رہتے جس وجہ سے گاہکوں میں بھی کمی ہو گئی۔ لوگوں نے ہماری دکان سے سودا سلف لینا چھوڑ دیا اور یوں کاروبار بھی دن بدن گھاٹے میں جانے لگا۔ ہر رات کو ابا جان نشے میں گھر آتے اور امی سے لڑائی شروع ہو جاتی۔ ان دونوں کی لڑائی کے وقت میں اور میرا بھائی سہم کر ایک کونے میں دبک جاتے۔ امی ان کو کھانا دینے سے انکار کر دیتیں۔ میں جو جوانی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی، آنے والے حالات سے بہت ہی خوفزدہ سی رہنے لگی۔

میں اُن دنوں نویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ ایک دن ابا جان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے میرا اسکول جانا بھی بند کر دیا۔ اب ابا جان نے اپنے اوباش دوستوں کو گھر پر لانا شروع کر دیا تھا۔ ان کو دیکھ کر میں اور امی ڈر جاتیں۔ امی نے مجھے تاکید کر دی کہ اگر ابا جان کا کوئی دوست یا ساتھی گھر آئے تو میں پڑوس میں چلی جایا کروں، اس لیے میں ایسا ہی کرنے لگی، جیسے ہی ابا جان اور اُن کے ساتھی نشہ کی حالت میں گھر میں داخل ہوتے میں گھر سے نکل جاتی اور اڑوس پڑوس کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی۔ میں جب واپس آتی تو گھر کی حالت دیدنی ہوتی۔ ابا جان اور ان کے ساتھی تو جا چکے ہوتے مگر گھر سارا الٹ پلٹ ہو چکا ہوتا۔ امی مجھے دیکھ کر رونا شروع کر دیتیں اور کہتیں کہ مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ میں اس کی جائز و ناجائز باتیں سہہ رہی ہوں اور سہتی رہوں گی۔ مجھے تیری فکر ہے تیرا کیا بنے گا؟ نشہ کرنے والے تو بے غیرت بن جاتے ہیں۔ اگر تیرے باپ نے تجھے بھی اس آگ میں دھکیل دیا تو کیا ہوگا، تو جل کر راکھ ہو جائے گی۔ امی کی باتیں سن کر میں تڑپ اٹھی کہ میرے باپ کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟

آہستہ آہستہ کاروبار ختم ہو گیا تو ابا جان کو فکر لاحق

ہوئی کہ اب وہ نشہ کہاں سے خریدیں گے؟ انہوں نے سب سے پہلے امی کے تھوڑے سے زیور پر ہاتھ صاف کیا اور جو تھوڑی بہت نقدی امی نے بچا کر رکھی تھی وہ بھی چھین لی۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر نوبت فاقوں تک آ گئی۔ جب ہر طرف سے مایوسی نظر آئی تو ابا جان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ تم کریم خان سے سود پر قرض لے لو اور دکان دوبارہ شروع کر دو۔ ان کے کہنے پر ہی ابا جان نے سیٹھ کریم سے دس ہزار روپے قرض لیا اور اس رقم سے سامان خرید کر دوبارہ دکان میں ڈال دیا۔ انہوں نے کریم خان کے ساتھ تحریری معاہدہ کیا کہ ڈیڑھ سال بعد اصل رقم بمعہ سود واپس کر دوں گا۔ اُس شام ابا جان اکیلے ہی گھر میں داخل ہوئے۔ ان کا کوئی ساتھی ان کے ہمراہ نہ تھا۔ اس دن وہ نشہ کی حالت میں بھی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں ہم سب کے لیے کپڑے اور دیگر تحائف اٹھائے ہوئے تھے۔ میں اور امی بہت خوش ہوئیں مگر پھر بھی امی نے پوچھا۔

''یہ سب کچھ آپ کہاں سے لائے ہیں؟'' تب ابا جان نے بتایا کہ سیٹھ کریم خان سے دس ہزار روپیہ قرض لیا ہے جو سود کے ہمراہ واپس کروں گا' میری امی نے تو طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ سیٹھ کریم خان کو جانتی تھیں کہ وہ دولت کے نشہ میں سرشار ہو کر غریبوں کی مجبوریاں خریدتا ہے۔ امی کہنے لگیں۔

''اب تم نے اس سے قرض لیا ہے تو وہ ہمارے گھر بھی آنا شروع کر دے گا جو میں کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کروں گی۔'' ابا جان نے فوراً ہی امی کی پٹائی شروع کر دی اور کہنے لگے۔

''تم کون ہوتی ہو میرے کسی دوست کو میرے ہی گھر میں آنے سے روکنے والی؟ وہ میرا محسن ہے اس نے میری مشکل وقت میں مدد کی ہے۔ میں تو اس کا احسان کبھی بھی بھلا نہ پاؤں گا۔'' ابا جان کے تحفے لانے پر جو خوشی مجھے حاصل ہوئی تھی وہ لمحوں میں کافور ہو گئی۔ امی کا کوئی بھی رشتہ دار کسی اور شہر میں نہ تھا ورنہ وہ مجھے وہاں بھیج دیتیں۔ ہم بے بس ہو کر گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئیں اور اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

سیٹھ کریم ابا جان کی دکان پر آنے لگا۔ وہ جب بھی آتا ابا اس کی خدمت کرتے اور گھر سے اس کے لیے اسپیشل چائے بنوا کر لے جاتے۔ میں اور امی دل ہی دل میں دعا مانگا کرتیں کہ خدا کرے سیٹھ کریم خان بھول کر بھی ہمارے گھر نہ آئے۔ دوسری جانب ابا جان کی مالی حالت نہ سنبھلی' سیٹھ کریم خان کے دس ہزار بھی کاروبار کو سنبھالا نہ دے سکے۔ دوکان اب بھی گھاٹے میں ہی جا رہی تھی' اُدھر کریم خان کا قرض مع سود کے واپس کرنے کی مدت بھی ختم ہو گئی تو ابا جان کی پریشانی بھی بڑھ گئی۔ سیٹھ کریم خان نے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو میرے باپ نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور ایک مہینہ کی مہلت مزید لے لی۔ سیٹھ کریم خان رضا مند ہو گیا تو ابا جان نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے ادھار کا مطالبہ کیا کہ وہ انہیں قرض دیں تا کہ سیٹھ کریم خان کی رقم لوٹائی جا سکے مگر اس آڑے وقت میں کسی دوست نے بھی اُن کی مدد نہ کی اور یوں ایک ماہ مزید گزر گیا۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ امی کسی کام کی غرض سے پڑوس میں گئی ہوئی تھیں کہ ایک موٹا اور بھدا سا شخص ہمارے گھر میں آ گیا۔ امارت اس کے لباس سے ظاہر ہو رہی تھی آتے ہی کہنے لگا۔

''میرا نام سیٹھ کریم ہے اور میں اپنا قرض وصول کرنے آیا ہوں۔'' میں نے اُسے بتایا کہ ابا جان دکان پر ہیں وہاں چلے جاؤ اور اُن سے قرض مانگ لو۔

''دکان تو بند ہے میں تمہارے باپ کا یہاں ہی انتظار کر لیتا ہوں۔''

وہ اندر آ کر بیٹھ گیا تو میں فوراً گھر سے باہر نکل گئی اور امی کو گھر بھیجا۔ امی کو سیٹھ کریم نے وارننگ دی کہ اگر کل تک تمہارے شوہر نے میرا قرض ادا نہ کیا تو میں قرض کے بدلے میں تمہارا مکان اور دکان دونوں حاصل کر لوں گا۔ سیٹھ کریم چلا گیا تو امی مجھے گھر لے آئیں اور کہنے لگیں۔

''بیٹی! سیٹھ کریم نے نہ صرف ہمارا گھر دیکھ لیا

ہے بلکہ اس نے تمہیں بھی دیکھ لیا ہے۔ سیٹھ کریم سے اب ہمیں بہت خطرہ ہے۔ تمہیں بھی اب حوصلہ اور ہمت سے کام لینا ہوگا' اپنی حفاظت کرنا ہوگی اور اگر کبھی غیرت کا مقام آ جائے تو اس زندگی پر موت کو ترجیح دینا کیونکہ تمہارے باپ کی غیرت تو مر گئی ہے' بھائی تمہارا بہت چھوٹا ہے اور جب مالی ہی چمن اجاڑنے لگے تو شکوہ کس سے کریں؟''

رات کو ابا جان گھر آئے تو امی نے ان کو بتایا کہ سیٹھ کریم قرض مانگنے کے لیے گھر آیا تھا۔ امی کا اتنا کہنے کی دیر تھی کہ ابا جان امی پر برس پڑے کہ تم نے کریم خان کو چائے کا کیوں نہیں پوچھا؟ انہوں نے مجھے بھی ڈانٹا کہ کریم خان آیا تو میں گھر سے باہر کیوں چلی گئی' اس نے تجھے کھا تو نہیں جانا تھا۔ انہوں نے میری اور امی دونوں کی بے عزتی کی' گندی گندی گالیاں دیں کہ شاید وہ اس دن کچھ زیادہ ہی پی کر آئے تھے۔ اگلے دن پھر گھر میں امی اور ابا جان کے مابین جھگڑا ہوا تو ابا جان نے ایک لاٹھی اٹھائی اور امی کو اس سے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاٹھی کی ایک ضرب امی کے پیٹ میں بھی لگی۔ جس کی وجہ سے اُن کی طبیعت بہت خراب ہوگئی اور ان کے ناک منہ سے خون آنے لگا۔ محلّہ والے انہیں اسپتال لے گئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ اسپتال ہی چلی گئی۔ جب میرے باپ کا نشہ اترا تو وہ امی کو دیکھنے اسپتال آ گئے مگر وہاں بھی انہوں نے لحاظ نہ کیا۔ امی کی حالت اب بھی خطرے میں تھی۔ ڈاکٹر تو پوری کوشش کر رہے تھے مگر وہ خود کہہ رہی تھیں۔

''میں اب بچوں گی نہیں لگتا ہے میرا کلیجہ کٹ گیا ہے۔'' اس پر ابا جان اُن کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ اب مکر و فریب چھوڑو اور گھر چلو' میں نے قرض کے بدلے میں سیما کا رشتہ سیٹھ کریم خان سے طے کر دیا ہے اور چند دنوں بعد رخصتی کرنی ہے۔ ابا جان کی زبان سے یہ انکشاف سن کر میری آنکھیں بھر آئیں اور میرا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ اُدھر امی کی حالت بھی غیر ہوگئی' انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف پھر ابا جان کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو اُمڈ آئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی روح پرواز کر گئی۔

میں دھاڑیں مار کر امی کے بے جان وجود سے لپٹ گئی۔ میری پہچان مٹ گئی میری پیاریں مجھ سے روٹھ گئیں مجھ سے وہ ہستی روٹھ گئی جو کبھی بے اعتبار نہیں ہوتی' میں بھی اُن بدقسمت لوگوں میں شامل ہوگئی جن کے لب ہمیشہ پیاسے رہتے ہیں۔ ابا جان نے اس عالم میں بھی مجھے تسلی اور دلاسہ نہ دیا۔ میں اکیلی ہی روتی اور تڑپتی رہی۔ امی کو منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا۔ مگر وہ ایک لمحہ کو بھی میری نظروں سے اوجھل نہ ہوئی تھیں۔ جیسے ان کی قبر میری آنکھوں میں بنی تھی۔ امی کو مرے ہوئے چالیس دن گزر گئے۔ یہ دن کیسے گزرے میں کس اذیت سے دوچار رہی' یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ میرے باپ میں تو غیرت نام کی کوئی چیز ہی نہ رہی تھی۔ میں روتی رہی' بلکتی رہی' میرے آنسو حلق کے راستے میرے سینے پر ٹپکتے رہے اور آگ بن کر میرے جسم کو جلاتے رہے۔ وہ چالیس دن میرے لیے ایک عذاب سے کم نہ تھے مگر اس کے بعد ایک نیا عذاب میرے لیے شروع ہوگیا۔ وہ چالیس دن ابا اور سیٹھ کریم نے نہ جانے کیسے صبر کیا ہو گا۔

جیسے ہی امی کا چالیسواں ہوا' ابا نے مجھے حاکمانہ انداز میں بتایا کہ ایک ہفتہ بعد تمہاری شادی کریم خان سے ہو رہی ہے۔ اگر تم نے انکار کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ سیٹھ کریم خان امیر شخص ہے وہ نہ صرف تمہیں پیار دے گا بلکہ خوش بھی رکھے گا۔ ابا جان نے مجھے کافی سبز باغ دکھائے اور ساتھ ہی دھمکیاں بھی دیتے رہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ انکار کر دوں کہ سیٹھ کریم تو میرے دادا کی عمر کا ہے اس کا اور میرا جوڑ بھلا کیسے ممکن ہے مگر وہاں انکار کی گنجائش نہ تھی۔ تمام رات میں نے سوچتے اور تارے گنتے ہوئے گزار دی۔ رات بھی میں اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتی رہی۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ سیٹھ کریم سے شادی نہیں کروں گی اگر ہو سکا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ اس بھری دنیا میں کوئی تو ٹھکانہ مل ہی جائے گا اور اگر

میں ایسا نہ کر سکی تو زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی مگر باپ اور سیٹھ کریم کے خوابوں کو تعبیر نہ دوں گی۔ ابا جان کو بھی شاید مجھ پر کچھ شک ہو گیا تھا اسی لیے اب ان کا ایک دوست تمام دن ہمارے گھر میں رہتا' وہ اصل میں میری نگرانی کرتا تھا لیکن ظاہر یہی کیا گیا تھا کہ میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں اس لیے میری حفاظت کی خاطر وہ گھر میں رہتا ہے۔ رات کو جب ابا جان گھر آ جاتے تو وہ چلا جاتا۔

اُس رات میری شادی تھی۔ رات دیر گئے سیٹھ کریم نے آنا تھا اور مجھے لے کر جانا تھا۔ سیٹھ کریم کی طرف سے دو عورتیں شام ڈھلے ہی زیور اور کپڑے لے کر آ گئیں' میں نے فرار ہونے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔ جب وہ مجھے دلہن بنا کر مطمئن ہو گئیں تو ان میں سے ایک واپس چلی گئی۔ میرے ابا اسے چھوڑنے کے لیے گئے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور دوسری عورت جیسے ہی غسل خانہ میں گئی تو گھر سے بھاگ نکلی۔ میں چھپتی چھپاتی دور نکل آئی تو یہ شخص میرے پیچھے پڑ گیا' اس نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر اس کے من میں بھی شیطان جاگ اٹھا۔ اگر آپ موقع پر نہ پہنچتے تو میں برباد ہو گئی ہوتی کیونکہ ایک درندے سیٹھ کریم سے تو میں بچ گئی تھی مگر دوسرے درندے سے بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اس کا صلہ میں تمام عمر نہ چکا پاؤں گی۔ مجھ پر ایک اور احسان کر دیں مجھے دارالامان میں داخل کرا دیں کیونکہ میں اب کبھی اپنے باپ کے پاس نہ جاؤں گی۔ وہ میرے لیے اور میں اس کے لیے مر گئی ہوں' وہ میرا باپ نہیں بلکہ ایک سوداگر ہے۔ اب اگر میں اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ وہ تو باپ کہلانے کا ہی مستحق نہیں ہے۔

☆......☆......☆

سیما نے اپنی بپتا ختم کی اور پھر رونے لگی۔ ہمیں بھی اُس کی داستان سن کر بہت دکھ ہوا کہ اس دنیا میں کیسے کیسے بے حس لوگ بستے ہیں جو اپنی بیٹیوں کا بھی سودا کر ڈالتے ہیں پھر میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور وہ میری امی کے ساتھ ہی سو گئی۔ امی نے اسے تسلی دی تھی کہ میں تمہیں اپنے گھر میں ہی رکھوں گی' نہ تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گی اور نہ ہی دارالامان میں...... میں یہی سمجھوں گی کہ میری دو بیٹیاں ہیں' ایک گلشن اور دوسری سیما...... ہم جو بھی روکھی سوکھی کھاتے ہیں وہ تم بھی کھا لینا۔

میں اس رات سیما کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ مجھے اس سے ہمدردی سی ہو گئی تھی' اس کا دکھ مجھے بھی دکھی کر گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب سیما کو اس گھر سے نہ جانے دوں گا۔ میں اس کی تمام محرومیاں اور دکھ سمیٹ لوں گا' اس کا سہارا بنوں گا۔ اور اس کو اتنا پیار دوں گا کہ وہ ماضی کے تمام دکھ درد بھول جائے گی۔

ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اور سیما ہمارے گھر کے ماحول میں رچ بس گئی۔ ہم سب نے اور خاص طور پر امی نے اسے بہت ہی توجہ اور چاہت دی۔ اس کا تعارف نصیر اور گلشن سے بھی کرا دیا گیا۔ سب نے ہی سیما کو پسند کیا اور میرے ہی حق میں فیصلہ دیا۔ جب امی نے اس سلسلے میں سیما سے بات کی تو اس نے سر جھکا دیا۔ یوں دو ماہ بعد سیما میری بیوی بن کر میری زندگی میں آ گئی۔ شادی کی پہلی رات وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''وسیم! میں تمام عمر تمہارے قدموں میں گزار کر پوجا کرتی رہوں گی۔ جس طرح رات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے چاند نکلتا ہے' اسی طرح میری زندگی کی تاریکیاں ختم کرنے کے لیے خدا نے تمہیں میرا بنا دیا ہے۔ اب میرا سب کچھ تم ہو' کبھی مجھے اپنے آپ سے جدا نہ کرنا۔ عورت کی بھوک صرف اتنی ہی ہوتی کہ اس کا شوہر اس پر محبت کی ایسی نظر ڈالے کہ اس کے وجود کی ساری تشنگی مٹ جائے...... تم میری پہلی اور آخری محبت ہو' اب تم ہی میرے نصیب کا تارا ہو جسے اب میری زندگی کے آسمان پر چمکنا ہے...... اس کی روشنی کبھی ماند نہ پڑنے دینا۔''

میں نے سیما کو قدموں سے اٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا اور اسے یقین دلایا کہ میں زندگی میں اسے کبھی مجھی کسی

بھی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو صرف دیکھنا' تسخیر کرنا اور بھول جانا ہی جانتے ہیں' جنھوں نے ہمیشہ فرض کے نام پر عورت کا استحصال کیا ہے۔ میں محبت کا امین ہوں اور میرا خمیر ان ہی محبتوں کی مٹی سے گوندھا گیا ہے......

ہم نے ڈھیروں باتیں کیں اور مستقبل کے حسین تاج محل بنانے کے خواب بھی دیکھے۔ جب میں نے سیما کو بتایا کہ میں کچھ عرصے بعد غیر ملک چلا جاؤں گا تو وہ پریشان ہوگئی اور کہنے لگی۔

"وسیم! مجھے چھوڑ کر مت جانا' ورنہ میں جی نہ پاؤں گی۔" میں نے اُس کی ہمت بندھائی کہ زندگی میں ایسے دور آتے ہی رہتے ہیں ملن اور جدائی محبتوں کی شدت میں اضافہ کرتی ہیں اور پھر میں رقم ایجنٹ کو دے چکا ہوں' جو میرے خون پسینے کی کمائی ہے۔ اگر میں نہ گیا تو رقم ضائع ہو جائے گی ایجنٹ کسی صورت میں بھی رقم واپس نہ کرے گا' یوں میں نے سیما کو قائل کرلیا تھا۔

میری اور سیما کی شادی چند قریبی رشتے داروں کی موجودگی میں بہت سادگی سے ہوئی تھی' مگر اب آہستہ آہستہ محلے کی عورتیں مبارکباد دینے کے لیے آنے لگیں۔ ہر کوئی سیما کے خاندان کا پوچھتا تو امی ہر ایک کو یہی جواب دیتیں کہ سیما ان کی دور کی ایک بہن کی بیٹی ہے۔ اس کے ماں باپ دونوں ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے تو میں اسے گھر لے آئی ہوں اور اس کی شادی وسیم سے کردی ہے۔ عورتیں سیما کے حسن کی بہت تعریف کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ وسیم کی بیوی لاکھوں میں ایک ہے۔

☆......☆......☆

ہماری شادی ہوئے دو ماہ ہی گزرے تھے تب راجا نواز نے اطلاع دی کہ میرا کام ہوگیا ہے اس لیے میں تیاری کرلوں اور باقی کی رقم بھی تیار رکھوں۔ اب ان حالات میں میرا بھی جانے کو جی تو نہیں چاہتا تھا مگر رقم کا نقصان برداشت کرنے کی طاقت بھی نہ تھی اس لیے میں نے تیاری شروع کردی۔ میرے علاوہ بارہ افراد تھے جن کا تعلق مختلف شہروں سے تھا۔

راجا نواز نے ہمیں کہا کہ ہم کراچی پہنچ جائیں۔ بندر روڈ پر جاگیردار ہوٹل میں اس کا ایک ساتھی فیاض ہمارا منتظر ہوگا۔ جب سب لوگ وہاں پہنچ جائیں گے تو پھر وہاں روانگی کی تاریخ مقرر ہوگی۔ میں نے گاڑی کی سیٹ بک کرائی۔ روانگی سے قبل والی رات کو سیما نے مجھے بتایا کہ وہ امید سے ہے۔ خوشی کی خبر سن کر میں نے کہا۔

"سیما! آنے والا بچہ ہمارے حسین خوابوں کی تعبیر ہوگا' وہ یقیناً خوش قسمت ہوگا جو ہمارے بخت بھی جگا دے گا۔ اس کا پہلا ثبوت یہی ہے کہ میرا باہر جانے کا پروگرام بن گیا ہے ورنہ میں تو کئی سالوں سے باہر جانے کی کوشش میں تھا۔ اب اس آنے والے بچے نے میرے بھاگ جگا دیے ہیں۔"

اگلے دن اسٹیشن پر سب لوگ مجھے الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ میں سب سے باری باری گلے ملا اور آنکھوں میں جدائی کے آنسو لیے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ گاڑی چل پڑی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور گھر والوں کی جدائی کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کراچی پہنچنے کے بعد جاگیردار ہوٹل میں فیاض سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ میں راجا نواز کا ساتھی نہیں ہوں بلکہ میں خود بھی باہر جانے کا خواہش مند ہوں۔ راجا نواز کے کہنے پر ہی میں یہاں آیا ہوں اور اس کا منتظر ہوں۔ مجھے جاگیردار ہوٹل میں رہنے کے لیے جگہ مل گئی جبکہ کچھ لوگوں کو جگہ نہ ملی اور انہوں نے کسی دوسرے ہوٹل میں رہائش اختیار کرلی۔ اب ہمیں راجا نواز کا انتظار تھا کیونکہ تمام کاغذات اور رقم تو اس کے پاس تھی ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ مگر راجا نواز نہ آیا ہم سب کو فکر لاحق ہوگئی کہ کہیں وہ رقم لے کر بھاگ ہی نہ گیا ہو کیونکہ کافی ایجنٹ لوگوں کو اسی طرح دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ ہی میرے شہر کے دو آدمی اور بھی تھے۔ وہ بھی بے حد پریشان لگ رہے تھے۔ ہم تینوں نے پروگرام بنایا کہ ہم واپس اپنے شہر چلتے ہیں اور راجا نواز کا پتا کرتے ہیں۔ ہم نے اپنا سامان ہوٹل میں ہی چھوڑا اور بذریعہ ٹرین اپنے شہر کی جانب چل پڑے۔

جب ہم اپنے شہر میں اترے تو ہم نے اپنے چہرے اس طرح ڈھانپ لیے کہ کوئی ہمیں پہچان نہ سکے کیونکہ ہم نے گھر تو جانا ہی نہیں تھا۔ اگر ہمارے گھر والوں کو علم ہو جاتا کہ راجا نواز غائب ہے تو ہمارے گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی' اس لیے ہم اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ ہم چھپتے چھپاتے راجا نواز کے دفتر پہنچے تو دفتر بند ملا۔ ایک ساتھی نے راجا نواز کا گھر دیکھا ہوا تھا لہٰذا ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ کل کراچی روانہ ہو گیا ہے۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا مگر ہم کیا کرتے یقین کرنا ہی پڑا اسی شام ہم نے کراچی جانے والی گاڑی پکڑی اور کراچی پہنچ گئے۔ جب ہم ہوٹل پہنچے تو راجا نواز کو ہوٹل میں موجود پا کر ہماری جان میں جان آئی ورنہ ہماری جو حالت تھی وہ میں یہاں بیان نہیں کر سکتا۔

راجا نواز سے کافی دیر بحث مباحثہ جاری رہا' آخر کار دو دن بعد رات گیارہ بجے ہم سیرین ایئر لائن کے جہاز میں سوار ہوئے۔ راجا نواز بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ ہم بہت خوش تھے کہ جو خواب ہم نے دیکھ رکھے ہیں ان کی تعبیر ہمیں ملنے والی ہے۔ راجا نواز نے بتایا تھا کہ ہماری منزلِ استنبول ہے۔ وہاں سے خشکی کے راستے یونان جائیں گے۔ راجا نواز باتیں کرنے اور باتیں بنانے میں اتنا ماہر تھا کہ ہم اس کی ہر بات کا یقین کر لیتے تھے۔ استنبول میں ہمارا قیام ایک ہوٹل میں ہوا۔ ہوٹل اور کھانے کا خرچ راجا نواز کے ذمہ ہی تھا کیونکہ تمام رقم اُسی کے پاس تھی۔ چونکہ ہوٹل کا کھانا مہنگا پڑتا تھا اس لیے راجا نواز ہمیں سودا سلف لا دیتا اور ہم خود ہی پکا لیتے۔ ترکی میں شاید مسور کی دال بہت سستی تھی کہ روزانہ ہی راجا نواز مسور کی دال لا دیتا۔ ہم پھر بھی خاموش تھے کہ چند دنوں کی بات ہے۔ جب بھی کھانے کا وقت ہوتا راجا نواز باہر جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہم کھانے کو کہتے تو کہتا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ ایک روز میں نے اس کا پیچھا کیا تو حقیقت معلوم ہوئی کہ وہ تو اچھے سے ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا ہے اور ہمیں روزانہ مسور کی دال کھلاتا ہے۔ اس دن سے میرے من میں اس کے خلاف نفرت کا بیج پھوٹ پڑا' میں جان گیا کہ راجا نواز بہت ہی تیز اور دھوکہ باز شخص ہے' پھر بھی میں نے یہ راز اپنے تک ہی محدود رکھا اور دوسرے ساتھیوں کو نہ بتایا۔

ہوٹل میں بند رہتے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ بیت گیا۔ میں نے وہاں سے ہی ایک خط گھر والوں کو بھی لکھا اور ان کو تسلی دی کہ ہمارے حالات بہت جلد بدل جائیں گے اور جلد ہی میں یونان پہنچ جاؤں گا مگر اس ایک ہفتے میں ہمارے یونان جانے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ راجہ نواز صبح ہوٹل سے نکلتا' رات دیر گئے واپس آتا اور آتے ہی اس بات کا رونا رونے لگ جاتا کہ یونان کا ویزا نہیں لگ رہا' بارڈر پر بھی ان لوگوں نے بہت سختی کر دی ہے کیونکہ کئی لوگ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے یونان میں داخل ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک دن نواز کی ان ہی باتوں پر غصہ آ گیا۔ اس سے اُلجھ پڑا اور پوچھا۔

''تم یونان کے ویزے کے لیے یہاں سے کوشش کیوں کر رہے ہو' تم نے ہم سے رقم کس کام کی لی ہے؟ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ تم پاکستان سے ہی یونان کا ویزا لے کر چلو گے۔ ترکی کا تو ویزا ہی نہیں ہے' واپسی کا ٹکٹ خرید کر ہر فرد ترکی آ سکتا ہے۔ یہاں تک ہمیں لانے میں تمہارا کیا کمال ہے' اصل مسئلہ تو یونان کے ویزے کا اور یونان میں داخل ہونے کا ہے جس کا بندوبست تم ابھی تک نہیں کر سکے ہو۔ تم نے اب حقیقت بتائی ہے' اگر ہمیں پہلے معلوم ہوتا تو ہم پاکستان سے ہی نہ چلتے۔ تم نے ہمیں خوار کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے جلدی سے ہمارے یونان جانے کا بندوبست کرو ورنہ ہماری رقم واپس کر دو' ہم خود ہی کوشش کر لیں گے۔'' پھر دیکھتے ہی دیکھتے راجا نواز اور مجھ میں خاصی تلخ کلامی ہو گئی وہ کہنے لگا۔

''میں تمہیں پاسپورٹ دے سکتا ہوں مگر رقم واپس نہ ہو گی۔'' مجھے غصہ آ گیا میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا' مگر ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ پھر بھی میری بات سے سب نے اتفاق کیا اور ہم نے راجا نواز پر دباؤ ڈالا تو اگلے دن وہ چھ آدمیوں کو ساتھ لے کر بذریعہ ویگن یونان کے بارڈر کی طرف روانہ ہوا

کہ اگر ان کو یونان میں داخل مل گیا تو باقی لوگوں کو بھی لے جاؤں گا۔

ویگن والا ترکی کا باشندہ تھا معقول رقم کے عوض اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ میں ان چھ آدمیوں کے ساتھ نہ گیا۔ تین دن بعد وہ لوگ ناکام واپس آگئے کہ یونان میں داخلہ نہیں مل سکا کیونکہ انہوں نے پابندی سخت کردی ہے...... یوں دو ماہ گزر گئے۔ راجا نواز ہمیں حیلے اور بہانوں سے ٹالتا رہا' مجھے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ میرا مستقبل کبھی سنور نہ سکے گا۔ اس دوران میں نے کئی خط گھر والوں کو لکھے اور ان کو ہوٹل کا ایڈریس دے دیا کہ مجھے خط کا جواب دیا جائے۔ ہوٹل کے پتے پر دو خط آئے جن میں سب کی خیریت کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں اب بھی ان کو خط میں یقین دلاتا کہ میں جلد ہی یونان پہنچ جاؤں گا پھر تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اِدھر راجا نواز بھی یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے طور پر انتہائی کوشش کر رہا ہے مگر مجھے یقین نہ آ رہا تھا۔ ایک روز وہ مجھے اپنے ہمراہ لے گیا اور کہنے لگا۔

''وسیم! لگتا ہے کہ ہمیں یونان میں انٹری نہ مل سکے گی۔ اس لیے اگر تم واپس جانا چاہو تو میں بذریعہ ہوائی جہاز بھیج دوں گا کیونکہ میرے پاس رقم بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔''

راجا نواز کی بات سن کر میں تڑپ اٹھا اور کہا۔

''میں یہاں مر جاؤں گا مگر کبھی پاکستان واپس نہیں جاؤں گا۔ میں جس خواب کی تکمیل کے لیے آیا ہوں' اس کی تکمیل کے بغیر میری واپسی ممکن نہیں۔ میں دولت کمانے اپنے گھر سے اتنی دور آیا ہوں' بھائی' بہن اور بیوی کی جدائی اسی لیے برداشت کی ہے کہ اپنا مستقبل سنوار سکوں اور یہ سب کچھ تمہارے وعدوں پر کیا ہے۔ اب تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا پڑے گا' مجھے روزگار دلانا تمہاری ذمہ داری ہے' ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' میرے تیور دیکھ کر راجا نواز کہنے لگا۔

''وسیم! میں تمہیں صرف آزمانا چاہتا تھا۔ میں کسی اور کے لیے ویزے یا ملازمت کا بندوبست کروں یا نہ کروں مگر تمہارے لیے ضرور کروں گا۔ فی الحال میں تمہیں ترکی میں ہی کوئی ملازمت دلا دیتا ہوں۔ پھر جب حالات بہتر ہوں گے تو میں تمہیں کسی یورپی ملک پہنچادوں گا۔''

میں نے نواز کی بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ مجھے تو دولت کمانے سے غرض ہے تم مجھے یہاں ہی ملازمت دلا دو۔ اگلے دن نواز مجھے ایک شخص کے پاس لے گیا جس کا نام ایڈورڈ تھا۔ وہ کسی یورپی ملک کا رہنے والا تھا اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا۔ میں نے اُس کا مال انقرہ لے جانا تھا اور پھر انقرہ سے کچھ مال استنبول لانا تھا۔ اس مال میں زیادہ تر گھڑیاں اور میک اپ کا سامان تھا میری تنخواہ بھی معقول بتائی گئی تو میں فوراً تیار ہو گیا۔ میں نے راجا نواز کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھ پر خصوصی توجہ دی ہے۔

میں اگلے دن مال لے کر انقرہ روانہ ہونے والا تھا۔ ابھی میں استنبول کے ریلوے اسٹیشن پر ہی تھا کہ ترکش پولیس نے مجھے گھیر لیا۔ انہوں نے میرے سامان کی تلاشی لی تو اس میں سے گھڑیوں اور میک اپ کے سامان کی بجائے ہیروئن برآمد ہوئی۔ میں نے بہت شور مچایا کہ میں بے قصور ہوں' یہ راجا نواز اور ایڈورڈ کی چال ہے مگر میری ایک نہ سنی گئی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ راجا نواز کی چال کامیاب رہی' اس نے اپنی راہ کا کانٹا نکال دیا۔ مجھے اپنی سادہ لوحی پر بھی رونا آیا کہ میں کتنی آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس کر زندگی کو روگ لگا بیٹھا تھا' میں اس قابل تو نہ تھا۔ میں دیواروں کے ساتھ سر ٹکرا کر رونے لگا مگر وہاں میری آہ فریاد سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ ترکی میں ہیروئن فروخت کرنا اور پینا منع ہے۔ اسی لیے وہاں کا قانون بھی سخت ہے۔ میرے سامان سے کافی مقدار میں ہیروئن برآمد ہوئی تھی اس لیے مجھے سات سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ سات سال قید کی سزا سن کر میں دیواروں سے سر ٹکرا کر' بلک بلک کر رویا مگر کسی نے بھی مجھے دلاسہ نہ دیا۔ اس لمحے مجھے امی' سیما' جمیل اور گلشن شدت سے یاد آئے کہ جب اُن کو پتہ

چلے گا کہ وسیم کو سات سال قید ہوگئی ہے تو ان کا کیا حال ہوگا' وہ لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ خود میں یہ سات سال دیار غیر میں کیسے گزاروں گا؟ اس لمحہ احساس ہوا کہ خواب بھی حقیقت نہیں بنا کرتے' اگر ایسا ہوتا تو میرا مقدر نہ لٹتا...... جب وہاں پر موجود دیگر پاکستانی قیدیوں کو علم ہوا کہ میں بھی پاکستانی ہوں تو انہوں نے کہا ہم تمہیں دلاسہ دینے کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکیں گے' ہم بھی ہزاروں خواب من میں سجا کر گھر سے نکلے تھے مگر تقدیر ہمیں اِس جیل میں لے آئی ہے اور یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ اپنی تقدیر کا لکھا جان کر قبول کرو' سات سال بعد تمہیں یہ لوگ خود ہی پاکستان بھیج دیں گے۔ رونے سے نہ تو تقدیر بدلے گی اور نہ ہی مقدر سنورے گا۔

چند دنوں بعد میں نے ایک خط گھر والوں کو لکھا اور انہیں تمام حالات لکھ بھیجے' ساتھ ہی یہ تاکید بھی کردی کہ میری قید کی خبر اپنے آپ تک ہی رکھیں ورنہ لوگ انہیں جینے نہ دیں گے۔ ایک ماہ گزر گیا مگر میرے خط کا جواب نہ آیا پھر میں نے کئی خط گھر والوں کو لکھے مگر میرے کسی بھی خط کا جواب نہ ملا۔ جس وجہ سے میں اور بھی پریشان ہوگیا میرے ساتھی قیدیوں نے بتایا کہ جیل کی ڈاک کا نظام خراب ہے' نہ ہی ہمارے تمام خط ہمارے گھر والوں کو ملتے ہیں اور نہ ہی اُن کے خط ہم تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے تم فکر نہ کرو جب کوئی قیدی رہا ہوکر پاکستان جائے گا تو اس کے ہاتھ دستی خط بھیج دینا۔ جب گھر والوں کی طرف سے عرصہ تک کوئی خط نہ ملا تو میں نے بھی خط لکھنا بند کردیا۔ اس دوران جب ایک قیدی سزا کاٹنے کے بعد وطن جانے لگا تو اُس کے ہاتھ بھی خط بھیجا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ سات سال میرے لیے ساتھ صدیاں بن گئیں۔ ایک ایک لمحہ کانٹوں پر گزرنے لگا۔ دن تو دوسرے لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزر جاتا مگر رات کو جب گھر والوں کی یاد آتی تو میری آنکھیں چھلک پڑتیں اور میں تقدیر سے شکوہ کرنے لگتا کہ تو نے مجھے بھری دنیا میں تنہا کردیا ہے۔ انسان آرزوؤں کی تکمیل اس امید پر چاہتا ہے کہ وہ خوشیوں سے مالامال ہوجائے مگر آرزوؤں کی تباہی ہوجائے تو زندگی ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے...... میری زندگی بھی ریزہ ریزہ ہوگئی تھی۔ بس محرومیاں اور اداسیاں ہی میرا مقدر تھیں۔

☆......☆......☆

سات سال کا طویل عرصہ گزر گیا وہ سات سال میری زندگی کے قیمتی سال تھے جن کے ضائع ہونے کا غم مجھے عمر بھر رہے گا۔ سات سال بعد جب میں نے اپنے پیارے وطن کی دھرتی پر قدم رکھے تو خوشی کے احساس سے میری آنکھوں میں نمی آگئی۔ یہاں بھی مجھے ایک اور مرحلے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طویل اور صبر آزما دور سے گزرنے کے بعد میں اپنے شہر پہنچا تو اپنے آنسو نہ روک سکا۔ میں دیر تک بس اسٹاپ کی انتظار گاہ میں بیٹھ کر روتا رہا۔ راجا نواز کا خیال آیا تو دل میں نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں نے بازار جا کر ایک بڑا سا چاقو خریدا اور راجا نواز کے دفتر کی طرف چل پڑا' اس عہد کے ساتھ کہ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری تباہی اور بربادی کا ذمہ دار وہی ہے' اس نے نہ صرف میرے خاندان کی ہی نہیں بلکہ کئی اور گھروں کی بھی خوشیاں لوٹی ہوں گی' وہ کئی انسانوں کی امنگوں کا قاتل ہے۔ میں جذبات میں آکر انتقام کی آگ میں اندھا ہوگیا تھا۔ مگر میرا انتقام ادھورا رہا' اوپر والے نے خود ہی میرا بدلہ لے لیا تھا۔ اس دفتر میں کوئی اور شخص بیٹھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ تین سال قبل راجا نواز بس کے ایک حادثے کا شکار ہوکر مرچکا تھا۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا اور اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھے قاتل بننے سے بچالیا' وہاں سے واپس آکر دھڑکتے دل کے ساتھ میں گھر کے دروزے پر دستک دی تو دروازہ ایک چھ سات سالہ بچی نے کھولا تو میں یہ سمجھا کہ میری ہی بیٹی ہوگی' میں نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا کر چومنا شروع کردیا تو اس نے گھبرا کر رونا شروع کردیا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر میری بہن گلشن باہر نکلی۔ میں نے بچی کو چھوڑ دیا اور گلشن کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو حیرت بھری آواز

میں چلائی۔

''وسیم بھیا! آپ...... آپ زندہ ہیں...... زندہ ہیں آپ؟''

وہ یہ کہتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کا بھائی وسیم ہی ہوں' اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ مجھے بھی چونکا گئے تھے...... ہم دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے' دونوں کی آنکھیں برسنے لگیں اور گھر کی فضا ہماری سسکیوں سے گونجنے لگی۔

''گلشن بیٹی! باہر کون ہے اور یہ رونے کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں۔'' یہ میری امی کی آواز تھی جو کمرے سے آئی تھی۔ میں نے یہ آواز پہچان لی اور گلشن کو اپنے آپ سے علیحدہ کر کے اس کمرے میں چلا آیا جہاں سے امی کی آواز سنائی دی تھی۔ گلشن بھی میرے ہمراہ چلی آئی۔ میں جاتے ہی امی جان کے قدموں میں گر گیا۔ ایک بار پھر آنسوؤں کا سیلاب میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ گلشن نے امی کو بتایا کہ یہ وسیم بھائی ہیں' یہ زندہ اور صحیح سلامت ہیں' ان کی موت کی خبر جھوٹی تھی۔ امی نے مجھے اپنے قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے مجھے اپنے سینے سے ہٹایا اور چومنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک ہم ماں بیٹا روتے رہے۔ جب دل کا غبار ہلکا ہوا تو اس انکشاف نے مجھے اور بھی دکھی کر ڈالا کہ میری ماں نے میری جدائی کے غم کو سینے سے لگا لیا تھا' جس وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی تھیں اور اُن کی بینائی بھی چلی گئی تھی اور اب وہ صرف چارپائی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

غموں کا ایک اور پہاڑ مجھ پر آن گرا اگر میں پھر بھی زندہ رہا' میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں ہی ان تمام بربادیوں کا ذمہ دار ہوں...... کاش! میں نے دیارِ غیر جانے اور دولت کمانے کا خواب نہ دیکھا ہوتا تو آج رسوائیاں میرا مقدر نہ ہوتیں...... ابھی تک مجھے سیما نظر نہ آئی تھی۔ میری نگاہیں اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ بہن گلشن جان گئی کہ اب میں کس کو تلاش کر رہا ہوں' میرے پوچھنے سے قبل ہی وہ اسی بچی کو پکڑ کر میرے سامنے لے آئی جس نے دروازہ کھولا تھا۔ گلشن اسی بچی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''کرن! ان سے ملو یہ تمہارے ابو ہیں۔'' میرا اندازہ درست نکلا وہ میرا ہی خون تھا وہ میرے ہی جگر کا ٹکڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کرن کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا' اُس کو سینے لگا کے یوں لگا کہ جیسے میری ساری تشنگی مٹ گئی ہو' میری روح سیراب ہو گئی ہو۔

''سیما کہاں ہے؟''

میں نے اچانک ہی گلشن سے پوچھا تو وہ خاموش خاموش سی میرے چہرے کو دیکھنے لگی پریشانی اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئی مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے امی سے پوچھا تو وہ بھی خاموش ہی رہیں۔ میں نے پھر گلشن سے استفسار کیا تو امی کہنے لگیں۔

''گلشن! اسے حقیقت بتا دو۔''

''سیما چلی گئی بھیا...... ہم سب کو چھوڑ کر......''

گلشن کے الفاظ برچھیوں کی مانند میرے دل اور دماغ میں اتر گئے' میں اٹھ کھڑا ہوا اور گلشن کو دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کہاں گئی ہے سیما! مجھے جلدی بتاؤ میں اسے واپس لے کر آؤں گا۔''

گلشن نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بتانے لگی۔

''وسیم بھائی! آپ کے جانے کے بعد آپ کا صرف ایک خط ملا تھا جس میں آپ نے ترکی پہنچنے کی خبر دی تھی۔ اس خط کا جواب ہم نے دے دیا تھا مگر اس کے بعد آپ کی کوئی خبر ہمیں نہ ملی جس وجہ سے ہم بہت ہی پریشان ہو گئے۔ بھابی سیما بھی آپ کی وجہ سے بہت اداس ہو گئیں۔ وہ آپ کو یاد کر کے بہت روتی تھیں اور خاص طور پر جب کرن پیدا ہوئی تو آپ بہت یاد آئے۔ پھر دن گزرنے لگے اور ہماری پریشانیوں اور دکھوں میں اضافہ ہو گیا ہم نے چچا الیاس سے درخواست کی کہ وہ آپ کے بارے میں معلوم کریں۔ ان ہی دنوں اخلاق بھی پاکستان آیا ہوا تھا۔ اسے جب آپ کے متعلق علم ہوا تو اس نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا اور ہمدردی کا ایسا

ڈرامہ رچایا کہ ہم ماضی کو بھول کر اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اس نے امی جان سے بھی اپنی ماضی کی زیادتیوں کی معافی مانگ لی مگر میں اخلاق سے دور ہی رہی' کیونکہ اس نے جو ستم مجھ پر ڈھایا تھا اس کو میں کبھی بھی بھول نہ سکتی تھی۔ مجھے اخلاق کا اس گھر میں آنا پسند نہ تھا مگر سیما بھابی نہ جانے کیوں اس سے بے حد متاثر ہوگئی تھیں اور اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھیں۔ اخلاق نے بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ آپ کی وجہ سے بے حد پریشان ہے اس نے ہماری تسلی کے لیے ترکی اور دیگر ممالک کے سفارت خانوں سے بھی رجوع کیا مگر آپ کے بارے میں کوئی خبر نہ مل سکی۔ میں نے سیما کو بتایا اور سمجھایا کہ اخلاق ہمارا ہمدرد نہیں ہوسکتا مگر وہ نہ مانیں پھر اخلاق کچھ عرصے بعد کویت چلا گیا اور سیما کو تسلی دے گیا کہ وہ خود ترکی جائے گا اور آپ کو تلاش کرے گا۔ کویت جا کر اخلاق نے سیما کے نام خطوط بھی لکھنے شروع کردیے جن کا جواب سیما بھی دیتی رہی۔

سیما آپ کی وجہ سے بے حد پریشان تھی۔ وہ اکثر کرن کو گود میں لے کر روتی رہتی' امی جان کا بھی برا حال تھا اور خود میں اور نصیر بھی بے حد پریشان تھے مگر تقدیر کے آگے بے بس تھے' ہم کچھ بھی نہ کرسکتے تھے سوائے دعائیں مانگنے کے اور کچھ بھی ہمارے بس میں نہ تھا' یوں ہی ایک طویل عرصہ گزر گیا اور اخلاق ایک بار پھر کویت سے واپس آگیا۔ اب اس کا ہمارے گھر آنا جانا بڑھ گیا۔ پھر ایک دن سیما اس کے ساتھ باہر گئی اور واپس نہ آئی بلکہ اس کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ اب اس کا انتظار نہ کیا جائے اس نے اخلاق سے شادی کرلی ہے کیونکہ وسیم کی واپسی کی امید ختم ہوچکی ہے۔ کرن کو میں آپ کے پاس ہی رہنے دے رہی ہوں مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔

سیما کا پیغام سن کر ہمارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ امی نے رو رو کر اپنا سر پیٹ لیا۔ جمیل اور نصیر کو اخلاق اور سیما کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ وہ اخلاق کے گھر گئے اور اسے قانونی کارروائی کی دھمکی دی مگر ان کی کسی بات کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اخلاق کے گھر والوں نے انہیں رسوا کرکے واپس بھیج دیا' جبکہ سیما نے ان سے ملنے سے انکار کردیا۔ ہم نے اپنے طور پر ہر طریقہ سے احتجاج کیا کہ یہ شادی غیر قانونی اور غیر شرعی ہے' یہ شادی نہیں جبر ہے مگر ہماری کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ تھک ہار کر ہم خاموش ہوگئے کیونکہ یہ سزا ہمیں غربت کی ہی مل رہی تھی جسے ہم سہتے رہے۔ پھر سنا کہ کچھ عرصہ بعد سیما بھی کویت چلی گئی' ادھر امی جان چارپائی کی ہو کر رہ گئیں۔ آپ کی جدائی اور سیما کی بے وفائی نے ان کی آنکھوں کا نور بھی چھین لیا۔ جمیل بھائی فوج میں ملازم ہو کر کراچی چلے گئے۔ میں نے امی کو اپنے گھر لے جانا چاہا مگر وہ نہ مانیں تو میں اس گھر میں آگئی۔ تاکہ امی جان کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔

سیما کو کویت گئے ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ ہمیں ایک خط ملا خط جمیل کے نام تھا اور یونان سے آپ کے کسی ساتھی نے لکھا تھا۔ اس خط میں یہ روح فرسا خبر دی تھی کہ آپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا ہے اور آپ کو خدانخواستہ وہاں ہی دفن کردیا گیا ہے۔ آپ کی موت کی جھوٹی خبر نے ایک بار پھر اس گھر میں صف ماتم بچھا دی۔ امی پہلے ہی دکھوں کی ماری ہوئی تھیں آپ کی موت کی خبر نے انہیں اور بھی کمزور اور لاغر کر ڈالا۔ جمیل اور میں بھی بلک بلک کر روئے ہمارا گھر کھنڈر بن گیا' ہر طرف ویرانیوں نے ڈیرے ڈال لیے' ہمارے سینے اور زخمی ہوگئے......

ابھی سیما کے لگائے ہوئے زخم ہی نہ بھرے تھے کہ اوپر سے تقدیر نے اور وار کر ڈالا تھا ہم تو زندگی کی سنسان راہوں پر شمعیں جلائے آپ کا انتظار کر رہے تھے کہ اس خط نے آس اور امید کے تمام دیے بجھا ڈالے' ہمارا آنگن آہوں کی آگ سے بھر گیا...... نہ جانے کیوں بھیا! مجھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ آپ اس دنیا میں نہیں رہے' مجھے یوں لگتا تھا کہ آپ اچانک آجائیں گے اور آج آپ آگئے ہیں تو میرے دل کو قرار مل گیا ہے۔ میں اب آپ کو کہیں نہ جانے دوں گی۔ یہ اوپر والے کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے' کرم ہے جس کا بدلہ ہم کبھی نہ چکا سکیں گے۔'' گلشن یہ سب

بتاتے ہوئے ایک بار پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

سیما کی بے وفائی اور اخلاق کی کمینگی نے میری آنکھوں کو بھی آبشار بنا ڈالا' دکھ اور درد کی کیفیت سے میرا پورا وجود لرزنے لگا۔ پھر بھی میں نے گلشن کو تسلی دی کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا تقدیر نے جو زخم لگائے ہیں ان کو بھرنے کی کوشش کروں گا۔ میں ماں کی خدمت کروں گا تمہارا خیال رکھوں گا۔ مجھے ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا ہے اخلاق نے جو زخم میرے سینے پر لگایا ہے اس کا مرہم بھی تلاش کرنا ہے۔ اس نے اور سیما نے غیر شرعی حرکت کی ہے۔ سیما میری بیوی ہے اسے ایک بار میں اس گھر میں ضرور لاؤں گا اور پھر اسے آزاد کر دوں گا کیونکہ وہ نہایت ہی خود غرض اور احسان فراموش نکلی' اس نے ہمارے احسانوں کا جو بدلہ دیا ہے وہ تمام عمر نہ بھولے گا......

گلشن تو مجھ سے چھپانا چاہتی تھی مگر امی برداشت نہ کر سکیں' انہوں نے بھی سیما اور اخلاق کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگیں کہ سیما اور اخلاق آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ سول لائن میں انہوں نے کوٹھی بنائی ہے۔ اگر تم میں ہمت اور طاقت ہے تو قانونی کارروائی کرو۔ سیما اور اخلاق کی پاکستان میں موجودگی کی خبر سن کر میرا خون کھول اٹھا مگر میں نے پھر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ میں نے امی اور گلشن کو اپنی لہو لہو داستان سنائی تو وہ دیر تک روتی رہیں۔ میں اسی وقت سیما تک پہنچنا چاہتا تھا مگر امی اور گلشن نے مجھے نہ جانے دیا اور کہنے لگیں کہ آج تم آرام کرو کل سیما سے مل لینا۔ مجبوراً مجھے امی اور گلشن کی بات ماننی پڑی۔ کچھ ہی دیر میں نصیر اور اس کے گھر والے آ گئے۔ وہ بھی اس بات پر حیران تھے کہ میں زندہ ہوں اور میری موت کی خبر من گھڑت تھی۔ رات دیر تک ہم باتیں کرتے رہے' سیما اور اخلاق کو برا بھلا کہتے رہے۔

اگلے دن میں سیما کے پاس جانے کی بجائے سیما کے باپ کو تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تا کہ اسے ماضی کے تمام حالات بتا کر اس سے مدد حاصل کر سکوں۔ سیما نے مجھ سے پہلی ملاقات میں اپنے گھر کا تھوڑا بہت خدوخال بتایا تھا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میں اس محلہ میں پہنچ گیا جہاں سیما کا باپ رہتا تھا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ سیما کا باپ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ سیما کے بھائی اکرم سے میری ملاقات ہو گئی۔ اکرم اپنے باپ کی ورثہ میں چھوڑی ہوئی کریانہ کی دکان چلا رہا تھا۔ میں نے لوگوں کی باتوں اور اس سے مل کر اندازہ لگایا کہ اکرم بھی نہ صرف اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے بلکہ وہ اس سے دو قدم آگے ہے۔ کریانہ کی دکان تو محض بہانہ ہے اس کا اصل کاروبار تو نشہ فروخت کرنا ہے۔ محلے والے اس سے نفرت کرتے تھے اور وہ اپنے آپ کو بدمعاش سمجھتا تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ اس کے ہاتھ کافی لمبے ہیں' اسی وجہ سے وہ یہ دھندا دیدہ دلیری سے چلا رہا ہے۔ پہلے تو وہ مجھے بھی کوئی گاہک ہی سمجھا لیکن جب میں نے اس کی بہن سیما کا نام لیا تو وہ چونک پڑا اور بولا۔

"وہ تو بہت عرصہ قبل مر گئی تھی...... مگر تم کون ہو اور اسے کیسے جانتے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ سیما زندہ ہے۔ میں نے سیما کی شادی والی رات سے لے کر اس سے اپنی شادی تک کے تمام حالات اسے بتائے تو اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور کہنے لگا۔

"آپ کا احسان میں تمام عمر نہ بھلا پاؤں گا' مجھے بتائیں کہ سیما باجی کہاں ہیں' مجھے جلدی سے اس کے پاس لے چلیں۔ میرا اس بھری دنیا میں کوئی نہ تھا' میں بے آسرا تھا مگر اب مجھے میرا خاندان' میری پہچان مل گئی ہے۔ اکرم واقعی بہت خوش تھا' بالکل ایسے جیسے کسی بچے کو اس کا من پسند کھلونا مل گیا ہو۔ اکرم جلد از جلد سیما سے ملنا چاہتا تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ دونوں بہن بھائی اتنی جلدی مل جائیں اور پھر میں نے اکرم کو ابھی مکمل کہانی تو سنائی ہی نہ تھی۔ اس کی بے تابی دیکھ کر میں نے اس سے کہا۔

"صبر سے کام لو اکرم! تمہاری بہن اسی شہر میں ہے اس لیے اس سے ملنے میں کوئی پریشانی نہ ہو گی مگر ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی میری پوری بات تو سن

لو۔“

اور پھر میں نے اسے دیارِ غیر جانے‘ وہاں پر قید ہو جانے اور سیما اور اخلاق کی غیر شرعی شادی تک کے تمام حالات بتائے اور کہا کہ میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم سیما کی واپسی میں میری مدد کرو۔ اکرم کی خوشی کا فور ہو گئی کہنے لگا۔

”میں اخلاق سے نمٹ لوں گا۔ میں سیما کو اس سے آزاد کراؤں گا۔ آپ مجھے اُن کا پتہ دے دیں پھر دیکھنا میں اخلاق کا کیا حشر کرتا ہوں۔ میں اُس کو اس قدر خوار کروں گا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ میرا نام اکرم ہے‘ میرے ساتھی ایک اشارے پر اخلاق کا کام تمام کر دیں گے۔“ اکرم جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کیا اور کہا کہ فی الحال میں اپنے طور پر سیما اور اخلاق سے بات کروں گا‘ ممکن ہے کہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے‘ اگر کامیابی نہ ہوئی تو پھر میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا اور تمہاری خدمات حاصل کروں گا۔“

میں واپس چلا آیا۔ اکرم سے مل کر میری ہمت بندھ گئی کہ یہ شخص میرا ساتھ ضرور دے گا۔ میں نے اکرم کی بول چال سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مرنے مارنے اور لڑائی جھگڑا کرنے میں ماہر ہے۔ اس کی تصدیق اُس کی تلاش کے دوران محلّے والوں سے بھی ہو گئی تھی۔ گھر آ کر میں نے امی اور گلشن کو اکرم کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کرے گا اور امید ہے کہ سیما واپس اس گھر میں آ جائے گی۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں سیما کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے کوئی مشکل نہ ہوئی۔ امی نے میری کچھ رہنمائی کر دی تھی۔ میری دستک پر دروازہ سیما نے ہی کھولا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی۔

”مجھے پہچانا؟“ میرا لہجہ طنزیہ تھا۔ وہ گنگ رہی تو میں نے کہا۔

”تجھ سے میرا انتظار نہ ہو سکا...... کیا جلدی تھی دوسری شادی کرنے کی اور وہ بھی میرے دشمن سے...... اس شخص سے جس نے میری بہن کو رسوا کیا کیسی عورت ہو تم...... کیسی ماں ہو تم؟ اتنی جلدی اپنا ماضی بھول گئی ہو...... میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا‘ میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں کیونکہ تم میری بیوی ہو۔“

سیما کا جسم لرزنے لگا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس نے دروازے کا سہارا لیا تو میں اندر داخل ہو گیا‘ میں وحشیانہ انداز میں اس کے سجے سجائے ڈرائنگ روم کو دیکھنے لگا‘ میں نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں...... بھلا یہ عیش تمہیں میرے گھر میں کیسے میسر آ سکتے تھے اخلاق مجھ سے زیادہ امیر اور مالدار ہے‘ تم بھی دولت ہی کی پجارن نکلیں۔“

”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ اس نے کپکپاتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ وہ بھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی۔

”اداکاری مت کرو‘ اب تمہاری اداکاری مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی۔ کیا تمہیں میرے خطوط نہیں ملے؟“

”نہیں وسیم! تمہارا کوئی خط مجھے نہیں ملا...... تم یہ تو بتاؤ کہ تم اتنا عرصہ کہاں رہے؟“

وہ آپ سے تم پر اتر آئی تھی جو مجھے بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں نے غصے کے عالم میں اسے سب کچھ بتایا کہ میں نے سات سال کا عرصہ کیسے گزارا اور جب یہاں پہنچا تو تمہاری بے وفائی نے مجھے جیتے جی مار ڈالا۔ اگر تم میرا انتظار نہیں کر سکتی تھیں تو میرے بھائی جمیل سے ناتا جوڑ لیا ہوتا‘ میرے دشمن کو اپنا شریکِ سفر بنا کر تم نے ستم کے جو پہاڑ مجھ پر توڑے ہیں انہیں بھلا میں کیسے برداشت کر پاؤں گا؟ تم اتنی خودغرض ہو کہ اپنے آرام اور سکھ کی خاطر تم نے اپنی بیٹی‘ اپنے خون کو اپنے آپ سے جدا کر دیا۔ کرن سے جدائی تم نے کیسے گوارہ کر لی؟ جی چاہتا ہے کہ اس جرم کی پاداش میں تمہارا گلا دبا دوں...... کیا میرے احسانوں کا یہی صلہ ہے جو تم نے دیا ہے؟ یاد رکھو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تمہاری اور اخلاق کی شادی غیر قانونی ہے۔ میں عدالت سے رجوع کروں

گا اور تمہیں واپس حاصل کر کے رہوں گا۔''

''اخلاق کہاں ہے؟'' سب کچھ بتا کر میں نے پوچھا۔

''وہ بازار گئے ہوئے ہیں ابھی آتے ہی ہوں گے...... مگر وسیم! اب تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تم نے جو احسان مجھ پر کیا تھا میں وہ کبھی نہ بھولوں گی مگر میں کیا کرتی' میں نے تمہارا انتظار کیا' تمہاری یاد اور انتظار میں راتیں رو رو کر اور جاگ جاگ کر گزاریں مگر نہ تم آئے اور نہ ہی کوئی پیغام ملا' گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ محلہ کے مرد مجھے ہوس بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ جو بھی ہمدرد بن کر آیا اُس کی آنکھوں میں' میں نے دعوت عیش ہی دیکھی۔ ایسے عالم میں اخلاق نے ماضی میں ہونے والی زیادتیوں کی معذرت کی اور تمہاری تلاش میں میری ہر ممکن مدد کی۔ اس نے کبھی بھی گری ہوئی حرکت نہ کی۔ جب تمہاری تلاش میں ہمیں ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو تب اخلاق نے مجھے شادی کی پیش کش کی' اُس نے بتایا کہ میں نے عدالت سے معلومات کی ہیں۔ شوہر کی اتنے عرصے کی گمشدگی کے بعد عورت دوسری شادی کر سکتی ہے۔ میں نے اسی میں اپنا تحفظ جانا اور اخلاق سے شادی کر لی۔ کرن کو اخلاق اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے مجھے اس کی بات ماننی ہی پڑی۔''

یہ بات سن کر مجھے غصہ آ گیا تھا' اتنے میں اخلاق آ گیا اور اُسے دیکھ کر میری رگیں غصے سے تن گئیں۔ اخلاق نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں مگر پھر جلد ہی وہ سنبھل گیا اور سیما کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تم نے اسے گھر میں کیوں داخل ہونے دیا؟''

سیما سے کوئی جواب نہ بن پایا تو اخلاق مجھ سے مخاطب ہوا۔

''وسیم! تم زندہ ہو' یقین نہیں آتا...... خوب ڈرامہ رچایا تم نے بھی' اپنے گھر والوں کو بے سہارا اور بے آسرا کر کے تم یوں غائب ہوئے کہ تلاش کے باوجود تمہارا سراغ نہ ملا...... میں نے ماضی کی تلخیاں بھلا کر تمہارے گھر والوں کی مدد کی...... ایسے میں اگر میں نے سیما کو سہارا دیا ہے تو یہ کوئی جرم تو نہیں......''

اخلاق کے الفاظ میرے جسم میں تیر کی مانند اتر گئے' میری برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا اور کہا۔

''میں نے جب سیما کو طلاق ہی نہیں دی تو تم نے اس سے شادی کیسے کر لی؟ تم دونوں خدا کے بھی مجرم ہو اور میں بھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔''

اخلاق نے دھکا دے کر مجھے علیحدہ کر دیا اور کہنے لگا۔

''وسیم! اپنی اوقات میں رہو...... میں نے عدالت سے فیصلہ لے کر سیما سے شادی کی ہے' جس کا میرے پاس تحریری ثبوت موجود ہے۔''

''طلاق کا حق صرف اور صرف شوہر کو حاصل ہے اور یہ قانونِ قدرت بھی ہے...... تم نے جرم کیا ہے...... قانون کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تم دونوں کو اس جرم کی سزا دے۔ فیصلہ وہی ہے جو ہمارے مذہب کا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم سیما کو آزاد کر دو۔ وہ میری بیوی ہے اور میں اس کا قانونی اور حقیقی شوہر ہوں۔''

''ہم نے کوئی جرم اور گناہ نہیں کیا۔ میں اور سیما قانونی میاں بیوی ہیں' ہم نے عدالت میں جا کر شادی کی ہے۔''

اخلاق نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی مگر میں اُس کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ میں نے انہیں دھمکی دی کہ میں عالم دین سے فتویٰ لے کر آؤں گا اور تمہاری شادی کو عدالت میں چیلنج کروں گا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ گھر آ کر میں امی سے لپٹ کر رونے لگا کہ میری وفاؤں کا صلہ ایسا تو نہیں ملنا چاہیے تھا۔ جو سیما نے دیا ہے۔ میں نے امی سے فتویٰ لینے کے بارے میں بات کی تو وہ رضامند ہوگئیں۔ انہوں نے ایک بہت ہی بڑے عالم دین کا نام مجھے بتایا کہ میں ان سے ملوں تو وہ میری اس سلسلے میں ضرور مدد کریں گے۔ اگلے دن میں ان عالم دین سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے انہیں تمام واقعہ بتایا تو وہ کہنے لگے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر کسی

عورت کا شوہر لاپتہ ہو جائے تو وہ اس وقت تک اپنے شوہر کا انتظار کرے جب تک یہ یقین ہو جائے کہ اس کا شوہر طبعی عمر تک پہنچ کر مر چکا ہو گا۔ میں نے عالم دین سے یہ فتویٰ تحریری طور پر حاصل کر لیا اور اخلاق کے گھر جا پہنچا۔ میں نے اسے فتویٰ دکھایا تو اس نے پڑھنے کے بعد کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا بلکہ اس نے بھی کسی اور عالم دین کا فتویٰ نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا جس میں لکھا تھا کہ اگر کسی عورت کا شوہر لاپتہ ہو جائے اور اس کی کوئی خبر نہ ملے تو ایک مخصوص مدت کے بعد عورت عدالت سے تنسیخ نکاح کے لیے رجوع کر سکتی ہے اور عدالت نکاح تنسیخ کر سکتی ہے۔ اس کے بعد اگر عورت چاہے تو وہ دوسری شادی کر سکتی ہے۔

فتویٰ پڑھ کر مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا کہ یہ فتویٰ غلط ہے۔ اخلاق بھی نہ مانا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا' میں نے تنگ آ کر نصیر سے کچھ رقم ادھار لے کر عدالت سے رجوع کیا مگر دولت جیت گئی اور میں ہار گیا۔ میں خالی ہاتھ گھر واپس لوٹ آیا۔ سیما مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی' مجھے یوں لگا جیسے روشنی کا دیوتا اپنی آب وتاب کھو بیٹھا ہے اور ہر سو اندھیرا چھا گیا ہے یا پھر کسی نے میری بینائی سلب کر لی ہے۔ سیما کی بے وفائی کے تیز و تند طوفان نے مجھے جڑوں سے اکھاڑ پھینکا۔ اُس نے عدالت میں بیان دیتے وقت میری بھرپور مخالفت اور کردار کشی کی اور اخلاق کو فرشتہ صفت انسان ثابت کیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ جو میرے احسانوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اتنی جلدی آنکھیں پھیر لے گی مگر یہ حقیقت تھی کہ سیما بھی دولت دیکھ کر اپنی آنکھوں کی وہ بینائی گنوا بیٹھی تھی جو برے اور بھلے کی تمیز کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ دل اور دماغ میں بدگمانی اور نفرت کا میل جم جائے تو آئینے کی طرح شفاف دل بھی گندی اور آلودہ سوچوں کا گڑھ بن جاتے ہیں' ایک جان اور دو قالب کہلانے والوں کے درمیان بھی فاصلوں کی خلیج بنا دیتے ہیں اور پھر کبھی ان کو ایک نہیں ہونے دیتے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اکرم سے رابطہ کیا اور اس سے التجا کی کہ میری مدد کرے۔ اکرم نے مجھے تسلی دی کہ میں سیما سے بات کروں گا۔ میں نے اسے سیما کا ایڈریس دے دیا۔ اکرم کے تیور تو یہی بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کر گزرے گا مگر کافی دن گزر گئے اور اکرم کی طرف سے کوئی رابطہ نہ ہوا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ اخلاق اور سیما واپس کویت چلے گئے ہیں۔ میں اکرم کے پاس گیا تو دیکھا کہ اُس کے ٹھاٹھ ہی نرالے تھے۔ کریانہ کی دکان کی جگہ جنرل اسٹور بن گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اکرم نے کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا اور میرے کچھ پوچھنے سے قبل ہی کہنے لگا۔

''وسیم صاحب' آج کے بعد آپ سیما اور اخلاق کو بھول جائیں اور میرے پاس آنے کی بھی زحمت نہ کرنا۔ میں اخلاق اور سیما سے مل کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ دونوں حق پر ہیں۔ وہ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں اس لیے آپ اُن کی پُرسکون اور خوشیوں بھری زندگی میں مداخلت کر کے زہر مت گھولیں۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

میں نے جو کچھ سوچ کر اکرم سے رابطہ کیا تھا وہ سب کچھ اس کے الٹ ہو گیا' میں جان گیا کہ اکرم کو اخلاق نے رقم دے کر اس کا منہ بند کر دیا ہے کہ کیونکہ ایسے لوگ تو صرف اور صرف دولت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اکرم نے بھی موقع غنیمت جانا اور اپنی بہن اور بہنوئی سے سمجھوتہ کر لیا۔ میں ایک بار پھر ہار گیا' اخلاق اور سیما جیت گئے بلکہ پیسہ جیت گیا۔

یہ روپیہ پیسہ بھی کیا چیز ہے اس کی جھنکار مجھ جیسے غریبوں کے لیے سانپ کی پھنکار سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ اس کی چمک واقعی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے بھائی بھائی کا دشمن' بیٹا باپ کا قاتل اور ساس بہو کی دشمن بن جاتی ہے' اس کو حاصل کرنے کی خاطر عزتیں نیلام ہو جاتی ہیں' ضمیر بک جاتے ہیں' لوگ اس کی خاطر اپنے ماں باپ اور اولاد بدل ڈالتے ہیں۔ میں غریب تھا اس لیے میرا سب کچھ لوٹ لیا گیا۔ میرا چین' صبر اور قرار سب چھن گئے۔ میں جیون کی پگڈنڈی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر لڑکھڑانے لگا۔ غربت کی گود میں پلنے والی

اولاد کا مقدر صرف امید اور انتظار سے عبارت ہوتا ہے وہ انتظار کی اسی پگڈنڈی پر چلتی رہتی ہے جس کا اختتام مایوسی کے اندھیرے جنگل میں ہوتا ہے۔ میں بھی ہر طرف سے مایوس ہو گیا‘ میں نے سیما کو بھلا دیا اور اپنی تمام تر توجہ اپنی بیٹی کرن کو دینی شروع کر دی۔

میں نے ملازمت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ نصیر نے پھر میری مدد کی ڈھارس بندھائی اور ایک سیٹھ کی ٹیکسی دلا دی۔ میں نے اب دن رات ٹیکسی چلانی شروع کر دی۔ کرن کو میں نے بہت ہی اچھے اسکول میں داخل کر دیا اور اپنی تمام تر چاہت اور محبت اس کے لیے وقف کر دی۔ کرن بھی اب مجھ سے مانوس ہو گئی تھی۔ وہ رات کو میرے پاس سونے لگی۔ حالات ذرا بہتر ہوئے تو امی اور گلشن نے زور دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں‘ مگر میں نے تو شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور اپنا آپ کرن کے لیے وقف کر دیا تھا‘ لہٰذا وہ خاموش ہو گئیں‘ پھر کچھ عرصہ بعد امی بھی خالق حقیقی سے جا ملیں‘ تو میں نے وہ مکان فروخت کر ڈالا اور نصیر کے گھر کے قریب ہی ایک مکان لے لیا تا کہ مجھے اور کرن کو پریشانی نہ ہو۔ کھانا ہم نصیر کے گھر سے ہی کھا لیتے تھے۔ ایک بار پھر نصیر اور گلشن نے مجھے شادی کرنے کو کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں نے نصیر کی بہنوں کی شادیاں کرادیں اور وہ سب اپنے اپنے گھروں میں خوشحال زندگی گزارنے لگیں۔ نصیر اور گلشن بھی تین بچوں کے والدین بن گئے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا منیر کرن سے بڑا تھا۔ ہم نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ کرن اور منیر جب جوان ہوں گے تو ہم ان کی شادی کر دیں گے۔ اب میری تمام امیدیں کرن سے وابستہ تھیں۔ وہ بھی بہت ہی تابعدار تھی‘ کوئی ضد نہ کوئی فرمائش‘ پڑھائی میں بھی وہ بہت اچھی جا رہی تھی۔ میں اس سے بہت خوش تھا اور اس کی ہر خواہش لمحوں میں پوری کر دیتا تھا۔ اس دوران ہم نے جمیل کی بھی شادی کر دی تو وہ اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ میں اب کام نہ کروں اور اس کے پاس ہی رہوں مگر میں اُس پر بوجھ نہ بننا چاہتا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا اور پھر یونہی کئی سال بیت گئے۔

☆......☆......☆

کرن نے ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس نے قد کاٹھ اپنی ماں جیسا نکالا تھا وہ ہو بہو سیما کی کاپی تھی۔ اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لہٰذا اس نے بی اے میں داخلہ لے لیا اور میں آہستہ آہستہ اس کا جہیز تیار کرنے لگا۔ گلشن بھی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ کرن کو میں نے اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا بلکہ اس موضوع پر کبھی ہماری بات ہی نہ ہوئی تھی۔ میں خود بھی اس مسئلہ کو چھیڑنا ہی نہ چاہتا تھا‘ میں کرن کو اخلاق اور سیما کے سائے سے دور رکھنا چاہتا تھا مگر گلشن کی زبانی کرن سب کچھ جان گئی تھی کہ اس کی ماں نے اس پر اور اس کے باپ پر کیا ستم ڈھایا تھا۔ میں نے گلشن کو منع بھی کیا تھا کہ وہ کرن کو سیما کے بارے میں کچھ نہ بتائے مگر گلشن چپ نہ رہ سکی اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔ کرن دیگر لوگوں سے تو اپنی ماں کا ذکر کبھی کبھی کرتی تھی مگر مجھ سے کبھی اس معاملہ میں اس نے کوئی بات نہ کی تھی اس لیے میں مطمئن تھا کہ وہ میری نہایت ہی فرمانبردار اور محبت کرنے والی بیٹی ہے۔ اس نے کبھی میرے سامنے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی اور میں بھی اسی وجہ سے اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا‘ اسے اپنی زندگی کی تمام خوشیوں کا محور سمجھتا تھا کہ وہی اب میری ماضی کی چاہت اور محبت کی واحد نشانی تھی۔ میں نے کرن کو پھولوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ اب دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کرن اپنے گھر کی ہو جائے اور میں ایک فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ میں نے اب اسے باپ کا ہی نہیں‘ ماں کا پیار بھی دیا اور مجھ سے اسے کوئی شکوہ اور شکایت نہ تھی۔ وہ بھی میری بھرپور خدمت کرتی تھی مگر یہ وقت کا سمندر بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اسی وقت نے ایک کروٹ لی اور عراق اور کویت میں جنگ شروع ہوئی تو کویت سے غیر ملکیوں کا انخلاء شروع ہو گیا۔ پاکستانی وطن واپس آنا شروع ہو گئے۔ سیما اور اخلاق بھی واپس آ گئے۔

ان کی واپسی کی خبر سن کر میرے زخم ایک بار پھر

جل اٹھے۔ کویت کے سانحہ نے جہاں لاکھوں ہم وطنوں کو روزگار سے محروم کردیا وہاں میرے لیے بھی بربادیوں کا پیغام لایا۔ میں نے اپنے طور پر اب حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا اور اخلاق اور سیما کو قصہٗ پارینہ سمجھ کر بھلا بیٹھا تھا۔ میں تو اب صرف کرن کی خاطر زندہ تھا بلکہ اسے دیکھ کر جی رہا تھا' مجھے اور کسی سے کوئی غرض نہ تھی مگر ایک روز سیما میری غیر موجودگی میں میرا گھر تلاش کرکے میرے گھر آگئی۔ اس دن کرن بھی گھر پر ہی تھی۔ وہ کرن کے لیے ڈھیروں تحفے لائی تھی۔ میں جب شام ڈھلے گھر واپس آیا تو سیما کی اپنے گھر میں آمد کا سن کر غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔ میں نے کرن کو زندگی میں پہلی بار ڈانٹا اور اسے تاکید کہ آئندہ وہ سیما کو گھر میں داخل نہ ہونے دے اور نہ ہی اس سے ملے' پھر میں نے وہ تحفے اٹھائے اور ٹیکسی لے کر سیما کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھی تو کچھ ہی دیر بعد اخلاق باہر نکلا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم دونوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے تحفوں والا بیگ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور واپس چلا آیا۔ میں گھر پہنچا تو کرن چارپائی پر اوندھے منہ پڑی تکیہ پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔ مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا اس کو اٹھایا دلاسہ دیا اور اس سے معافی مانگی کہ آئندہ میں تمہیں کبھی نہ ڈانٹوں گا پھر سمجھایا کہ سیما کا ذکر سن کر میرا جذباتی ہوجانا قدرتی امر ہے۔ وہ میری ہی نہیں تمہاری بھی دشمن ہے۔ اس نے میرے ساتھ بے وفائی کی اور تمہیں بچپن میں ہی ممتا کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں سے محروم کردیا۔ وہ تمہیں بے آسرا چھوڑ کر چلی گئی' اس نے اس وقت تمہارا احساس نہ کیا کہ تم بن ماں کے کیسے جیو گی' کیسے پروان چڑھو گی؟ کیسی ماں ہے وہ جو جوانی اور دولت کے نشہ میں یہ بھول گئی کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے جو اس کا اپنا خون ہے' جسے اس کی توجہ اور گود کی ضرورت ہے' ماں تو اس دنیا میں اولاد کے لیے راحت اور چین ہوتی ہے' یہ وہی ہستی ہے جس کے پاؤں تلے جنت ہے لیکن اُس نے تم سے

غزل

سلگتی شام شب سرد کے دباؤ میں ہے
بدن ہوا کا ابھی برف کے الاؤ میں ہے

سفینہ عشق کا طوفان ہجر میں ہوا گم
ہماری آنکھ کا دریا بہت بہاؤ میں ہے

ابھی تو جاگا نہیں کونپلوں میں خواب نمو
شکار کے لیے چشم خزاں چناؤ میں ہے

کوئی ستارہ' کوئی دیپ' کوئی جگنو ہو
دیارِ شام کی ظلمت بہت تناؤ میں ہے

بڑھی ہیں منزلیں جس کی مسافتوں کے لیے
سفر تمام ہے وہ قافلہ پڑاؤ میں ہے

اگرچہ وقت کی ٹھوکر میں ہے وجود مرا
مری انا ہے کہ مصروف رکھ رکھاؤ میں ہے

پروین حیدر

یہ تمام نعمتیں چھین لیں' اور اب جب تم بڑی اور سمجھدار ہوگئی ہو تو وہ اپنا حق جتانے آگئی ہے۔ اس کا اب تم پر کوئی حق نہیں' تم صرف اور صرف میری بیٹی ہو' میری جان ہو' میری آن ہو' میری زندگی ہو' میری آس اور امید ہو...... میں نے کرن کو گلے سے لگالیا' اسے ڈھیروں پیار کیا مگر وہ پھر بھی سسکتی رہی۔ اس نے پہلی بار میرے سامنے زبان کھولی اور کہنے لگی۔

''ابو...... وہ جیسی بھی ہے میری ماں تو ہے' مجھے جنم تو اسی نے دیا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ وہ اس غلطی کی معافی مانگنے آئی تھی' وہ صرف اتنا حق مانگنے آئی تھی کہ کبھی کبھار مجھ سے ملنے آجایا کرے...... ابو! آج برسوں بعد ماں کی گود میں سر رکھ کر جو سکون مجھے ملا ہے ایسے سکون کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا' اس لیے ابو! آپ اُن کو معاف کردیں اور یہ اجازت دے دیں کہ وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے یہاں آجایا کریں...... نہ جانے کیوں اپنی ماں سے مل کر مجھے یہ احساس ہورہا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔''

یہ سب کچھ کہہ کر کرن نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے میں نے کرن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اُن کو چومنا شروع کردیا' ساتھ ہی میری آنکھیں بھی بہنے لگیں۔ کرن مجھے کس دوراہے پر لے آئی تھی' اس نے مجھے کس امتحان مین ڈال دیا...... اب میں کیا کروں' کون سا قدم اٹھاؤں؟ ایک طرف تو سیما ہے جس نے میرا گھر اجاڑ دیا اور دوسری طرف بیٹی ہے جو مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ آج میں نے اس کی بات نہ مانی' اس کے جذبات کا بھرم نہ رکھا تو وہ کیا سمجھے گی؟ یہی کہ میں اس کا باپ ہوتے ہوئے بھی اس سے مصنوعی محبت کا ڈھونگ رچاتا رہا ہوں۔ مگر سیما کو میں بھلا کیسے معاف کردوں اور اس کو اس گھر میں کیسے داخل ہونے دوں۔ جسے وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی؟ میں نے کرن کو ایک بار پھر سمجھایا' اُسے آئینہ دکھایا کہ ماں ایسی تو نہیں ہوتی جیسی تمہاری ماں ہے۔ اس نے برسوں تمہیں بھلائے رکھا اور اب کیوں تم اسے یاد آگئی ہو؟ وہ ماں ہے' ممتا کا جذبہ رکھنے کی دعویدار ہے مگر ممتا اس جیسی نہیں ہوتی۔ ممتا تو وہ شے ہے جو اپنی اولاد کے لیے بڑے سے بڑے ستم ہنس کر سہہ جاتی ہے' بڑے بڑے طوفانوں سے گزر جاتی ہے' اونچی اونچی فصیلوں سے ٹکرا جاتی ہے' مسکراتی ہوئی آگ کا سمندر پار کرجاتی ہے۔ اس کا نام لو تو دل میں ٹھنڈک' وجود میں اک سرور اور ذہن میں ایک پاک اور مقدس وجود ابھرتا ہے جس کی آغوش کا تصور پاکیزہ ہوتا ہے اور جس کی دعاؤں کا معیار اٹوٹ ہوتا ہے مگر تمہاری ماں ان تمام خوبیوں سے عاری ہے۔ وہ ماں نہیں' ماں کے نام پر ایک دھبہ ہے اس لیے میں اسے اس گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ ہی تم آئندہ اُس سے ملو گی۔

میں اپنا فیصلہ سنا کر مطمئن ہو کر کھانا کھا کر سوگیا۔

صبح دیکھا تو کرن بخار میں جل رہی تھی' اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں لگتا تھا کہ وہ ساری رات سو نہیں سکی اور روتی رہی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا' دل پر رکھی ہوئی پتھر کی چٹان پگھل گئی۔ میں کرن کو غم زدہ نہ دیکھنا چاہتا تھا' وہ ہمیشہ مسکراتی رہے یہ ہی میری تمنا تھی۔ میں نے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا دونوں کے ہاتھوں مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے سیما کو اس گھر میں آنے اور کرن سے ملنے کی اجازت دے دی مگر ساتھ ہی یہ پابندی بھی لگادی کہ سیما میری غیر موجودگی میں ہی اس گھر میں آسکتی ہے۔

کرن تو یوں خوش ہوگئی جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو مگر میرے دل پر برچھیاں چل رہی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کرن گریجویشن کرے گی تو میں اس کی شادی منیر سے کردوں گا اور شادی کے بعد وہ ماں کو کسی حد تک ضرور بھول جائے گی' یہی سوچ کر میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور اسے سیما سے ملنے کی اجازت دے دی مگر یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔

سیما ایک دو بار میرے گھر آئی اور پھر اس نے خود ہی یہ سلسلہ منقطع کردیا' اب کرن اپنی ماں کو ملنے اس کے گھر جانے لگی۔ کالج سے چھٹی ہوتی تو سیما

گاڑی بھیج کر کرن کو گھر بلوالیتی اور شام کو اسے میرے گھر پہنچا دیا جاتا۔ مجھے کرن کا وہاں جانا بہت ہی برا لگا میں نے کرن کو منع کیا مگر وہ نہیں مانی۔ ایک بار پھر اپنے جذبات اور احساسات کا خون کرنا پڑا' جی چاہتا تھا کہ کرن پر سختی کروں اور اسے ان لوگوں سے نہ ملنے دوں مگر میری اس بے پناہ محبت میرے ارادوں کے آگے دیوار بن جاتی۔ میں خاموش ہو گیا اور کرن نے بھی میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور ایک مرتبہ جب وہ رات کو بھی سیما کے پاس رک گئی تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا' میرا ہاتھ کرن پر اٹھ گیا اور میں نے اسے منع کر دیا کہ آئندہ وہ سیما کا نام بھی زبان پر نہ لائے' مگر بعد میں میں نے خود ہی اس سے معذرت کر لی اور اسے سیما سے ملنے اور کبھی کبھار اس کے گھر جانے اور رہنے کی اجازت بھی دے دی۔ میں یہ سب کچھ مجبوری کے عالم میں کر رہا تھا۔ دوسری جانب کرن کے امتحان نزدیک تھے اور کرن کو بھی معلوم تھا کہ بی اے کا امتحان دینے کے بعد اس کی شادی ہو جائے گی۔ اسے منیر کے ساتھ شادی کرنے پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا' کرن کی زبانی ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کی ملاقات اس کے ماموں اکرم سے بھی ہوئی تھی اور اب وہ مستقل طور پر اخلاق اور سیما کے ساتھ رہنے لگا ہے۔

☆......☆......☆

کرن کا بی اے کا امتحان ختم ہو گیا تو ہم نے کرن اور منیر کی شادی کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی کہ ایک دن کرن اپنی ماں سے ملنے گئی اور واپس نہ آئی۔ اگلا دن بھی گزر گیا مگر کرن واپس نہ آئی تو میں سیما کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ کرن کو واپس لے آؤں۔ وہاں میرا سامنا سیما سے ہوا۔ میں نے کہا کہ کرن کو بھیج دو' میں اسے لینے آیا ہوں۔

''کرن اب تمہارے گھر نہیں جائے گی۔'' سیما نے رعب دار آواز میں کہا۔

''وہ میری بیٹی ہے' میں نے اسے خون جگر دے کر پروان چڑھایا ہے...... اس کی شادی ہونے والی ہے اس لیے اسے بھیج دو ورنہ میں حد سے بڑھ جاؤں گا۔''

''وہ تمہاری ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے مجھے اس کا مستقبل عزیز ہے...... رہی شادی' تو شادی تو اس کی کل ہی ڈاکٹر جواد سے ہو گئی ہے اور اب وہ اپنے گھر کی ہو گئی ہے لہٰذا اب تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

سیما کا جواب سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی میں ایسا ہونے دوں گا۔ کرن میرے بھانجے منیر کی منگیتر ہے اور اس کی شادی اسی سے ہو گی۔ اگر تم لوگوں نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو میں تم سے نمٹ لوں گا۔ میرے شور کی آواز سن کر اخلاق اور اکرم نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ پڑوس کے لوگ بھی تماشہ دیکھنے لگے۔ میں مسلسل شور مچا رہا تھا اور کرن کو پکار رہا تھا۔ محلے والوں کو اخلاق اور اکرم نے بتایا کہ یہ شخص پاگل ہے اور محلہ والوں نے بھی شاید مجھے پاگل ہی سمجھ لیا۔ میری تمام امیدیں دم توڑ گئیں' کسی سے بھی ہمدردی اور مدد کی امید نہ رہی۔ میں خالی ہاتھ واپس گھر لوٹ آیا ایک زندہ لاش بن کر...... نصیر اور گلشن بھی پریشان ہو گئے کہ اچانک یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہو گیا؟ وہ الزام مجھے ہی دینے لگے کہ میں نے ہی کرن کو ڈھیل دی تو یہ سب کچھ ہوا۔ میں نڈھال سا ہو کر چارپائی پر گر گیا اور سوچنے لگا کہ اخلاق اور سیما آخر مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں اور کب تک دیتے رہیں گے؟ انہوں نے کرن کو بھی مجھ سے چھین لیا اور یہ ایسا غم ہے جو میں تمام عمر نہ بھلا پاؤں گا۔

اگلے دن میں پھر اخلاق اور سیما کے گھر چلا گیا اور ان سے درخواست کی کہ میری بیٹی سے مجھے ملا دیں مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میں نے اور نصیر نے فیصلہ کیا کہ ہم اس معاملے میں عدالت سے رجوع کریں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ امیر اور غریب کی جنگ میں ہار ہمیشہ غریب کی ہی ہوتی ہے ہم نے اخلاق' سیما اور ڈاکٹر جواد کے خلاف کیس کر دیا۔ کرن بھی عدالت

میں پیش ہوئی۔ اس نے بیان دیا کہ میں نے اپنی مرضی سے جواد سے شادی کی ہے۔ میں نے عدالت میں شور مچایا، واویلا کیا مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور اخلاق اور سیما کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر دیا۔ نصیر اور گلشن کے لیے بھی غیرت کا مقام تھا اس لیے انہوں نے میری بھرپور مدد کی۔ جمیل کو پتہ چلا تو وہ چلا آیا ہم سب ایک ہو گئے مگر پھر بھی ہم کویت سے لائی ہوئی بے پناہ دولت کا مقابلہ نہ کر سکے یا شاید میرے مقدر میں ہی مات لکھی تھی۔

میں ناکامیوں اور مایوسیوں کی سلوں تلے دبتا چلا گیا۔ میں رویا، تڑپا اور گڑگڑا کر اپنے اوپر والے سے فریاد کی کہ میں تیرا ہی بندہ ہوں، بے گناہ اور بے بس ہوں۔ آج تیرے ہی بندوں نے مجھ سے جینے کا حق چھین لیا...... پروردگار! تو بہت بڑا منصف ہے تو ہی انصاف کر...... تیری بنائی ہوئی دنیا میں یہ ظلم کب تک ہوتے رہیں گے، یہ ظلم اور ناانصافیاں کب تک روا رکھی جائیں گی۔ کب تیرا غضب ان پر ڈھایا جائے گا؟ کاش! ان کو دنیا میں ہی اُن کے مظالم کی سزا مل جائے تاکہ آنے والی نسلیں عبرت حاصل کریں۔ میں روتے روتے بے ہوش ہو گیا تو نصیر، جمیل اور گلشن مجھے اُٹھا کر واپس لے آئے۔ میرا مقدر لٹ گیا انسانوں کے بنائے ہوئے قانون نے ایسی بجلیاں گرائیں کہ میرا آشیانہ جلا کر بھسم کر ڈالا۔ میں دن رات روتا رہتا اور سوچتا کہ آخر محرومیاں اور تلخیاں ہی میرا مقدر کیوں بن گئی ہیں، مجھے خوشی کے لمحات کیوں نہیں میسر آئے کیا آہیں اور سسکیاں ہی میری زندگی کا حاصل رہیں گی؟

☆......☆......☆

کئی سال گزر گئے ہیں۔ میں اپنے شہر سے باہر موجود انہی بزرگ کے مزار کا ہو کر رہ گیا ہوں، دن رات یہاں ہی رہتا ہوں، میرا حلیہ بھی فقیروں اور ملنگوں جیسا ہو گیا ہے کوئی بھی مجھے پہچان نہیں سکتا۔ کھانا دربار سے مل جاتا ہے اور باقی وقت یادِ الٰہی میں گزر جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو سکون عبادت میں ملتا ہے وہ اور کسی کام میں نہیں ملتا اسی لیے مجھے اب دنیا کی پروا نہیں مگر پھر بھی کبھی کبھی من میں ایک اُبال سا اٹھتا ہے، اپنے چاہنے والوں اور اپنے دشمنوں کی یاد آتی ہے تو تڑپ اٹھتا ہوں۔ میں جب بھی شہر جاتا ہوں، میرا رخ کرن کے گھر کی طرف ہوتا ہے۔ میں اس کو ایک نظر دیکھ لیتا ہوں تو روح کو چین مل جاتا ہے۔ وہ مجھے نہیں جان پاتی پہچان پاتی کہ میں کون ہوں۔ وہ بھی شاید مجھے بھکاری ہی سمجھتی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ روزانہ ہی کرن کو دیکھنے جایا کروں۔ مگر ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے پہچان لیا گیا تو پھر کسی نئے عذاب سے دوچار نہ ہو جاؤں کیونکہ میں تو ازل سے ہی بخت گزیدہ ہوں، میں نے ٹھوکریں ہی کھائی ہیں۔

میری زندگی برباد کرنے میں سیما کا ہاتھ زیادہ ہے حالانکہ اس کے سنگ دو ماہ ہی گزارے ہیں۔ ان دو ماہ میں اُس نے جس طرح میری خدمت کی، اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے جذبوں میں سچی اور پتی ورتا عورت ہے مگر وہ میری بھول تھی۔ اس ظالم نے تو مجھے ایک ایسی اجاڑ بستی میں لا ڈالا ہے جہاں دن رات بربادی کی دھول اڑتی رہتی ہے، جہاں محبت اور پیار کی کوئی بدلی نہیں برستی۔ ہر وقت تپتی ریت کے بگولے رقص کرتے ہیں۔ میں اب اُس سے روزِ محشر ہی ملوں گا اور پوچھوں گا کہ کیا میری وفاؤں، میری قربانی کا یہی صلہ تھا؟ میں نے تو اسے اپنی جان، اپنی زندگی اور اپنی روح جانا تھا، اپنے دل کی ویران اور سنسان راہوں کی روشنی جانا تھا مگر اس نے مجھے اندھیری راہوں میں بھٹکنے والا مسافر بنا دیا، حال اور مستقبل کے سارے اجالے چھین لیے...... گھر پا کر بھی گھر نہ ملا، باپ ہو کر بھی میں باپ نہیں کہلا سکا، میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی زیست کے چوراہے پر خالی ہاتھ، خالی دامن کھڑا ہوں۔ سیما کی بے وفائی نے میری مسرتوں کا آئینہ اس طرح توڑا ہے کہ میرا انگ انگ لہولہان ہو گیا ہے اور ہر لمحہ ان سے پچھتاوے کا خون رستا رہتا ہے...... ایک دن آئے گا کہ میرے جسم سے تمام خون ختم ہو جائے گا اور میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

☆☆......☆☆

کراچی سے دوسری طویل کہانی

اندھیرے کا سفر

عارف شفیق کا خیال

وہ جن کو اپنا محافظ سمجھ رہے تھے ہم
وہی تو لوگ ہیں شب خون مارنے والے

کرن شبیر

ہمارے موجودہ معاشرے میں اسلامی اقدار کی جانب سے غفلت بلکہ دانستہ اُن کی پامالی اور

متعدد غیر اخلاقی عوامل و عناصر کی دخل اندازی نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جس میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی جذبات کے ہاتھوں عقل و ہوش سے بے بہرہ ہو کر ایسی راہوں پر چل پڑتے ہیں جو اکثر و بیشتر انہیں کسی ایسی تباہی سے دوچار کر دیتی ہے جن کا مداوا ساری زندگی کے پچھتاوے سے بھی نہیں ہو سکتا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی بربادی سے سبق اور عبرت حاصل کرنے کے بجائے نوجوان اِس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ جو اوروں کے ساتھ ہوا وہ اُن کے ساتھ نہیں ہوگا۔ بلاشبہ کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی آزمائش میں خود کو ڈالا ہی کیوں جائے جس میں پار لگنے سے کہیں زیادہ ڈوب جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

میرا نام حامدہ ہے اور میں آج ایک ایسی خوش فہم لڑکی کی داستانِ حیات تحریر کر رہی ہوں جس نے اپنی زندگی کے سبق خود سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ اس آپ بیتی میں تھوڑا بہت کردار میرا بھی رہا ہے لیکن بنیادی طور پر میری حیثیت ایک راوی کی ہے اس لیے میں اپنی طرف سے کسی تنقید تبصرے کے بغیر ان حالات و واقعات کو رقم کرنے کی کوشش کروں گی جو کسی نہ کسی طرح میرے علم میں آئے' کہانی کی ترتیب قائم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ واقعات کو اس اعتبار سے بیان کیا جائے جس ترتیب سے وہ پیش آئے خواہ اُن کا علم مجھے بعد میں کسی دوسرے ہی موقع پر ہوا ہو۔

جہاں تک خود میرے اپنے تعارف کی بات ہے تو صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ میرا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا بھائی بہن اور دوسرے عزیز و اقارب بھی تھے اور اب بھی ہیں' میری شادی ایک شریف اور متوسط خاندان میں ہوئی' سسرال دوسرے شہر میں تھی اس لیے مجھے اپنا آبائی گھر ہی نہیں شہر بھی چھوڑنا پڑا۔

شادی کے ابتدائی نو سال بہت اچھی طرح گزرے جس کے دوران میں دو بیٹوں کی ماں بن گئی' مگر پھر اس کے بعد آزمائش اور امتحان کا ایک طویل دور شروع ہوا۔

میرے شوہر سول انجینئر تھے' اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک زیرِ تعمیر عمارت کا معائنہ کرنے گئے جو ایک تجارتی کمپنی تعمیر کرا رہی تھی' اُس نے انتہائی ناقص میٹریل استعمال کیا تھا' میرے شوہر معائنے میں مصروف تھے کہ ایک دن قبل پڑی ہوئی چھت مع اپنے ستونوں کے زمین بوس ہو گئی اور جو چار آدمی ملبے کے نیچے دب کر جاں بحق ہوئے ان میں میرے شوہر بھی شامل تھے۔ اُن کے ساتھ چھوڑ جانے کے بعد میں نے کن حالات میں زندگی گزاری اور کس طرح اپنے دونوں بیٹوں کو ضروری تعلیم و تربیت فراہم کی وہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس نے استقامت سے جدوجہد کا پھل عطا کیا۔ میرے دونوں بیٹے آگے پیچھے بیرونی ممالک میں اچھی سروس پر لگ گئے۔ جس زمانے کا میں ذکر کرنے لگی ہوں تب میں اپنے گھر میں تنہا رہتی تھی۔ ساس سسر کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔ والد فوت ہو گئے تھے۔ والدہ حیات تھیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اور بھائی بہن دوسرے شہر میں تھے۔ دیگر سسرالی عزیزوں سے کوئی خاص تعلقات نہیں تھے۔

میرے پڑوس میں دو کمروں' ایک برآمدے اور ایک صحن کا چھوٹا سا مکان تھا جس میں آٹھ مہینے سے ایک شریف و پاکیزہ کردار نوجوان

طارق رہتا تھا۔ وہ ایک مقامی کمپنی میں اسٹینوگرافر تھا اور ایک طریقہ سے ملازمت کرنے شہر آیا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ اُس کی صورت اور قد و قامت میرے چھوٹے بیٹے محمود سے بہت ملتی تھی۔ بیٹوں کی عدم موجودگی مجھے خاصا اداس رکھتی تھی۔ طارق کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے میرا محمود آ گیا ہے۔

ایک دن میں نے خود ہی اس سے بات کی اور اس کی سادہ مزاجی اور پُرخلوص باتوں سے بے حد متاثر ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد ایک چھوٹے سے کاشتکار ہیں۔ وہ اُن کا اکلوتا بیٹا ہے جبکہ اس کی چار بہنیں ہیں گھر کا خرچ کھیتی باڑی سے بہ مشکل پورا ہوتا ہے۔ والد کو اس کی تعلیم کی بھی کوئی فکر نہیں تھی مگر اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنے شوق اور محنت سے اس نے پہلے میٹرک اور پھر ایف۔ اے پاس کیا۔ تب تک دو بہنوں کی شادی کے سلسلے میں اس کے والد کافی مقروض ہو گئے تھے۔ مجبوراً اسے مزید تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ ایک ہمدرد کے مشورے سے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس پاس کر لیا۔ اسی اضافی قابلیت کی وجہ سے اسے ملازمت کے لیے زیادہ ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں۔ اب وہ اپنی نصف سے زیادہ تنخواہ اپنے گھر منی آرڈر کر دیتا اور باقی رقم سے اپنا گزارہ کرنے کی کوشش کرتا۔

یہ معلوم کر کے کہ وہ اپنے محدود بجٹ کی وجہ سے سستے ہوٹلوں میں سستے قسم کا کھانا کھانے پر مجبور ہے، میں نے اسے بڑے اصرار سے اپنے ہاں کھانے اور ناشتے کا انتظام کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اگرچہ مجھے اُس کے دیے ہوئے پیسوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن جب اس نے مصمم لہجے میں یہ کہا کہ وہ میرے گھر کھانا اور ناشتا صرف اسی صورت میں قبول کر سکتا ہے جب میں اس سے کم سے کم اتنی رقم ضرور لوں جو وہ کھانے اور ناشتے پر صرف کرتا ہے، میں نے اُس کی بھلائی کے خیال سے یہ بات منظور کر لی، اور پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ مجھے اپنے بیٹوں ہی کی طرح عزیز اور پیارا ہو گیا۔

طارق کی تیسری بہن کی بات بھی طے ہو چکی تھی۔ لڑکے والے جلدی کر رہے تھے اور طارق کی ماں اسے ہر خط میں جلد سے جلد چھٹی لے کر آنے کی تاکید کر رہی تھیں مگر طارق کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ملازمت کا سال پورا ہونے سے قبل دو تین ہفتے کی اکٹھی چھٹی لے نہیں سکتا تھا۔ پھر طارق کی والدہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے طارق کے لیے بھی ایک لڑکی دیکھ لی ہے اور چاہتی ہیں کہ بیٹی اور بیٹے کی شادی کے فرض سے ساتھ ہی فارغ ہو جائیں، مگر طارق کا خیال تھا کہ جب تک چوتھی بہن کی بھی شادی نہ ہو جائے اور لیا ہوا تمام قرض نہ اتر جائے وہ اپنی شادی کے بارے میں نہ سوچے۔ مجھے اس کے خیال سے اتفاق تھا۔ شادی کے بعد بیوی کو ساتھ رکھنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ مکان موجود ہی تھا۔ مگر ایک فرد کے اضافے سے اخراجات اور ذمے داریوں میں اضافہ لازمی تھا اور یوں بچت کی وہ رقم متاثر ہو سکتی تھی جو طارق بڑی پابندی سے ہر ماہ اپنے والد کو بھجوا دیتا تھا۔ اور رقم میں کمی قرض کی ادائیگی کی مدت میں اضافہ کا موجب بنتی جو طارق کو کسی حال میں منظور نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد اس بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی ماں کو لکھ دیا تھا کہ سرِدست وہ اُس کی شادی کے بارے میں نہ سوچیں مگر مجھے ایک ماں

کے جذبات کا اندازہ تھا۔ سوچتی تھی کہ یہاں سے تو طارق نے انکار لکھ دیا ہے مگر اپنے گھر پہنچ کر وہ ماں باپ کے اصرار کے مقابلے میں بھی اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہ سکتا ہے' اس کا امکان کم تھا۔ بہر حال جب بہن کی تاریخ ٹھہر گئی اور طارق کی چھٹیاں بھی واجب ہوگئیں تب وہ بیس دن کی رخصت لے کر اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

طارق کے تذکرے کو اس مقام پر چھوڑ کر میں اس لڑکی کی کہانی کا آغاز کرتی ہوں جس کی آپ بیتی میرے قلم اٹھانے کا محرک بنی ہے۔ اس لڑکی کا نام رقیہ تھا۔ اس کے والدین ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ غریب اور تنگدست طبقے سے تعلق تھا۔ والد ایک سرکاری دفتر میں چپراسی تھے۔ رقیہ اُن کی پہلی اولاد تھی۔ جب تک کنبہ تین چار افراد تک محدود رہا تب تک تو کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا مگر مسلسل تیسری بیٹی کی پیدائش کے بعد بیٹے کی شدید تمنا رکھنے کے باوجود رقیہ کے والدین کو سوچنا پڑا کیونکہ موجودہ آمدنی میں مزید کسی اضافے کی گنجائش نہیں تھی اگرچہ تینوں بہنوں کی پیدائش میں دو اور تین سال سے کم وقفہ نہیں تھا' پھر جب تیسری بیٹی اس قابل ہوئی کہ ماں کے بغیر چند گھنٹے گزار سکے اور بھوک لگے تو دودھ کے علاوہ کچھ اور بھی کھا پی لے تو رقیہ کی والدہ نے بھی ایک بچوں کے اسکول میں بطور خادمہ کے ملازمت کر لی تب رقیہ کی عمر تقریباً گیارہ برس کی تھی اور وہ اس قابل ہو چکی تھی کہ ماں باپ کی عدم موجودگی میں گھر کو اور بہنوں کو سنبھال سکے۔ اس اضافی آمدنی کا گھر کی مجموعی صورت حال پر اچھا اثر ہوا۔ رقیہ نے اردو قاعدہ اور تیسری جماعت تک کی کتابیں گھر پر ہی پڑھ لی تھیں۔ کچھ آسودگی آئی تو اس نے ماں سے ضد کر کے ایک دوسری شفٹ والے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس کی ماں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایک بجے تک گھر آ جاتی تھی اس لیے اس کے آنے کے بعد رقیہ کو اسکول جانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ اس طرح سات سال بیت گئے۔ رقیہ نے میٹرک کر لیا۔

گھر کے حالات کچھ بہتر ہوئے تو والدین کی دلی خواہش پھر جاگ اٹھی اور اس مرتبہ قسمت نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ تیسری بہن کی پیدائش کے تقریباً دس سال بعد بالآخر رقیہ کا ایک بھائی آ ہی گیا۔ رقیہ کی ماں کو اپنی ملازمت چھوڑنا پڑی لیکن بیٹا ہونے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ آمدنی کم ہو جانے کا نقصان برداشت کر لیا گیا۔ مگر اس صورت حال سے رقیہ کی تعلیم رک گئی اور وہ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے باوجود کالج میں داخلہ نہیں لے سکی۔ اگرچہ ماں نے اسے تسلی دی تھی کہ بیٹا دو تین سال کا ہو جائے گا تو پھر وہ کسی اسکول میں ملازمت کر لے گی اور رقیہ کو کالج میں داخلہ دلوا دے گی۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان دو تین برسوں میں حالات نے ایک ایسی کروٹ بدلی کہ رقیہ کی زندگی کا رخ ہی تبدیل ہو گیا۔

رقیہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ متناسب قد و قامت اور جسم نے اسے اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ محلے کا ایک اوباش نوجوان بشیر اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ شکل و صورت کا اچھا تھا اور اس نے اپنی بداعمالیوں کے سلسلے میں اتنی احتیاط رکھی تھی کہ محلے میں بہت کم لوگ اس کی آوارگی اور غیر اخلاقی و غیر قانونی حرکتوں سے واقف تھے۔ خوش لباس بھی تھا تعلیم اگرچہ سات آٹھ جماعتوں سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر ذہین اور چالاک تھا اور چہرے

سے خاصا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے رقیہ کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کافی صبر و تحمل سے کام لیا۔ پہلے بات چیت کی کوئی کوشش کیے بغیر کئی ماہ تک گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر تک بڑی خاموشی سے اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ یوں رقیہ کے ذہن اور تصور میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی۔ پھر جب رقیہ اس کے تعاقب کی عادی بلکہ ایک طرح سے منتظر رہنے لگی تو اس نے اگلا قدم اٹھایا۔ ایک دن ایک کاپی خریدی اس میں اپنا خط لکھا اور اس بہانے سے رقیہ کو دے دی کہ شاید اس کی کتابوں کاپیوں میں سے یہ کاپی گر گئی ہے۔ چلتے راستے میں بشیر کے یوں مخاطب ہونے سے رقیہ گھبرا گئی اور اس نے اپنی گھبراہٹ میں بات کو کم اور مختصر کرنے کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کاپی لے لی۔ یوں اُن دونوں کی خط وکتابت کا آغاز ہوا۔

ایک ماہ کے اندر بشیر نے رقیہ کو نہ صرف اپنی چاہت میں مبتلا کرلیا۔ بلکہ ایک دوبار اسکول سے واپسی پر ملاقاتیں بھی کرلیں۔ وہ جانتا تھا کہ رقیہ غریب گھر کی لڑکی ہے اس لیے وہ ہمیشہ اسے اپنے دولت مند ہونے اور اس دولت کے سہارے رقیہ کو خوشگوار اور سہانی زندگی کے خواب دکھاتا رہتا تھا کہ رقیہ سے شادی کرلینے کے بعد وہ کس طرح دنیا بھر کی راحتیں اور عیش و آرام اس کے قدموں پر ڈھیر کردے گا۔ اس نے رقیہ کو یہ یقین بھی دلا دیا کہ نہ اس کے والدین اور نہ رقیہ کے ماں باپ اُن کو شادی کرنے کی اجازت دیں گے کیونکہ رقیہ کے ماں باپ کی غریبی ان کے ایک ہونے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور پھر بہت محتاط انداز میں رفتہ رفتہ اسے گھر چھوڑ کر اپنے ساتھ بھاگ چلنے پر آمادہ کرلیا۔

سیدھی سادھی ناتجربہ کار رقیہ جس پر بشیر نے قیمتی تحائف دے کر اپنی دولت مندی کا یقین اور اپنے محبت میں مستقل مزاجی اور ثابت قدم ہونے کا اعتماد دلا یا دیا تھا۔ ہر قسم کے نتائج سے آنکھیں بند کرکے ایک رات چند جوڑے کپڑے اور چاندی کے ایک دو زیورات لے کر بشیر کے ساتھ بظاہر ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ اپنے نزدیک وہ بشیر کے ساتھ ایک ایسے شہر میں جارہی تھی جہاں بشیر کا ایک دولت مند دوست بہت بڑا کاروبار کرتا تھا۔ بشیر نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کم سے کم پچاس ہزار لے کر جائے گا۔ اپنے دوست کے ساتھ بزنس میں پارٹنر شپ کرے گا۔ گھر کا انتظام اس نے پہلے ہی کرلیا ہے۔ پہنچنے کے دوسرے دن وہ شادی کریں گے اور پھر دوست کے ساتھ کاروبار میں شراکت سے جو آمدنی ہوگی وہ بہت عیش و آرام سے ان کی گزر اوقات کے لیے کافی ہوگی۔

☆......☆......☆

رقیہ کو حیرت کا پہلا ہلکا سا جھٹکا اس وقت لگا جب بشیر نے حسب وعدہ اسے کسی کرائے پر لیے ہوئے مکان کے بجائے اپنے دوست وحید کے گھر ٹھہرایا۔ یہ بارہ تیرہ کمروں پر مشتمل ایک دو منزلہ مکان تھا جس میں کئی خوبصورت لڑکیاں اور اپنی صورت سے ہی سخت گیر اور چالباز نظر آنے والے دو تین مرد مقیم تھے جن میں سے ایک کا نام وحید تھا اور وہ ان سب کا سربراہ معلوم ہوتا تھا۔ پہلی رات رقیہ کو بڑے آرام سے ایک الگ کمرے میں رکھا گیا۔ اگلی صبح بشیر اس کے پاس آیا اور کہا کہ وہ واپس گھر جارہا ہے تاکہ محلے میں کسی کو یہ شبہ نہ ہوسکے کہ رقیہ اس کے ساتھ بھاگی ہے۔ دو چار دن میں بات کچھ ٹھنڈی بھی پڑ جائے گی اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ رقیہ کے ماں

باپ نے بیٹی کے غائب ہونے پر کوئی قانونی کارروائی ضروری سمجھی ہے یا نہیں۔ اس جانب سے اطمینان حاصل کرنے پر بشیر دوبارہ آ جائے گا اور تب وہ دونوں شادی کرلیں گے۔ اس کی غیر حاضری میں وحید جو کہ اس کا قابل اعتماد دوست ہے اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھے گا۔ اور رقیہ کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی اور بشیر کی سلامتی کے خیال سے وحید کو ناراض ہونے کا موقع نہ دے۔

رقیہ والدین کے گھر سے نکل کر مجبور ہو چکی تھی کہ بشیر جو کہہ رہا ہے اس کو سچ مانے اور اس کی مرضی کے مطابق عمل کرے۔ یوں بشیر اسے وحید کے حوالے کر کے چلا گیا۔ ایک دو دن میں ہی سرِ شام سے رات گئے تک ہونے والی پُر اسرار سرگرمیوں سے رقیہ کو اندازہ ہوگیا کہ اپنی ناسمجھی اور بشیر پر اندھے اعتماد نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اور جب ایک ادھیڑ عمر عورت نے اسے بتایا کہ بشیر نے اسے بیس ہزار روپے کے عوض وحید کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو رقیہ کو اپنی تباہی صاف نظر آنے لگی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ جذبات کے اندھے پن میں کتنی سنگین غلطی کر بیٹھی ہے۔ اس دوران اسے دو تین لڑکیوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ جنہوں نے بتایا کہ وحید ایک ہائی کلاس جسم فروشی کا اڈہ چلا رہا ہے۔ اس کے گاہکوں میں اعلیٰ طبقے کے افراد شامل ہیں جو اپنی عیاشی پر سینکڑوں کیا ہزاروں روپے خرچ کر سکتے ہیں۔ اس لیے وحید ان سے ایک کمرے کا کرایہ پانچ ہزار سے پندرہ ہزار روپے تک وصول کرتا ہے۔ بشیر نے تعلقات کے آغاز سے وحید کے گھر لانے تک رقیہ کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی اور اسی بات نے رقیہ کو اس کے خلوص پر اندھا اعتماد کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس میں بشیر کی نیت یا پاکبازی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وحید کی لازمی شرط تھی کہ اس کے پاس لائی جانے والی لڑکی ہر اعتبار سے اچھوتی ہوتا کہ وہ اس کے پہلے گاہک سے ہی خرچ کی گئی رقم سے زیادہ وصول کر سکے۔ ان لڑکیوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی کم و بیش رقیہ جیسے حالات کے تحت ہی اس مکان تک پہنچی ہیں۔ ابھی ہفتہ عشرہ وحید رقیہ کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس دوران وہ ادھیڑ عمر دلالہ برابر لیکچر پلاتی رہے گی کہ اس طرزِ زندگی کو اپنانے میں رقیہ کا کتنا فائدہ اور مزاحمت کرنے میں کتنے خطرات ہیں۔ پھر جب وہ تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس ماحول سے مانوس ہو جائے گی تو کسی رات اُس کا سودا بھی کرلیا جائے گا۔

رقیہ جن حالات میں پھنس چکی تھی اُن سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اس قید سے بھاگنے کے بارے میں بھی سوچا' لیکن وحید کی نگرانی کا نظام اتنا کڑا تھا کہ کوئی لڑکی اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ مکان سے باہر قدم نکالنا تو دور کی بات تھی' اگر کبھی کوئی گاہک کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تو اس کے لیے دگنی فیس تھی اور ایک خاص خفیہ رستہ استعمال کیا جاتا تھا جو ایک سرنگ کی صورت چلتا ہوا مکان سے کچھ فاصلے پر ایک گلی میں کھلتا تھا گاہک کو لڑکی اسی گلی میں مل جاتی تھی اور واپسی میں صبح کے چار بجے تک ہونا لازمی تھی' گاہک لڑکی کو اسی گلی میں چھوڑ جاتا تھا۔ ظاہری طور پر وحید نے اس مکان کو ایک کاروباری بلڈنگ بنا رکھا تھا جس میں مختلف کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ مگر حقیقت میں یہ تمام

کمپنیاں فرضی تھیں۔ جن کا نام ایک بورڈ کے علاوہ کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مقامی پولیس کو بھی وحید کے خفیہ کاروبار کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں۔ کبھی کوئی بات باہر نکلی بھی تو وحید کے سرپرستوں نے پولیس کو کارروائی کرنے سے روک دیا پھر بھی وحید نے دوراندیشی کے خیال سے (اس خفیہ راستہ کے علاوہ) مکان کے عقبی حصے میں دو تین دروازے بنا رکھے تھے اور تمام لڑکیوں کو تاکید کردی گئی تھی کہ وہ کسی خطرے کی صورت میں ان دروازوں سے نکل کر بھاگ جائیں، اب یہ اتفاق تھا یا قدرت کہ رقیہ کی عزت بچانا مقصود تھی کہ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ایک نیا ایس ایچ او آیا اور اس نے اہلِ محلہ کی جانب سے کچھ گمنام خطوط موصول ہونے پر پوشیدہ طور پر تحقیقات کی۔ اس کے کچھ شکوک و شبہات بڑھے اور اس نے ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کے لیے سادہ لباس میں فرضی گاہک بھیجنے اور عین وقت پر چھاپہ مارنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆......☆......☆

تقریباً دس دن کے بعد اس دلالہ عورت نے جسے سب لڑکیاں باجی کہا کرتی تھیں رقیہ کو بالکل صاف اور دو ٹوک انداز میں بتایا کہ ایک خوبصورت اور نوجوان رئیس زادے نے اسے پسند کرلیا ہے وہ آج کی رات اُس کا مہمان ہوگا...... رقیہ کو کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہیے کہ وحید کو گھی نکالنے کے لیے اپنی انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑیں۔ اس سے پہلے یہ باجی تقریباً روزانہ رقیہ کو لیکچر پلاتی رہی تھی کہ بشیر نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے اور وہ ایک مرد تھا۔ تمام مرد اس کی طرح بے وفا اور ہوس کے غلام ہوتے ہیں۔ کہیں یہ ہوس دولت کی ہوتی ہے اور کہیں شباب کی، رقیہ کو تمام مردوں سے انتقام لینا چاہیے اور وہ انتقام اسی طرح لیا جاسکتا ہے کہ انہیں اس دولت سے محروم کردیا جائے جس کے بل پر وہ عورتوں کو اپنا جی بہلانے کا ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔

رقیہ اپنی مجبوری و بے بسی اچھی طرح جاننے کے باوجود باجی کے دلائل سے متفق نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتی تھی مگر عملی مزاحمت کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ پھر اس نے مختلف لڑکیوں سے کچھ ایسی مثالیں بھی سنی تھیں کہ اگر کبھی کسی ضدی اور سرکش لڑکی نے وحید کا حکم ماننے سے انکار کیا تو اس پر کیا گزری۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس کا واحد سہارا وہ دعائیں تھیں جو وہ نماز پڑھ کر مانگتی تھی یا پھر ایک مدہوم سی امید کہ وہ اپنے گاہک کے قدموں پر گر کر اس سے التجا کرے گی کہ وہ اسے برباد نہ کرے اسے چاہتا ہے تو اسے اس جگہ سے نکال کرلے جائے اور باقاعدہ شادی کرلے، اس کا خیال تھا کہ شاید اس طرح کسی کے دل میں اس کے لیے رحم اور ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوجائے اور وہ بے عزت ہونے سے بچ جائے۔

سہ پہر سے رقیہ کا سنگھار شروع کردیا گیا تھا اور خاموشی سے وہ تمام کام ہورہے تھے جو باجی چاہتی تھیں۔ نو بجے تک وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سجا بنا کر تیار کردی گئی۔ پھر اسے جس خاص کمرے میں لے جایا گیا وہ بھی اپنی سجاوٹ میں کسی حجلہ عروسی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ رقیہ دھڑکتے دل کے ساتھ انجانے قدموں کی آہٹ کی منتظر تھی اور اپنا حوصلہ بنائے رکھنے کے لیے وہ دل ہی دل میں وہ باتیں دہرا رہی تھی جو اس نے اپنے گاہک کے دل میں جذبہ ہمدردی کو بیدار کرنے کے لیے سوچی تھیں۔ اچانک ایک شور سا اٹھا۔ باہر راہداری میں بھاگتے قدموں کی

آوازیں اورلڑکیوں کی دبی دبی چیخیں سنائی دینے لگیں۔اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔
ایک بھاگتی ہوئی لڑکی نے اسے دیکھا اور چیخ کر بولی۔
''پولیس نے فرضی گاہک کے بھیس میں چھاپہ مارا ہے اپنی جان بچاؤ عقبی دروازے سے بھاگ نکلو ورنہ پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو تمہیں بھی جسم فروشی کے جرم میں گرفتار کرلیا جائے گا۔''
''مجھے نہیں معلوم کہ عقبی دروازہ کہاں ہے؟''
رقیہ نے گھبرا کر جواب دیا۔
''تم میرے پیچھے چلی آؤ۔'' لڑکی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔
غنیمت تھا کہ سنگھار کرنے والی نے اس کے لیے جولباس پسند کیا تھا وہ شلوار قمیض پر مشتمل تھا اگر کہیں اس نے غرارہ پہنا دیا ہوتا جو اس کے لیے بھیجے گئے ملبوسات میں شامل تھا تو رقیہ کو بھاگنے میں بڑی مشکل پیش آتی۔ وہ اس لڑکی کے پیچھے دوڑتی چلی گئی بالائی منزل کا زینہ طے کرکے نیچے آئی اس وقت تک وہاں پولیس نہیں پہنچی تھی۔البتہ بہت سے حواس باختہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مختلف اطراف میں بھاگ رہے تھے رقیہ نے دیکھا کہ بھاگنے والوں میں وحید کے کئی ساتھی بھی شامل ہیں وہ اسی لڑکی سے چند قدم پیچھے بھاگتے ہوئے ایک عقبی دروازے سے نکل کر مکان سے باہر آ گئی۔
''اب میرا پیچھا چھوڑو۔'' لڑکی بولی۔
''اور جس طرف منہ اٹھے بھاگتی چلی جاؤ کسی کے ساتھ لگنے کی کوشش مت کرنا اس صورت میں پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہوگا۔''
رقیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور ایک قریبی گلی میں گھوم گئی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا اور نہ اس وقت ذہن یہ سوچنے کے قابل تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے یا کہاں جائے' وہ تو اپنے اور پولیس کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرنے کے لیے بس بھاگتی چلی جارہی تھی۔
اچانک گلی سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے ایک دبی چیخ نکلی اور وہ سڑک پر گرنے لگی تھی کہ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کا بازو تھام لیا۔
انسپکٹر سعید کی سرکردگی میں پولیس کا چھاپہ اگرچہ پوری طرح کامیاب نہیں رہا تھا۔ مکان میں موجود اکثر لڑکیاں اور گاہک عقبی دروازوں سے فرار ہوگئے تھے۔ مگر پھر بھی اس نے کئی جوڑوں کو ناگفتہ بہ حالت میں کمروں سے برآمد کرلیا تھا۔ وحید اور اس کا ایک ساتھی بھی پکڑے گئے تھے مگر بیشتر خفیہ راستے سے بھاگ نکلے تھے۔ پولیس کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس نے مکان کے جغرافیہ اور گردوپیش کے بارے میں کوئی فکر نہیں کی۔ بہت کم نفری کے ساتھ چھاپہ مارا اس لیے عقبی دروازے کے بارے میں معلوم ہوجانے کے باوجود انسپکٹر سعید بھاگنے والوں کو پکڑنے میں ناکام رہا۔ پھر بھی اسے خوشی تھی کہ کئی ٹھوس ثبوت اس کے ہاتھ لگنے کے علاوہ وحید بھی گرفتار ہوچکا تھا جس کے متعلق اسے ابتدائی بیانات سے ہی معلوم ہوگیا کہ وہ اس اڈے کا کرتا دھرتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وحید سے بھاگ جانے والوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل ہوجائیں گی اور جلد یا بدیر وہ اس کے باقی ساتھیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

☆......☆......☆

طارق بہن کی شادی سے فارغ ہوکر رات کو منزل پر پہنچنے والی ٹرین سے واپس آیا تھا۔ اسٹیشن

سے گھر تک کا فاصلہ کافی تھا اس نے رکشہ کرنے کی کوشش کی مگر رات ہونے کی وجہ سے ہر رکشے والے نے اتنے زیادہ کرائے کا مطالبہ کیا کہ طارق نے پیدل جانے کا فیصلہ کرلیا وہ بڑی کوشش کے بعد بالآخر اپنی ماں کو یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ سرِ دست صرف بہن کی شادی ہی کردی جائے۔ پھر جب چوتھی بہن کا نمبر آئے گا تب وہ اپنی شادی کے بارے میں بھی غور کرے گا اور ممکن ہوا تو دونوں شادیاں ایک ساتھ ہی ہوجائیں گی۔

وہ ایک ہاتھ میں چھوٹے سائز کا اٹیچی کیس لٹکائے چلا جارہا تھا کہ قریبی گلی سے کوئی فرد بھاگتے ہوئے نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ ٹکرانے والے کو غور سے دیکھنے سے پہلے ہی طارق کو اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ سے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔ اس نے پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑ کر سنبھالتے ہوئے گرنے سے بچالیا۔ بجلی کا کھمبا قریب ہی تھا اس کی روشنی میں طارق نے لڑکی کے خوبصورت لباس اور حسین چہرے کے میک اپ کو غور سے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے کوئی لڑکی اپنی مرضی کے خلاف شادی سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ نکلی ہے۔

بلاشبہ یہ رقیہ ہی تھی جو یوں طارق سے ٹکرائی تھی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے طارق کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اُس کی نظروں میں حیرت کے ساتھ ہمدردی کا تاثر محسوس کرکے جلدی سے بولی۔

''کچھ غنڈے میرا پیچھا کررہے ہیں خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔''

طارق نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اسے دور تک سنسان نظر آئی۔

''وہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

مگر رقیہ کا خیال تھا کہ وہ اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آوازیں سنتی رہی ہے اور یہ خیال کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ وحید کا ایک ساتھی بھی اسی گلی میں داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنے آگے ایک لڑکی کو زرق برق لباس میں بھاگتے دیکھا تو اندازہ کرلیا کہ وہ رقیہ ہی ہوسکتی ہے کیونکہ نئی لڑکیوں میں اس رات صرف اسی کا سودا ہوا تھا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ شہری چڑیا...... پولیس کے ہاتھ لگ جائے یا از خود کہیں فرار ہوجائے وہ اسے نگاہ میں رکھے ہوئے تھا تاکہ خطرے کے مقام سے دور نکل آنے کے بعد وہ رقیہ کو پکڑ کر وحید کے کسی دوسرے محفوظ اڈے پر پہنچا دے مگر اسے ایک نوجوان سے باتیں کرتے دیکھ کر رک گیا اور پھر جیسے ہی طارق نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا وہ اُس کی نظر سے بچنے کے لیے ایک مکان کی آڑ میں ہوگیا۔

''شاید وہ آپ کو دیکھ کر چھپ گئے ہیں۔'' رقیہ بولی۔

''پلیز میری مدد کریں مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں۔''

طارق کو کچھ حیرت ہوئی' ان حالات میں کوئی بھی لڑکی یہی چاہتی ہے کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیں۔ یہ کیسی لڑکی ہے جو کسی اور محفوظ جگہ جانا چاہتی ہے۔ کیا اس کا اپنا گھر اس کے لیے محفوظ نہیں ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں کافی فاصلے پر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ شاید کچھ اور افراد بھی پولیس سے بچنے کی کوشش میں اس گلی کا رخ کررہے تھے۔

''یہاں رکنا مناسب نہیں۔'' طارق نے ان آوازوں کو لڑکی کے بیان کی تصدیق خیال کیا۔

''آپ میرے ساتھ چلیں راستے میں کوئی رکشا یا ٹیکسی مل گئی تو اسے روک کر آپ جہاں جانا چاہیں گی میں آپ کو پہنچا دوں گا۔''

وہ دونوں نسبتاً تیز قدموں سے آگے بڑھے' کچھ دور جا کر طارق نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے تین آدمی گلی سے نکل کر روڈ پر آتے نظر آئے مگر وہ ٹھہرنے کے بجائے مخالف سمت میں بھاگتے چلے گئے۔

''اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''جو غنڈے آپ کا پیچھا کر رہے تھے وہ دوسری جانب چلے گئے ہیں۔''

رقیہ نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

خطرے سے دور نکل آنے پر اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس اجنبی شہر میں رات کے وقت وہ کہاں جائے گی۔ اسے کہاں پناہ مل سکتی ہے جہاں وہ پولیس سے بھی بچی رہے اور وحید سے بھی 'ان ہی چند لمحوں میں اس کے دل میں آپ سے آپ طارق پر اعتماد بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ اسے اپنے بارے میں حقیقت بتائے بغیر کیسے مدد کی درخواست کر سکے گی۔

''میرا نام طارق ہے' آپ کا نام کیا ہے؟'' طارق نے اسے خاموش پا کر کہا۔

''رقیہ......'' جواب ملا۔

''میں یہاں ایک کمپنی میں ملازم ہوں' گھر والے ایک قصبے میں رہتے ہیں میری بہن کی شادی تھی چھٹی لے کر گھر گیا تھا اب واپس آ رہا ہوں۔'' طارق کا خیال تھا کہ اس جواب میں رقیہ بھی اپنے بارے میں کچھ بتائے گی مگر وہ خاموش رہی۔

''اگر کچھ غنڈے آپ کا پیچھا کر رہے۔'' چند لمحہ انتظار کرنے کے بعد وہ پھر بولا۔

''تو بہتر ہوگا کہ آپ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں۔ آگے کچھ فاصلے پر ایک پولیس اسٹیشن بھی ہے۔''

''نہیں۔'' رقیہ نے گھبرا کر کہا۔

''میں پولیس میں رپورٹ کرنا نہیں چاہتی۔''

''تب پھر اپنے گھر کا پتا بتائیں تاکہ میں آپ کو وہاں پہنچا دوں۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' آخر رقیہ کو بتانا پڑا۔

''پھر آپ اس وقت رات میں کہاں سے آ رہی تھیں اور وہ بھی ایسے لباس میں جیسے کسی تقریب میں گئی ہوں۔''

''اگر میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔'' رقیہ نے ایک گہری سانس لی۔

''تو کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میری مدد کریں گے اور یہ باتیں کسی اور کو نہیں بتائیں گے۔''

''دیکھیے آپ اچانک ہی میرے راستے میں آ گئی ہیں۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔

''مزید یہ کہ آپ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ہیں' آپ کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو شاید میں بلا تامل وعدہ کر لیتا لیکن جب تک آپ کے جملہ حالات کا مجھے علم نہیں ہو میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ اس وعدے کی مجھے کیا قیمت ادا کرنا پڑے۔''

''میں ایک گھریلو سیدھی سادھی کم عقل لڑکی ہوں۔'' رقیہ نے جواب دیا۔

''زندگی کے بارے میں میرا تجربہ بہت محدود ہے جو ہے وہ بھی مردوں کے بارے میں

کسی اچھے تاثر کی گنجائش پیدا نہیں کرتا۔ لیکن نہ معلوم کیوں میرے اندر سے کوئی آواز کہہ رہی ہے کہ میں آپ پر اعتماد کرسکتی ہوں میں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں پھر یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میری مدد کرنا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔''

''رقیہ نے بہت مختصر الفاظ میں ...... کافی ہچکچاتے ہوئے بشیر سے واقفیت پھر محبت پھر اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے سے لے کر وحید کے اڈے پر پہنچنے اور پھر وہاں آج کی رات اپنے سودے اور پولیس کے اچانک چھاپے تک پوری روداد سنا دی۔

میں نے گھر سے بھاگ کے جو حماقت کی تھی۔'' اس نے آخر میں کہا۔

''اُس کی سزا مجھے مل رہی ہے مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے ابھی تک میری عزت کو محفوظ رکھا ہے۔ مگر اب میرے لیے دوطرفہ خطرہ ہے۔ ایک جانب وحید اور اس کے ساتھی میری تلاش کریں گے دوسری طرف میں پولیس سے بھی مدد نہیں لے سکتی کہ وحید کے اڈے پر میری موجودگی کے بارے میں معلوم ہوتے ہی پولیس مجھے بھی گرفتار کرلے گی۔ ان حالات میں میں کہاں جاؤں کیا کروں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''

طارق نے گہرے تاسف اور بڑھتی ہوئی فکر و تشویش کے ساتھ رقیہ کی کہانی سنی۔

''کیا آپ اپنے گھر واپس نہیں جاسکتیں؟'' اس نے پوچھا۔

''والدین اور بھائی بہنوں کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ اور ہمت کر کے چلی بھی جاؤں تو کون یقین کرے گا کہ گھر سے پندرہ بیس دن غائب رہنے اور ایک جسم فروشی کے اڈے پر رکھے جانے کے باوجود میں پاکباز واپس آئی ہوں۔ میرا فرار اور گمشدگی ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ان کے زخم بھر دے' لیکن گھر میں میری موجودگی ان کے سینے پر مونگ دلنے اور ایک مستقل ذلت اور رسوائی کا سبب بنی رہے گی۔''

''یہ مسئلہ عجلت میں کوئی فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔'' طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اس پر اچھی طرح غور کرنا پڑے گا' دوسری طرف آپ کے لیے ایک پناہ گاہ کی فوری ضرورت ہے' میں اپنے گھر میں اکیلا نہ رہتا ہوتا تو آپ کو وہاں ٹھہرنے کی پیشکش کرتا۔ لیکن اب اگر میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں تو محلے والوں اور خاص طور سے حامدہ آنٹی کو کیا بتاؤں گا کہ آپ کون ہیں؟''

''یہ حامدہ آنٹی کون ہیں؟'' رقیہ نے پوچھا۔

''میرے پڑوس میں رہتی ہیں بہت ہی مخلص' ہمدرد اور محبت کرنے والی خاتون ہیں میرے کھانے پینے کا انتظام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے' اگرچہ میں کھانے اور ناشتے کے نام پر ایک حقیر سی رقم انہیں دیتا ہوں مگر مجھے احساس ہے کہ جس طرح کا کھانا مجھے ملتا ہے وہ اس سے دگنی رقم کا متقاضی ہے مگر میری مجبوری یہ ہے کہ میں موجودہ حالات میں اس سے زیادہ دے نہیں سکتا اسی سے تم اُن کے خلوص کا اندازہ کرسکتی ہو۔''

رقیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ طارق بھی خاموش ہوگیا' کچھ فاصلہ رکھی خاموشی میں طے ہوا۔

''میرا خیال ہے کہ آنٹی کو راز دار بنائے بغیر کام نہیں بنے گا۔'' آخر طارق نے کہا۔

''مجھے تمہارے تمام حالات انہیں بتانا پڑیں گے شاید وہ کوئی مناسب حل تجویز کرسکیں۔''

لیکن طارق کو معلوم نہیں تھا کہ رقیہ کو اس کے ساتھ اس سج دھج کے ساتھ آتے دیکھ کر میں قدرتی طور پر کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤں گی۔ اور یہ غلط فہمی نہ صرف میرے بلکہ ان کے دلوں میں بھی ایک ایسے جذبے کو پیدا کرنے میں معاون بنے گی جس کے نتیجے میں حالات ایک بالکل نئی صورت اختیار کرلیں گے۔

☆......☆......☆

طارق مجھے اپنی واپسی کی ممکنہ تاریخ بتا کر گیا تھا۔ اس لیے اس رات میں اُس کی واپسی کی منتظر تھی۔ بلکہ اس کے لیے کھانے میں کچھ ایسی چیزیں بھی پکار کر رکھی تھیں جو طارق کو بہت پسند تھیں۔ اسے رکشا سے ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ اترتے دیکھ مجھے قدرے حیرت ہوئی مگر صرف تھوڑی دیر کے لیے' فوراً ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ طارق کے والدین نے اس کے انکار کے باوجود اپنی من مانی کرتے ہوئے اس کی بھی شادی کردی اس لڑکی کا شوخ بھڑکدار لباس اور چہرے کی سجاوٹ بھی اس خیال کی تائید کر رہی تھی۔ لیکن مجھے یہ سوچ کر حیرت وافسوس ضرور ہوا کہ طارق جو مشرقی تہذیب وتمدن کا دلدادہ تھا وہ ایک دم سے اتنا ترقی پسند بن گیا کہ اپنی دلہن کو ایسے لباس میں بغیر حجاب کے لے کر آیا ہے۔ بہرحال میں اُن دونوں کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ طارق رکشا والے کو کرایہ دے کر اٹیچی کیس اٹھائے گھوما ہی تھا کہ میں اُن کے قریب پہنچ گئی۔

''تو آخر کار تم نے شادی کر ہی لی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

طارق نے چونک کر پہلے میری طرف اور پھر کن اکھیوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا مگر شاید سڑک پر کچھ کہنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے میری بات نظرانداز کر کے لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''رقیہ' یہ ہیں حامدہ آنٹی جن کا ذکر میں نے تم سے راستے میں کیا تھا۔''

رقیہ نے بھی کچھ حیرت زدہ شرمائے ہوئے انداز میں مجھے سلام کیا میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور پھر دعائیں دیں۔

''دلہن تو بہت خوبصورت لائے ہو۔'' میں نے پھر طارق کو مخاطب کیا۔

''آیئے گھر میں چلیں۔'' طارق نے جلدی سے کہا اور آگے بڑھ کر اپنے مکان کے دروازے میں لگا ہوا قفل کھولا ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ طارق نے بجلی کا بٹن دبا کر کمرے میں روشنی کی اور پھر میری طرف دیکھ کر بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے آنٹی! ابھی میری شادی نہیں ہوئی' لیکن مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ حالات کے پیش نظر آپ رقیہ کو میرے ساتھ دیکھ کر قدرتی طور پر یہی سوچیں گی بہرحال یہ میری بیوی نہیں ہیں' ایک پریشان حال مصیبت زدہ لڑکی ہے جس سے ابھی راستے میں میری ملاقات ہوئی ہے۔''

اور پھر اُس نے رقیہ کے اتفاقاً ملنے کے علاوہ وہ تمام حالات بھی کہہ سنائے جو اسے رقیہ کی زبانی معلوم ہوئے تھے۔

''میں انہیں اس لیے اپنے ساتھ لے آیا کہ اول تو یہ اس شہر میں بالکل اجنبی ہیں اور پھر جن حالات میں گرفتار ہیں ان میں مجھے اس کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے آؤں اور پھر آپ سے مشورہ کروں کہ ہم کس

طرح اِن کی مدد کرسکتے ہیں۔''

میں نے غور سے رقیہ کی طرف دیکھا۔ جو خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے سے معصومیت اور شرافت جھانکتی محسوس ہوئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ اس نے طارق کو اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

''تم نے وہی کیا جو ایک شریف انسان کو کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن اب ہم اس کے لیے کیا کریں یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ ہر پہلو پر غور کرنا پڑے گا۔''

''کیا آپ رقیہ کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں؟'' طارق نے پوچھا۔

''مگر کس حیثیت سے؟'' میں نے جواب دیا۔

''میں اس محلے میں اتنے عرصے سے رہ رہی ہوں کہ محلے والے میرے تمام حالات سے واقف ہیں۔ رقیہ کو اپنے عزیز یا کسی رشتے دار کی بہن یا بیٹی ظاہر کروں گی تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ سب جانتے ہیں کہ سسرال والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور میکے میں کوئی ایسا عزیز نہیں جس کی کوئی لڑکی میرے پاس مستقل قیام کے لیے آسکے۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔'' طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر پھر کیا کیا جائے؟'' اتنی دیر میں میرے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔

''تم رقیہ کو اپنے گھر میں رکھ سکتے ہو؟'' میں نے خفیف تبسم کے ساتھ کہا۔

''کیا......'' طارق چونکا۔

''مگر لوگ......؟''

''لوگ وہی سمجھیں گے جو تھوڑی دیر قبل میں نے سمجھا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ تقدیر نے بلاوجہ ہی تم دونوں کو نہیں ملایا ہے۔ رقیہ ایک شریف گھر کی لڑکی ہے۔ ناتجربہ کاری میں اس سے ایک غلطی ضرور ہوگئی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس غلطی سے کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت ہے۔ تم اگر اس سے شادی کرلو تو یہ ایک بہت ہی بڑی نیکی ہوگی۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا کوئی فیصلہ زبردستی مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک تم دونوں اس پر دل سے آمادہ نہ ہو تب تک اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اس عذر کی آڑ میں سرِ دست رقیہ کو تمہارے گھر میں پناہ مل سکتی ہے اور کسی کو شک و شبہ کیا کچھ کہنے سننے کی گنجائش بھی نہیں ہوگی۔ پھر ایک ساتھ رہتے ہوئے اگر کچھ دن کے بعد ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ اور پرکھ لینے کے بعد تم شادی کے فیصلے تک پہنچو تو میں پوشیدہ طریقے سے اپنی کسی ملنے والی کے گھر جا کر قاضی کو بلا کر نکاح بھی پڑھوا دوں گی۔''

''مگر میرے والدین......''

''انہیں آمادہ کرنا تمہارا کام ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''تم اُن کے جس قدر کام آرہے ہو امید ہے کہ تمہارے والدین تمہاری پسند سے اختلاف نہیں کریں گے۔ مگر یہ سب بہت بعد کی باتیں ہیں۔ سرِ دست اس تجویز سے ہمیں رقیہ کو پناہ دینا مقصود ہے۔ پھر کچھ مدت کے بعد ممکن ہے کوئی دوسرا حل سمجھ میں آجائے۔ یا اگر تم لوگ شادی نہ کرنا چاہو یا تمہارے والدین آمادہ نہ ہوں تب پھر دوبارہ غور کرلیں گے کہ اب آئندہ کیا کیا جائے، ممکن ہے میں رقیہ کے لیے کوئی دوسرا اچھا

رشتہ تلاش کرلوں...... یا پھر تم رقیہ کے شہر جا کر اس کے والدین سے مل کر تمام حالات بتاؤ اور انہیں آمادہ کرلو کہ وہ اپنی بیٹی کو واپس قبول کرلیں۔ اور بھی کئی طریقے سوچے جاسکتے ہیں مگر فوری طور پر میری عقل میں اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں آرہا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ تم دونوں ایک گھر میں دن و رات ساتھ رہو گے اس لیے محتاط رہنا ہوگا کہ کسی بھی جانب سے کوئی غلط قدم نہ اٹھایا جائے۔

اور پھر ویسا ہی کیا گیا جیسا کہ میں نے طارق اور رقیہ کو مشورہ دیا تھا اگرچہ اس وقت مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ حالات جلد ہی ایک نئی کروٹ بدلیں گے۔ ایسی کروٹ کہ ایک دوسرے کو پسند کرنے کے باوجود ان دونوں کے راستے میں ایسی نادیدہ رکاوٹ پیدا ہوجائے گی جسے دور کرنا ہم میں سے کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

پاس پڑوس اور محلے والوں نے رقیہ کو طارق کی بیوی کی حیثیت سے بلا تامل قبول کرلیا۔ کئی پڑوس جانتے تھے کہ بہن کی شادی کے ساتھ والدین اس کی بھی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی کو یقین دلانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ یہ رقیہ طارق کی دلہن ہے۔

ایک ہی دن گزرا تھا کہ شام کے وقت ایک صورت سے ہی غنڈہ نظر آنے والا آدمی طارق سے ملنے اس کے گھر آیا۔

''میں وحید دادا کا آدمی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اور اس لیے کہ شاید تم وحید دادا کو جانتے نہ ہو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی شخص اُن کے حکم کی خلاف ورزی کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ کل رات تم ایک لڑکی کو اپنے گھر لائے ہو۔ وہ وحید دادا کی ملکیت ہے۔ سرِ دست دادا پولیس کی حراست میں ہیں مگر بہت جلد ضمانت پر چھوٹ جائیں گے' انہیں معلوم ہے کہ لڑکی تمہارے گھر ہے اور اُن کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں وہ تمہارے گھر میں زیادہ محفوظ ہے اس لیے اسے دادا کی امانت جان کر حفاظت سے اپنے پاس رکھو۔ دادا رہا ہونے پر خود اسے آ کر لے جائیں گے اور ہاں خبردار جو تم نے اس لڑکی کو ہاتھ لگایا یا اس معاملے کو پولیس تک لے جانے کی کوشش کی۔ دونوں صورتوں میں تم زندہ نہیں رہو گے۔''

''وہ لڑکی اب میری پناہ میں ہے۔'' طارق نے حوصلے سے جواب دیا۔

''تمہارا دادا اُسے جسم فروشی پر مجبور کرنا چاہتا ہے مگر وہ ایک شریف لڑکی ہے۔ اس بے عزتی سے مرجانا زیادہ پسند کرتی ہے۔ آخر تم لوگ اُس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے' تمہارے لیے ایک لڑکی کی کمی بیشی سے کیا فرق پڑے گا۔''

''میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا۔ دادا کا حکم سنانے آیا تھا وہ سنا دیا۔'' اس آدمی نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں چاہوں تو اس وقت ہی تمہیں ختم کر کے لڑکی کو لے جاسکتا ہوں مگر دادا کا حکم نہیں ہے۔ تمہیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ دادا کے حکم کے خلاف عمل کرنے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ ورنہ اُن کا غصہ صرف تمہیں ہی نہیں تمہارے تمام خاندان کو بھی تباہ کرسکتا ہے۔ دادا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور آج تک کوئی اُن کی مرضی کے خلاف چل کر سزا سے نہیں بچ سکا ہے۔''

میں اور رقیہ بھی دوسرے کمرے میں اس آدمی کی باتیں سن رہی تھیں۔ جب وہ چلا گیا تو

رقیہ نے افسردہ اور مایوس لہجے میں طارق سے کہا۔
''آپ میری وجہ سے بلاوجہ کسی مصیبت میں نہ پڑیں۔ وحید بہت بڑا بدمعاش ہے۔ بڑے اثر ورسوخ کا مالک ہے۔ میری وجہ سے آپ اس سے دشمنی مول نہ لیں۔ جو میرے نصیب میں لکھا ہے وہ پیش آ کر ہی رہے گا۔''
''مگر وحید کو یہ پتا کیسے چلا کہ رقیہ یہاں ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کے کسی ساتھی نے رقیہ کو میرے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔'' طارق نے جواب دیا۔
''پھر اس نے ہمارا پیچھا کر کے معلوم کر لیا کہ میں رقیہ کو یہاں لایا ہوں، مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے میں اتنی آسانی سے رقیہ کو ان بدمعاشوں کے حوالے نہیں کروں گا۔''
''مگر آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔'' رقیہ بولی۔
''پولیس سے مدد لینے جائیں گے تو وہ مجھے بھی گرفتار کر لے گی اور پھر ممکن ہے آپ سے بھی باز پرس کی جائے کہ حالات سے واقف ہونے کے بعد بھی آپ نے پولیس سے رابطہ قائم کیوں نہیں کیا۔''
''قبل از مرگ واویلا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے کہا۔
''جب سے اس علاقے میں نیا ایس ایچ او آیا ہے پولیس بڑی مستعد ہو گئی ہے مجھے امید نہیں کہ وہ وحید کو آسانی سے ضمانت پر رہا ہونے دے گا۔ اور جب تک وحید رہا نہ ہو رقیہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس دوران ہم رقیہ کو بچانے کی کوئی ایسی ترکیب سوچنے کی کوشش کریں گے جس سے رقیہ بھی محفوظ رہے اور تم پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔''
''ایسی کیا ترکیب ہو سکتی ہے؟'' طارق نے سوال کیا۔
''مثلاً یہی ہو سکتا ہے کہ میں رقیہ کو اپنے کسی جاننے والے کے گھر بھیج دوں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
''اور جب وحید آئے تو تم اس سے یہ کہہ دو کہ رقیہ تمہاری اور اس کے آدمی کے درمیان ہونے والی باتیں سن کر ڈر گئی اور تمہاری لاعلمی میں گھر سے چلی گئی۔''
''اول تو وحید یقین نہیں کرے گا۔'' رقیہ نے کہا۔
''دوسرے آپ لوگوں کے لیے پھر وہی سوال پیدا ہو گا کہ آپ کیا کہہ کر مجھے کسی کے گھر میں رکھیں گے۔''
یہ دشواری واقعی ایک بڑی رکاوٹ تھی، میں کوئی جواب نہیں دے سکی۔
''اگر نیا ایس ایچ او ایسا ہی فرض شناس پولیس آفیسر ہے۔'' طارق نے کہا۔
''تو میں اس سے ملاقات کر کے اور تمام معاملات بیان کر کے مدد کی درخواست کر سکتا ہوں، ممکن ہے وہ ایک شریف لڑکی کو رسوائی سے بچانے کے لیے رقیہ کو شامل تفتیش نہ کرے اور کوئی ایسی ترکیب بھی بتا دے کہ ہم وحید کی انتقامی کارروائی سے محفوظ ہو جائیں۔''
''ہاں یہ ممکن ہے۔'' میں نے کچھ جوش کے ساتھ کہا۔
''بشرطیکہ وحید یا اس کے ساتھیوں کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ تم نے پولیس سے رابطہ قائم کیا ہے۔''
''وحید کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟'' طارق نے

کہا۔

"جب اس نے دھمکی دی ہے کہ پولیس سے مدد مت لینا تو اس کا انتظام بھی کیا ہوگا کہ تم کوئی ایسی حرکت کرو تو اسے پتا چل جائے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی غیر ممکن بات نہ ہوگی کہ اس کا کوئی آدمی تمہارے گھر کی نگرانی کر رہا ہو۔"

عجیب وغریب صورتحال تھی، جس سے نجات کا کوئی پہلو نظر نہیں آ رہا تھا مگر ظاہر تھا کہ اس پریشانی کو اوڑھ کر روزانہ کے معمولات بند نہیں کیے جاسکتے تھے۔ یہ ہی سوچا کہ بچاؤ کے بارے میں غور کرتے رہیں گے سر دست تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اس لیے غیر ضروری طور پر پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔

☆......☆......☆

ایک ہفتے سے زیادہ دن گزر گئے اور وحید نے طارق کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ اس مدت میں بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی پولیس سے مدد لینے کے علاوہ کوئی معقول حل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے ایک موہوم سی امید دل میں پیدا ہونے لگی تھی کہ اپنے تمام تر اثر ورسوخ کے باوجود اس مرتبہ وحید کا تعلق جس پولیس آفیسر سے پڑا ہے وہ اسے آسانی سے چھوڑنے والا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے ممکن ہے وحید ضمانت پر رہا نہ ہو سکے اور یوں اس سے ہماری جان بچی رہے۔ لیکن تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔

دسویں روز وحید ضمانت پر رہا ہو گیا، اور اُسی رات کو ہی آ دھمکا۔ طارق نے اس کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ خوشامد بھی کی مگر وحید کا ایک ہی جواب تھا کہ رقیہ اس کا بزنس ہے اور وہ اس سے ہزاروں نہیں لاکھوں کمانے کی توقع رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اب تک وہ اس کی ذات پر ہزاروں روپے خرچ بھی کر چکا ہے۔ اگر طارق کو اس کی ذات سے اتنی ہی دلچسپی ہے تو کم سے کم وہ ایک لاکھ روپے ادا کر دے اور رقیہ کو اپنے پاس رکھ لے۔ ظاہر تھا کہ طارق اتنی بڑی رقم کہاں سے لاسکتا تھا۔

میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ بیلنس نہیں تھا۔ دوسری طرف رقیہ اپنی وجہ سے طارق کو کسی قربانی یا ایثار کے لیے مجبور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے لگے تھے اور یہ محبت ہی رقیہ کو طارق سے دست بردار ہونے اور طارق کو رقیہ کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن رقیہ کی ایک دلیل کا طارق کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ طارق اپنی ذات سے تنہا نہیں ہے۔

اس کی سلامتی سے اس کے والدین اور ایک بہن کا مستقبل وابستہ ہے اور وہ یعنی رقیہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ طارق اس کی ایک جان کے لیے نہ صرف خود کی بلکہ اپنے خاندان کی تباہی کو بھی دعوت دے۔

جب وحید رقیہ کی جان چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو رقیہ نے اس سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ چلنے اور جو کچھ میرے نصیب میں لکھا ہے اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن تمہیں تھوڑی سی مدد کرنا ہوگی۔"

"وہ کیا؟" وحید نے پوچھا۔

"پڑوس اور اہل محلہ مجھے طارق صاحب کی بیوی خیال کرتے ہیں۔" رقیہ نے جواب دیا۔

"اگرچہ خدا گواہ ہے کہ ایک گھر کی چھت

کے نیچے رہتے ہوئے بھی طارق صاحب نے مجھ سے نگاہ بھر کر بات بھی نہیں کی۔ میں آج بھی اسی طرح ہوں جس طرح تمہارے اڈے سے نکلی تھی۔ اب اگر میں اچانک رات کی تاریکی میں تمہارے ساتھ چل دوں گی تو طارق صاحب محلے والوں کو کیا جواب دیں گے اور اتنے دن اِن کی پناہ میں رہنے کا اتنا حق تو بنتا ہے کہ تم اُن کی عزت پر حرف نہ آنے دو۔''

''آخر تم کیا چاہتی ہو؟'' وحید نے کچھ نرم پڑتے ہوئے پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم آج کے بجائے مجھے دو تین دن کے بعد لے جاؤ۔'' رقیہ نے کہا۔

''ہم پڑوسیوں سے کہہ دیں گے کہ میں اپنے میکے جا رہی ہوں پھر طارق صاحب مجھے اپنے ساتھ اسٹیشن لے جائیں گے۔ تم وہاں آ جانا اور پھر جہاں چاہو اپنے ساتھ لے جانا۔''

''اِس میں کوئی چالاکی تو نہیں ہے؟'' وحید نے رقیہ کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''ہم تم سے چالاکی کیسے کر سکتے ہیں' اگر کرنا ہوتی تو دس دن کے اندر کوئی ترکیب سوچتے' جب اتنے دن کچھ نہ کر سکے تو اب دو تین روز میں کیا کر لیں گے۔''

''اچھی بات ہے۔'' آخر وحید مان گیا۔

''میں تمہیں دو دن کی مہلت دے سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔''

''مجھے منظور ہے آج سے تیسرے دن تم مجھے اسٹیشن سے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔''

''کس وقت؟'' وحید نے پوچھا۔ رقیہ نے طارق کی طرف دیکھا۔

''ایک ٹرین صبح دس بجے جاتی ہے اور دوسری سہ پہر چار بجے۔'' طارق نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم چار بجے رقیہ کو لے کر اسٹیشن پہنچ جانا۔'' وحید نے کہا اور چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم تینوں نے ...... ایک بار پھر اس مصیبت سے بچنے کا کوئی طریقہ سوچنے کی کوشش کی۔ مگر ہماری سمجھ میں کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔ اچانک طارق بولا۔

''اب پولیس سے مدد لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے معلوم کیا تھا علاقے کے ایس ایچ او کا نام انسپکٹر سعید ہے۔ وحید کے خلاف کیس کا چارج ان ہی کے پاس ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ بہت ہمدرد اور مخلص اور ایماندار پولیس آفیسر ہیں۔ اگر میں اُن سے مل کر سارے حالات بیان کروں تو امید ہے کہ وہ رقیہ کو بچانے کے لیے ہماری پوری مدد کریں گے۔''

یہ ایک خطرناک اقدام تھا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں اور طارق اس دن پولیس اسٹیشن جا کر انسپکٹر سعید سے ملے اور راز داری کا وعدہ لے کر تمام حالات انہیں بتا دیے۔ ہماری زبانی واقعات سن کر اور یہ جان کر کہ وحید رقیہ کو لینے اسٹیشن آئے گا انسپکٹر سعید بہت جوش میں بھر گئے۔

''کچھ بڑے لوگ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کی پیروی کے لیے بہت بڑا وکیل کیا ہے۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ میری تمام کوشش کے باوجود کورٹ نے اس کی ضمانت منظور کر لی اگرچہ ضمانت کے لیے اسے بہت بڑی رقم ادا کرنی پڑی۔ اب اگر ضمانت پر رہائی کے دوران وہ پھر ویسا ہی جرم کرتا ہے جس کے الزام میں اس پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے تو نہ صرف اس کی ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور...... میں اسے دوبارہ

گرفتار کرسکوں گا بلکہ پھر اس کے خلاف ہمارا مقدمہ بھی بہت مضبوط ہوجائے گا۔‘‘

’’لیکن اس طرح تو رقیہ کو بھی آپ تفتیش میں شامل کرلیں گے اور وہ بدنام ہوجائے گی۔‘‘ طارق نے اعتراض کیا۔

’’اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔‘‘ انسپکٹر سعید نے جواب دیا۔

’’مگر آپ گھبرائیں نہیں رقیہ کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ وحید کے اڈے سے پکڑی جانے والی کئی لڑکیاں شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور ان سے زبردستی جسم فروشی کرائی جارہی تھی ہم نے ان سب کو رہا کردیا ہے۔ وہ صرف گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں گی۔ اس کے علاوہ میں کوشش کروں گا کہ اخبارات میں رقیہ کا نام اور تصویر نہ آنے پائے۔‘‘

اِن حالات میں یہ وعدہ بھی غنیمت تھا ہمیں اس پر اکتفا کرنا پڑا۔ پولیس اسٹیشن سے واپسی پر ہماری صرف ایک ہی خواہش تھی کہ پروردگار کی رحمت سے یہ تمام معاملہ اس طرح بنتا جائے کہ رقیہ کو کم سے کم رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

ہمیں انسپکٹر سعید نے بتایا تھا کہ مقررہ دن اسٹیشن پر بھاری تعداد میں سادہ لباس پولیس موجود ہوگی اور وہ اس وقت تک دخل نہیں دے گی جب تک رقیہ طارق کے ساتھ ہوگی۔ پھر جیسے ہی وحید طارق سے رقیہ کو لے کر روانہ ہوگا۔ اسے چاروں طرف سے گھیر کر گرفتار کرلیا جائے گا۔ یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ مسلح ہو اور بھاگنے یا مقابلہ کرنے کی کوشش کرے مگر انسپکٹر سعید کا خیال تھا کہ وہ اپنا مقدمہ مزید بگاڑنے کے لیے کوئی خطرناک حرکت نہیں کرے گا۔‘‘

آخر تیسرا دن بھی آگیا۔ میں نے پاس پڑوس والوں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ رقیہ کچھ دنوں کے لیے اپنے میکے جارہی ہے۔ اور اپنی ایک ملنے والی سے بات کرکے جو کافی فاصلے پر دوسرے علاقے میں رہتی تھیں یہ انتظام بھی کرلیا تھا کہ وحید کے گرفتار ہونے کے بعد رقیہ کو اسٹیشن سے ان کے گھر لے جائیں گے جہاں رقیہ کو مقدمے کا فیصلہ ہونے تک رکھا جائے گا۔

لوگوں نے طارق کی شادی کی خبر کی طرح اس بات پر بھی یقین کرلیا۔ آخر رقیہ ان کے خیال میں نوبیاہی دلہن تھی اور ایک دم سے والدین سے لمبی مدت کے لیے الگ نہیں رکھی جاسکتی تھی اس لیے اتنی جلدی اس کی واپسی پر کسی کو بھی حیرت نہیں ہوئی۔

مقررہ وقت پر میں اور طارق رقیہ کو ساتھ لے کر ٹیکسی میں اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی سے اتر کر پلیٹ فارم پر پہنچے۔ میں نے خوب غور سے چاروں طرف دیکھا۔ مگر نہ اسٹیشن کی عمارت کے باہر اور نہ پلیٹ فارم پر کوئی خاص گہما گہمی نظر آئی۔

اگر پولیس واقعی موجود تھی تو انسپکٹر سعید نے اسے بڑی ہوشیاری سے چھپایا تھا‘ ہم لوگ تقریباً پونے چار بجے پہنچ گئے تھے۔ بظاہر وحید بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا مگر ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔

اور وہ کسی بھی لمحہ کسی طرف سے نمودار ہوسکتا تھا۔ ٹرین کے بارے میں معلوم ہوا کہ آدھا گھنٹہ لیٹ ہے ہم گیٹ سے کافی فاصلہ پر ایک جانب کھڑے ہوگئے۔ رقیہ کو میں نے ایک برقع فراہم کردیا تھا اور وہ نقاب چہرے پر ڈالے طارق کے داہنی جانب کھڑی تھی۔

ابھی چار بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ وحید خدا جانے کس طرف سے نکل کر اچانک ہمارے

سامنے آ کھڑا ہوا۔
''آ ؤ چلو۔''اس نے رقیہ سے کہا۔
''ایک بار پھر سوچ لو وحید۔'' طارق نے کہا۔
''اگر تم رقیہ کو چھوڑ دو تو ہم دونوں ساری زندگی تمہارے احسان مندر ہیں گے۔''
''اب بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔''وحید نے سخت لہجے میں جواب دیا۔
''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ رقیہ کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے رقم ادا کردو اور اسے واپس لے جاؤ۔''
''میں اتنی رقم ایک وقت میں ادا نہیں کرسکتا۔''طارق نے کہا۔
''البتہ ایک ہزار روپے ماہانہ دے سکتا ہوں۔''
''کمال کرتے ہو۔''وحید مسکرایا۔اس طرح ایک لاکھ کی ادائیگی کے لیے سو مہینے درکار ہوں گے۔''
''تم لاکھوں کروڑوں روپے کما چکے ہو کیا ایک غریب اور شریف لڑکی پر رحم نہیں کرسکتے ؟''
''میں بزنس کرتا ہوں' خیرات نہیں۔'' وحید نے ہاتھ بڑھا کر رقیہ کا بازو پکڑلیا۔
''چلو قدم بڑھاؤ۔'' طارق نے گہری سانس لی۔
''اچھا رقیہ خدا حافظ۔''وہ بولا۔
''خدا تمہاری حفاظت کرے اگر تمہاری بدنامی اور رسوائی کا خیال نہ ہوتا تو میں جان پر کھیل جاتا مگر تمہیں یوں جانے نہ دیتا۔مگر میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں جو ایک مرتبہ تمہیں وحید کے چنگل سے رہائی دلوا سکتا ہے وہ دوبارہ بھی کوئی معجزہ دکھا سکتا ہے۔'' وحید نے ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔
''وہ ایک اتفاق تھا طارق صاحب۔'' اس نے کہا۔
''اور اتفاقات بار بار نہیں ہوتے۔''
طارق خاموش رہا۔رقیہ جیسے بہ جبر وحید کے ساتھ چل دی۔رقیہ اور طارق کے دل پر اس وقت جو کچھ گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔میرے اپنے دل کی کیفیت یہ تھی کہ اندر ہی اندر ڈوبتا چلا جارہا تھا۔
اگرچہ یقین تھا کہ انسپکٹر سعید رقیہ کو اس آسانی سے نہیں لے جانے دے گا۔لیکن ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ محسوس ہورہی تھی۔دل کسی نامعلوم خطرے سے سہا جارہا تھا۔لگ رہا تھا کہ کوئی طوفان اٹھنے والا ہے۔میری اور طارق کی نظریں وحید پر جمی ہوئی تھی اور ابھی وحید چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اچانک ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا تھا نہ جانے کہاں سے انسپکٹر سعید اپنی یونیفارم میں نمودار ہوا اور وحید کا راستہ روک لیا۔
''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔
وحید یوں ایک دم سے انسپکٹر سعید کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا۔مگر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔
''یہ میری کزن ہیں انسپکٹر صاحب' ہم لوگ کچھ عزیزوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے آئے تھے۔''
''یہ جھوٹ بولتا ہے انسپکٹر صاحب۔'' اچانک رقیہ برقع کا نقاب الٹ کر چیخی۔
''اس نے مجھے ایک بدمعاش سے خریدا ہے جو مجھے میرے گھر سے اغواء کرکے لایا تھا اور اب یہ مجھ سے جسم فروشی کرانا چاہتا ہے۔''

رقیہ کا یہ کہنا تھا کہ وحید نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور یکے بعد دیگرے رقیہ پر دو گولیاں چلائیں۔ رقیہ نے ایک چیخ ماری اور اپنا سینہ پکڑے پلیٹ فارم پر ڈھیر ہوگئی۔ وحید نے ایک جست لگائی اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ میں اور طارق رقیہ کو سنبھالنے لپکے۔ انسپکٹر سعید نے بھی ریوالور نکال لیا اور ساتھ ہی پورے ریلوے اسٹیشن پر جیسے ایک ہنگامہ مچ گیا۔

"رک جاؤ وحید ورنہ میں گولی ماردوں گا۔" انسپکٹر سعید نے للکارا۔ مگر وحید تیزی سے بھاگا چلا جارہا تھا۔ انسپکٹر سعید نے نشانہ لیتے ہوئے فائر کیا۔ گولی وحید کی ٹانگ میں لگی وہ گرنے لگا تو اس نے پلٹ کر انسپکٹر سعید پر گولی چلائی۔ مگر نشانہ خطا گیا۔

انسپکٹر سعید نے دوسرا اور پھر تیسرا فائر کیا۔ دونوں گولیاں وحید کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور وہ پلیٹ فارم پر گر کر بے حس وحرکت ہوگیا۔

میں اور طارق رقیہ کے قریب پہنچے مگر وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔ دوسری طرف وحید بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ میں اور طارق جیسے ایک سکتے کے عالم میں رقیہ کے سرہانے بیٹھے اس کے بے نقاب چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جو بالکل ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے کوئی بھٹکا ہوا مسافر پُرپیچ راہوں کے خم سے تنگ آ کر تھک ہار کر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ٹھہر گیا ہو۔

☆☆......☆☆

رقیہ کی داستانِ حیات ختم ہوگئی۔ لیکن اس کی المناک موت کے صدمے نے طارق کو بھی زندہ درگور کردیا تھا۔ وہ اس کے بعد سال بھر تک وہاں رہا لیکن میں نے کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کی چوتھی بہن کی شادی بھی طے ہوچکی ہے۔ وہ ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر بظاہر اپنی بہن کی شادی کرنے گیا تھا۔

مگر اس کے بعد پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ میں نے اس کے والدین کے گھر کے پتے پر کئی خطوط بھیجے۔ بہ مشکل ایک کا جواب موصول ہوا۔ جو اس کی ماں نے کسی سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ اس خط کے مطابق طارق کی چوتھی بہن کی شادی بھی بخیر وخوبی ہوگئی تھی۔ اس کے والدین خود اس کی شادی بھی طے کرچکے تھے مگر طارق آمادہ نہیں تھا۔ والدین نے اس کے انکار سے تنگ آ کر اس بات پر رضا مندی کا اظہار کیا کہ اگر طارق شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو سرِ دست نکاح کرلے' رخصتی اس وقت ہوگی جب وہ چاہے گا۔ اس پر طارق خاموش ہوگیا اور اس کے والدین نے اس خاموشی کو آمادگی سمجھتے ہوئے اس کی روانگی سے ایک دن پہلے نکاح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر طارق نکاح کے روز صبح سے جو گھر سے نکلا تو پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ والدین نے اس کے تمام دوستوں' ملنے والوں اور آس پاس کے علاقوں میں ہر جگہ تلاش کرایا مگر اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔

بس یہ آخری اطلاع تھی جو مجھے طارق کے بارے میں ملی۔ اب اس واقعہ کو برسوں بیت چکے ہیں' مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آیا طارق پھر دوبارہ اپنے گھر واپس لوٹا یا نہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو طارق اور رقیہ دونوں ہی میرے لیے ایک ایسی یاد بن کر رہ گئے ہیں کہ جب بھی اُن کا خیال آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

☆☆......☆☆

لاہور سے تیسری طویل کہانی

مقدر یوں راکھ ہوا

بہادر شاہ ظفر کا خیال

سوا ہمارے نہ سن ہماری حکایتِ غم سنی سنائی
جو ہم پہ گزری وہ پوچھ ہم سے کہے ہے عالم سنی سنائی

حنا بشریٰ

انسان اس دنیا میں آئے کھائے پیے اور خوشیاں منائے پھر امتحان دیے بغیر چلا جائے یہ

ناممکن ہے بلکہ یوں کہیے کہ امتحان تو اٹل ہے۔ جس سے انبیاء کرام اور اولیا کرام بھی گزرے ہیں۔ کبھی کبھی انسان کچھ آزمائشوں اور امتحان سے خود اپنی وجہ سے گزرتا ہے' اور کبھی دوسرے کا بویا کاٹتا ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں اس نظامِ فطرت سے خلاصی ممکن نہیں ہے۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ لکھاری کس قسم کی گفتگو لے کر بیٹھ گیا ہے اصل موضوع کی طرف آتا کیوں نہیں ہے' تو سنیے ایسا قصہ عجیب جو صرف سچا ہی نہیں بلکہ اس قدر حیرت ناک ہے کہ آپ انگشتِ بدنداں یہ مجبور ہو جائیں گے۔ اِس قصے کو پڑھ کر آپ کو بھی اندازہ ہوگا کہ کچھ لوگوں کے غموں کے سامنے ہمارے دکھ یوں ہیں جیسے بڑی چٹانوں یا پہاڑوں کے سامنے چھوٹی موٹی کنکریاں......

میرا معمول تھا کہ ہر جمعرات کو مغرب کے بعد داتا دربار پر ضرور حاضری کے لیے جایا کرتا تھا۔ کوئی لاہور کا رہنے والا ہو اور داتا دربار پر حاضری کے لیے نہ جائے یہ تو ناممکن ہے۔ کوئی خود جاتا ہے اور کوئی بلا لیا جاتا ہے۔ گلاب کی دلفریب مہک فضا میں رچی بسی تھی۔ جمعرات کو تو پورا دربار عطر میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔ طاقچوں میں بڑے چراغ ماحول کو رونق بخش رہے تھے۔ کچھ عقیدت کے پھول میں نے بھی اِس عظیم ہستی پر نچھاور کیے اور ایک کونے میں بیٹھ کر قوالوں کی خوبصورت آواز میں محفل سماع سننے لگا۔

قسمت میں میری چین سے جینا لکھ دے
ڈوبے نہ کبھی میرا سفینہ لکھ دے

میں آنکھیں بند کیے ان الفاظ کی گہرائی میں کھویا ہوا تھا کہ ایک جانب سے مسلسل کھانسنے کی آواز پر متوجہ ہوا۔ وہ انتہائی خوبرو نوجوان تھا' سیاہ چادر لیے وہ دیوار سے ٹیک لگائے ہوا تھا۔ کھانسی کی شدت نے اُس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ اُس نے کھانستے ہوئے سینے پر ہاتھ پھیرا مگر کھانسی میں کوئی کمی نہ آئی۔ تکلیف اُس کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا مجھ سے ضبط نہ ہوسکا تو تیزی سے اُس کی جانب بڑھا۔ وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔

''بھائی پانی پی لو......!'' میں نے محبت بھرے انداز میں کہتے ہوئے پانی اس کے لبوں سے لگا دیا اور ساتھ ہی ساتھ اُس کی پشت بھی سہلانے لگا۔ اسے کچھ آرام آیا تو وہ میری طرف مشکور نظروں سے دیکھنے لگا۔ کھانسی رُکی تو وہ قدرے پُرسکون تھا۔ میں کچھ دیر تو اُس کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید وہ کوئی بات کرے مگر وہ تو اتنا خاموش تھا جیسے گہرا خاموش سمندر...... میں نے گھڑی کی جانب دیکھا اور واپسی کا قصد کرتے ہوئے اُس نوجوان سے ہاتھ ملایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا بدن بخار میں جل رہا تھا۔

''کسی کے ساتھ آئے ہو دوست؟'' میرے سوال کے جواب میں اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں تو سخت بخار ہے' سردی بھی بڑھ رہی ہے تمہیں اب گھر چلے جانا چاہیے۔'' میں ہمدردی سے بولا۔ وہ میری بات پر خاموش رہا تھا۔

''اگر برا نہ مانو دوست تو تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔'' میں نے خلوص دل سے اُسے آفر کی۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں آپ کا شکریہ۔'' اُس کی آواز انتہائی خوبصورت اور اندازِ گفتگو بے حد مہذب تھا۔ اُس نے کھل کر انکار کیا تو اب میرا اصرار مناسب نہیں تھا۔ میں نے اُس سے مصافحہ کیا اور دربارِ عالیہ سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

میں گھریلو اور آفس کی مصروفیات میں ایسا مگن ہوا کہ وہ نوجوان میرے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ ویسے بھی میری اُس سے وہ پہلی ملاقات تھی اور پہلی ملاقات میں کوئی شخص کتنا یاد رہ سکتا ہے۔ پورا ہفتہ گزرا اور اگلی جمعرات آ پہنچی۔ میں معمول کے مطابق داتا دربار جا پہنچا۔

فاتحہ خوانی سے فارغ ہوا تھا کہ پھر اُسی اجنبی نوجوان پر نظر جا ٹھہری تھی۔ وہ آج پہلے سے زیادہ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ میں فوراً اُس کے قریب جا پہنچا۔ اُس سے مصافحہ کیا تو احساس ہوا اُسے آج بھی بخار تھا۔ نا جانے کیوں وہ نوجوان دل کو اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ بے شک وہ پورا ہفتہ مجھے یاد نہ رہا مگر جب ملا تو گردو پیش سے بیگانہ ہو گیا۔ میری گرمجوشی محسوس کر کے وہ دھیما سا مسکرایا تو چہرے پر کرب و اذیت کے سائے گہرے ہونے لگے۔

''ہر جمعرات یہاں آتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں حیران ہوا۔

''ہر روز یہاں آتا ہوں۔'' اُس نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں گھر بار نہیں ہے تمہارا؟'' میں نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے کہ یہ اجنبی ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گیا ہے۔

''گھر سے وحشت ہوتی ہے دوست...... سارا دن یہاں گزارتا ہوں پھر رات گہری ہونے لگتی ہے تو پھر کچھ وقت کے لیے چلا جاتا ہوں اور صبح اذانِ سحر ہوتے ہی دوبارہ آ جاتا ہوں۔'' وہ تھکے تھکے انداز سے بولا۔

اُس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ داتا دربار سے قریبی رہائشی ہے۔ مگر سارا دن یہاں گزارتا ہے مجھے یہ بات ہضم نہ ہوئی۔ لیکن حقیقت جاننے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

''تمہیں آج بھی بخار ہے...... تم اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے' دیکھو معمولی سے معمولی بخار کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہڈیوں میں بیٹھ جائے تو مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔'' میں نے کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح اُسے مفت مشورہ دیا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھے اِس قدر غور سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی کہ بخار کی آڑ میں جو میں اُس کو کریدنا چاہ رہا ہوں اُسے اُس کا علم ہو گیا ہے۔

''مصیبت......!'' اُس نے میرا کہا ہوا لفظ دوہرایا تو آنکھیں افسردہ دکھائی دیں۔

''میرے دوست کیا ہوا کوئی پریشانی ہے مجھے بتاؤ' اپنا علاج کرواؤ...... تمہاری یہ حالت دیکھ کر تمہارے گھر والوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔'' میں دردمندی سے بولا۔

''گھر والے......!'' اُس نے یہ لفظ اِس انداز سے کہا کہ میں چونک گیا۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا اور پھر یوں رویا کہ جیسے کسی کی موت ہو گئی ہو۔

میں اُس کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ اُسے حوصلہ دیتا تو وہ اور بکھر جاتا۔ میں نے پہلی بار زندگی میں کسی نوجوان کو یوں روتے دیکھا تھا۔ وہ بچوں کی طرح تڑپ رہا تھا۔

''چپ ہو جاؤ میرے دوست...... حوصلہ کرو......'' میں نے بدقت یہ لفظ کہے کہ شاید اُس کا کوئی بھی اِس دنیا میں نہیں ہے۔

''معافی چاہتا ہوں میں نے تمہارے درد کو بڑھا دیا۔ میں صرف تمہارے علاج کے لیے پریشان ہوں۔'' میں معذرت بھرے انداز میں

گویا ہوا۔
''میرا علاج ممکن نہیں ہے...... کیوں کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔'' طویل خاموشی کے بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا تو اُس کے کرب کو محسوس کر کے میری آنکھیں نم ہوگئیں۔
''میں سمجھا نہیں دوست......'' میں اُلجھن بھرے انداز میں بولا۔
''میرا قصہ الم سنو گے تو تمہاری روح بھی کانپ اٹھے گی' بہتر ہے مجھے خاموش ہی رہنے دو...... میرا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ میرا دکھ ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ پاک ذات میرے کرب کو جانتی ہے۔'' اُس نے نمناک آواز میں کہتے ہوئے آسمان کی جانب اشارہ کیا تو آنسو چہرے کو تر کر گئے۔ عورت کا رونا عجیب نہیں مگر...... مرد روئے تو عجیب ہی نہیں عجیب تر ہے...... ضرور کوئی ایسا دکھ ہے جس کا مداوا ممکن نہیں۔
''ٹھیک ہے تمہارا مسئلہ کوئی انسان حل نہیں کرسکتا...... کوئی تمہارے دکھ کا مداوا نہیں کرسکتا تو پھر دعا تو کرسکتا ہوں...... تاکہ تم تکلیف سے نجات پا جاؤ میں تمہارے کسی کام نہ آسکا تو دعا کروں گا کہ دعاؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ کئی دفعہ انسان اپنے لیے دعا کرتا ہے مگر دوسرے مسلمان کی دعا بہت تیزی سے اکثر کرتی ہے کیونکہ ایک مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائی کے لیے خلوص نیت سے دعا کرتا ہے جسے رب تعالیٰ فوراً قبول فرمالیتا ہے۔'' میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ وہ بھی شاید تھک چکا تھا۔ سوز بان کا قفل کھولنے پر مجبور ہوگیا۔
''میرے ماں باپ کون تھے...... میں نہیں جانتا تھا...... مجھے علاقے کی ایک مالدار مگر نہایت پرہیز گار عورت نے پالا تھا۔ اُس نے مجھے بے انتہا محبت دی کہ مجھے کبھی یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کہ میں کس کی اولاد ہوں؟ میرے والدین کون ہیں اور کہاں ہیں؟''
انہوں نے مجھے شہزادوں کی طرح پالا...... مجھے دینی و دنیاوی تعلیم دونوں سے آراستہ کیا۔ قدم قدم پر وہ میری یوں رہنمائی کرتیں کہ جیسے کوئی فرشتہ رب العزت نے میری تربیت کے لیے بطور خاص مامور کیا ہو۔ وہ مجھے ہر اچھائی و برائی کے بارے میں بتاتیں اور نصیحت کرتیں کہ جب بھی اپنے دل میں برائی کا غلبہ محسوس کرو تو اللہ کو مدد کے لیے پکارو...... گویا ماں کے ساتھ ساتھ وہ میری 'مرشد' بھی تھیں۔ پورے علاقے میں اُن کی نیک نامی کے چرچے تھے۔ لوگ اُن سے علم دین اور ضروری مسائل پوچھنے آتے۔ اُن کے پاس علاقے کی خواتین کا آنا جانا لگا رہتا۔ اُن کے پاس ہر عمر کی عورت آتی تھی' میں نے گریجویشن کے دوران ایک اچھی کمپنی میں جاب کرلی تو میں برسر روزگار بھی ہوگیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اماں جان نے کبھی بھی مجھے بوجھ نہ جانا تھا مگر میں خواہش مند تھا کہ میں کسی کا محتاج نہ رہوں۔''
''ایک شام بہت حسین تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی پُروا چل رہی تھی۔ آنگن میں گلاب' چنبیلی' موتیا' رات کی رانی کی خوشبو مہک رہی تھی۔ اماں جان معمول کے مطابق اپنے تخت پر بیٹھی خواتین کے مسائل سن کر اُن کی رہنمائی میں مصروف تھیں اور میں ہمیشہ کی طرح اُن کے پاس چارپائی پر منہ پہ رومال ڈالے لیٹا ہوا تھا۔ وہ مجھے اکثر ٹوکتیں۔
''طلحہ اب تم بچے نہیں رہے بڑے ہوگئے ہو...... جب خواتین آیا کریں تو یہاں مت لیٹا کرو۔'' مگر میں اُن کا لاڈلا چہیتا یہ بات ایک کان

سے سن لیتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔

''اماں جان...... میں تو منہ پر کپڑا ڈالے لیٹا ہوتا ہوں، ایک نظر بھی اُٹھا کر کسی عورت کی طرف نہیں دیکھتا...... لیکن جہاں تک بات اُن خواتین کی ہے تو کیا وہ اتنی کمزور ایمان کی ہیں کہ ایک نوجوان کو دیکھ کر پٹڑی سے اتر جائیں۔'' میں شرارت سے بولتا۔ اماں جان میری اس بات پر اکثر پیار سے میرے کان مروڑتیں مگر میں باز نہ آتا۔

''ایک مرتبہ اسی طرح ضدی بنا میں اُن کے تخت کے پاس چارپائی پر لیٹا تھا کہ انتہائی مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اور دل کی وادی میں اتر گئی' میں پوری طرح سے اُس آواز کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی نسوانی آواز مجھے گھائل کر گئی تھی۔ میری تو دل کی دھڑکنیں دھمال ڈالنے لگی تھیں۔ وہ آہستگی سے اماں جان سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بات کرنے کے دوران رونے بھی لگتی تھی۔ میں یونہی ساکت پڑا اُس آواز کے جادو میں کھویا رہا۔ آخر دل نے فرمائش کر ڈالی کہ اُس انجان ساحرہ کا بھی دیدار ہو جائے جس نے آتے ہی من مندر میں گھنٹیاں بجادی تھیں۔ کچھ دیر یونہی دل سے لڑتا رہا۔ ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہا مگر جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ اماں جان سے نظر بچا کر میں نے چہرے سے رومال ہٹایا اور سامنے بیٹھی ملکۂ حسن کا دیدار کیا تو میرا وجود پتھر سا ہوگیا۔ آنکھیں پلٹنا بھول گئیں۔ وہ تو کوئی حور تھی۔ اُس کی حسین آنکھیں آنسوؤں سے جھملا رہی تھیں۔ دودھیا رنگت' سیاہ روشن آنکھیں' ٹھوڑی پہ سیاہ تل اُس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ سفید لباس میں وہ پاکیزہ حور لگ رہی تھی۔ اماں جان اسے تسلیاں دے رہی تھیں۔ مگر اُس کی آنکھوں سے تو آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں خاصی بڑی لگ رہی تھی۔

''دیکھو حور النساء...... اللہ سے مایوس نہیں ہوتے...... وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔ بندہ اپنی غلطیوں اور گناہوں پر سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو وہ انہیں دھتکارتا نہیں بلکہ اپنی رحمت کے سائے میں چھپا لیتا ہے۔'' اماں جان نے کہتے ہوئے اُس حسین دوشیزہ کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس بات کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا کہ اماں جان کی مجھ پر نظر نہ پڑ جائے۔ آخر کار وہی ہوا جس کا مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا۔

''طلحہ کتنی بری بات ہے بجائے یہ کہ تم اٹھ کر اندر چلے جاؤ۔ اُلٹا تم کان لگائے ہماری گفتگو سن رہے ہو۔'' اماں جان کی سرزنش پر میں ہوش میں آیا تو شرمندگی و سبکی کے مارے میرا منہ سرخ ہونے لگا۔

''اماں جان معافی چاہتا ہوں۔'' میں تیزی سے اٹھا اور ایک نظر اُس ساحرہ پر ڈالی۔ وہ اپنے غم میں اتنی نڈھال تھی کہ میری موجودگی سے بے خبر رہی تھی۔ اب جو مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی تو میرے دل کی دنیا تہہ و بالا کر گئی۔ اُس کی آنکھوں میں میرے لیے ناگواری تھی۔ خجالت سے میرا برا حال ہونے لگا تو میں جلدی سے کمرے میں آ گیا۔ پھولی ہوئی سانس درست کی۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ گھبراہٹ اماں جان کی ڈانٹ یا پھر کسی شرمندگی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ستارہ آنکھوں نے جو مجھ پر سرسری نظر ڈالی تھی اُس کی وجہ سے تھی۔

''حور النساء...... کتنا خوبصورت نام ہے۔ وہ تو واقعی حور ہے۔ میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا

تھا۔ اتنا مکمل حسن میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میری کوئی ہم عمر لڑکی مجھے متاثر نہ کر پائی تھی۔ مگر حور النساء کے حسن کی تجلی مجھ پر گری تو میرا وجود مثلِ کوہِ طور کے راکھ ہو گیا۔ بعض اوقات اپنے دل کو ڈانٹا کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑی ہے، مگر دل ضدی بچے کی طرح ضد کرنے لگتا۔ کوئی بھی دلیل اُسے قائل نہ کر پاتی۔ نتیجہ صفر کا صفر ہی رہتا اور بے قراری ہزار کے ہندسے کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اکثر اپنے دل سے اضطراب کی وجہ پوچھتا تو آنکھیں تر ہو کر فسانہ محبت کی ترجمانی کرنے لگ جاتیں، چند دنوں میں میری حالت دیوانوں جیسی ہوگئی۔ اب آنکھوں کو ایک ہی چہرے کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ میں ہر روز اُس کا منتظر رہنے لگا۔ وہ ہر ہفتے آتی تھی مگر جب سے میرا دل بے قرار ہوا وہ ایک بار بھی نہ آئی تھی۔ انتظار طویل سے طویل ہوتا رہا تو میرا وجود سولی پر لٹک گیا۔

''کیا بات ہے طلحہ مجھے تم کچھ اُلجھے اُلجھے سے دکھائی دینے لگے ہو۔'' اماں جان سے میری حالت پوشیدہ نہ رہ سکی تو انہوں نے پوچھ لیا۔

''نہیں اماں جان...... بس آفس میں کچھ کام کا دباؤ ہے۔'' میں گڑبڑا کر بولا۔

''ارے میرے بچے تو تم سے کس نے کہا ہے اتنی محنت کرنے کو...... پہلے تم آرام سے اپنی تعلیم مکمل کرو۔'' وہ میرا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

''نہیں اماں جان...... میں مزید اپنی پڑھائی کا بوجھ آپ پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ آگے ہی آپ کے احسانات کم ہیں۔ اب تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو کما کے لا کر دوں۔'' میں نے شدتِ محبت سے اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

''نہیں میری جان میں نے کبھی تمہیں بوجھ نہیں جانا، بس اللہ نے تمہاری ذمہ داری مجھ پر ڈالی تو پھر میں نے تمہارے لیے اپنے دل کو چھوٹا نہ پایا...... ہمیشہ تمہارے معاملے میں محبت و فراخدلی غالب رہی...... اور یہ جذبہ بھی اللہ نے میرے دل میں تمہارے لیے رکھا ہے۔'' اماں جان نے مسکراتے ہوئے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں وہ ہمیشہ ایسا کرتی تھیں، مجھے طمانیت کا احساس ہونے لگا تو آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔

''اب یہیں مت سو جانا، خواتین کے آنے کا وقت ہو رہا ہے، اب تم جوان ہو گئے ہو بچپن کی بات اور تھی مگر اب سمجھدار ہو گئے ہو۔'' کہ اچانک مجھے وہ دلکش آواز پھر سے سنائی دی۔ تو دل کے مندر میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ میں اماں جان کا ململ کا سفید دوپٹہ چہرے پر ڈالے چارپائی پر لیٹا تھا۔ وہ مجھے بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔ آج میں نے چہرے کو چھپائے رکھا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ اماں جان کی ڈانٹ پڑے گی اور میں دیدار سے محروم ہو جاؤں گا۔ سیاہ لباس میں اُس کی اجلی رنگت دمک رہی تھی۔ یوں جیسے سیاہ بدلیوں سے چمکتا ہوا چاند واقعی وہ چودھویں کا چاند تھی۔ میں اُس کے حسن کے سحر میں کھویا اُسے تکتا جا رہا تھا۔

''طلحہ چلو اب اندر جا کر سو جاؤ۔'' اماں جان کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں سخت بدمزہ ہوا تھا۔ میں جی بھر کر اُس کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ مگر اماں جان...... انہوں نے مجھے دو تین بار پکارا مگر میں بے حس و حرکت پڑا رہا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں گہری نیند میں جا چکا ہوں۔

''رہنے دیں اماں جان...... مت جگائیے لگتا ہے بے چارہ گہری نیند میں چلا گیا ہے۔'' وہ بولی تو میں جھوم اٹھا اُس کی آواز اتنی میٹھی تھی کہ دل میں اتر جاتی تھی۔

اماں جان کو اپنا مسئلہ سناتے ہوئے وہ اُس روز بھی رو رہی تھی۔

''دیکھو بیٹا...... دل چھوٹا مت کرو...... وہ بہت رحیم ہے...... انسان غلطیوں کا پتلا ہے۔ مگر وہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے...... انسان کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی حقیری اور اُس کی کبریائی پر نظر رکھے...... وہ بڑا فیاض ہے۔'' اماں جان نے اُسے سمجھایا۔

''اماں جان غلطی اور گناہ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گناہ بہت سنگین چیز ہے۔'' حور النساء ہنوز روتے ہوئے بولی۔

''بے شک...... کچھ گناہ واقعی بہت سنگین ہوتے ہیں مگر اُس ذات پاک کی رحمت وعظمت اور وسعت سے بڑھ کر نہیں...... اُس نے تمہیں گناہ کا احساس دلایا اور توبہ کی توفیق دی تو اُس کی کریمی اور رحیمی کو سمجھو...... جتنی بڑی خطا ہو اتنی ہی بڑی عطا بھی ہوگی بشرطیکہ توبہ سچی ہو۔'' اماں جان بولیں تو اُس نے تائیدی انداز میں سر کو جنبش دی۔

''گناہ وہ بار بار کیوں اس لفظ کا استعمال کرتی تھی کیا وہ کوئی غلط کام کر بیٹھی تھی یا کوئی بدکاری۔ جس سے اُس کے دامن پر کوئی دھبہ لگ گیا ہے۔ نہیں نہیں وہ ایسی نہیں ہے وہ تو بہت معصوم ہے اسے دیکھ کر تو دل ونظر احترام سے جھک جاتے ہیں۔'' میں نے اس خیال پر سہ بار استغفار پڑھ ڈالا۔ اُس کی محبت میرے اندر بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے بھی تکرار چھوڑ کر اقرار کرلیا تھا حور النساء کی محبت کا اقرار......

☆......☆......☆

جمعرات کا دن تھا۔ عید میلاد النبی کا مہینہ تھا۔ اماں جان اس مہینے کی بہت عزت وتکریم کرتی تھیں پورا مہینہ محافل ومیلاد ہوتے، مگر اس بار تو اہتمام بہت شاندار تھا۔ محلے بھر کی خواتین شامل تھیں۔ حور النساء بھی میلاد میں شریک تھی۔ اُس کی مومی کلائیوں میں گجرے، اُس کے حسن کو دو آتشہ کر رہے تھے۔ میرے لیے خوشی کی بات تھی کہ آج وہ میری نظروں کے سامنے زیادہ رہے گی۔ وہ کبھی خواتین کو گجرے پکڑاتی، تو کبھی عطر کا چھڑکاؤ کرتی، اماں جان نے کھانے پینے کا انتظام بھی اُس کے حوالے کر رکھا تھا اور وہ بھی یہ ڈیوٹی دل وجان سے ادا کر رہی تھی۔

میں بہانے بہانے سے اُس کے اردگرد ہی منڈلا رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ پروانے کی مانند لگ رہا تھا جو شمع کے گرد طواف پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک دو بار میری اور اُس کی نظریں ملیں...... مگر وہ فوراً اپنی نظریں جھکا لیتی تھی۔ میں اُس سے عمر میں چھوٹا ضرور تھا مگر میرے دیکھنے کے انداز کو وہ بھانپ چکی تھی۔ کیونکہ میرے دل کی حالت نگاہوں سے عیاں تھی۔ وہ میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر مجھ سے کترا رہی تھی۔ کھانا نکالتے ہوئے گرم سالن کا پیالہ اُلٹا اور اُس کے ہاتھوں کو جھلسا گیا۔ وہ درد اور جلن کی شدت سے تڑپ اٹھی۔ اُس کی متغیر رنگت تکلیف کی عکاس تھی۔ میں برداشت نہ کر پایا تو اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''آپ ٹھیک تو ہیں۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی۔ مگر میں اُس کی تکلیف پر تڑپ اٹھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اُس نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر میری گرفت مضبوط تھی۔

''کہاں ٹھیک ہیں آپ...... آپ کے دونوں ہاتھ جھلس گئے ہیں لائیے میں دوا لگا دیتا ہوں۔''

میں اُسے زبردستی اپنے کمرے میں لے آیا اور اپنے بیڈ پر بٹھا دیا۔ وہ یوں تنہائی میں میرے ساتھ گھبرا رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں......بس تھوڑی دیر ٹھنڈے پانی میں ہاتھ رکھوں گی تو تکلیف دور ہو جائے گی مجھے دوا کی ضرورت نہیں۔'' وہ مجھے قریب بیٹھا دیکھ کر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد عمر میں عورت سے چاہے چھوٹا ہو اُس کے ساتھ تنہائی میں عورت گھبرا جاتی ہے۔ میں اُس کی گھبراہٹ کو سمجھ رہا تھا۔

''ارے کیوں ضرورت نہیں ہے دوا کی...... مجھے تو صاف نظر آ رہا ہے۔'' میں نے اُس کے ہاتھ تھامتے ہوئے اُسے زبردستی بٹھاتے ہوئے کہا۔

میں جان بوجھ کر دوا آہستگی سے لگا رہا تھا کہ اُس کی سنگت میں کچھ وقت گزاروں۔ اُس کے قرب کی خوشبو مجھے دیوانہ بنا رہی تھی۔ میں نے اُس کی کلائی تھامی تو گجرے کی پتیاں ٹوٹ کر گر پڑیں۔

''اِن کو اُتار دیں دوا لگانے میں دشواری ہو رہی ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کے گجروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اُس نے میرا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔

''میں خود ہی اُتار لوں گی۔'' وہ خوفزدہ انداز میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

خوشبوؤں سے مہکی محبت نئی راہوں پر محو سفر ہو چکی تھی۔ وہ میرے رگ و پے میں سما چکی تھی۔ میں اُس کے تصور سے جان چھڑا نہیں پایا تھا۔ میں قدرے خاموش اور گم صم سا رہنے لگا۔ اماں جان میری اس تبدیلی کو بھانپ چکیں تو بہت دفعہ پوچھتیں کریدتی رہتیں۔ مگر میں کمال مہارت سے بات گول مول کر دیتا...... اب مجھے حورالنساء کا بے چینی سے انتظار رہنے لگا تھا۔ وہ اب اکثر آنے لگی تھی۔ وہ اماں جان سے باتوں میں مصروف رہتی اور میں اُسے دیکھنے میں...... میں اُسے دیکھنے کے لیے مختلف بہانوں سے اردگرد ہی رہتا...... میری نگاہوں نے واضح انداز میں ترسیل محبت کا سلسلہ شروع کیا تو اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ مجھے امید تھی کہ وہ بھی میری محبت کا جواب محبت سے دے گی' مگر میرا ہر اندازہ غلط نکلا اُس کے چہرے پر میرے لیے ناگواری ہوتی۔ اُس کی آنکھیں مجھ پر برہم ہوتیں۔ وہ شعوری طور پر مجھے نظر انداز کرتی۔ میں قریب بیٹھتا تو وہ اٹھ کر چلی جاتی میرے لیے یہ سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ دل جتنی شدت سے اُس کا طلبگار تھا وہ مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتی' وہ شاید میری عمر کی وجہ سے ایسا کرتی تھی کہ شاید میں دل لگی کر رہا ہوں' کیونکہ بیس بائیس سال کی عمر میں ایک مرد انتہائی ناپختہ ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ اس عمر میں تو وہ ایک کیا ہزاروں عشق کرتا ہے ہر حسین چہرہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ دو دن کسی پری چہرہ سے دل بہلایا اور پھر نئے چہرے کی تلاش میں قدم اٹھ جاتے ہیں۔ مگر میرا معاملہ مختلف تھا۔ میں تو پہلی نظر میں اُس کا اسیر ہو چکا تھا۔ بہت دفعہ سوچتا کہ اماں جان سے ذکر کروں مگر اُن کی بدگمانی سے ڈرتا تھا کہ میں نظر کا میلا ہو گیا ہوں اور عمر سے بڑی عورتوں سے عشق لڑانے کے چکر میں ہوں۔

☆......☆......☆

میری بے قراری حد سے بڑھی تو قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا۔ ایک شام موسم ابر آلود تھا' بارش کے مکمل آثار تھے۔ حورالنساء اماں جان سے ملنے آئی وہ خاصی متفکر دکھائی دی۔ وہ ابھی تک غیر

شادی شدہ تھی جس کا مجھے علم تھا مگر آج اُس کے لیے رشتہ آیا تو وہ پریشان تھی۔ اماں جان اُسے مشورہ دینے لگیں۔

''اچھا رشتہ ہے تم ہاں کر دو۔ ویسے بھی ہر مرد ایک جیسا تو نہیں ہوتا...... یوں کب تک تنہا زندگی گزارو گی۔'' اماں جان کے الفاظ مجھ پر بجلی کی طرح گرے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''حور کسی اور کی ہو جائے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں یہ مجھے ہرگز گوارہ نہیں تھا۔'' اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کو کالے بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو ہر طرف جل تھل ہو گئی۔ بارش اتنی موسلا دھار تھی کہ کہ حور گھر نہ جا پائی۔ اماں جان نے اُسے روک لیا کہ صبح چلی جانا...... میرے پاس موقع اچھا تھا کہ میں اُس سے اپنے دل کی بات کر سکوں۔ اماں جان کے سونے کے بعد میں حور کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''تم ...... یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ قدرے درشت انداز میں بولی۔

''مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں ہمت جمع کر کے بولا۔

''کیا بات ہے جلدی کرو۔'' وہ عجلت بھرے انداز میں بولی۔

''حور مجھے آپ سے...... !'' میرے الفاظ میری زبان کا ساتھ دینے سے انکاری ہونے لگے...... میری ہمت ختم ہونے لگی تھی بات کرنا عذاب ہو گیا تھا۔

''بولو بھی اب......'' اُس نے مجھے سختی سے ڈپٹا یوں جیسے چھوٹے بچے کو بڑا ڈانٹ دیتا ہے۔

''وہ...... مجھے آپ سے...... محبت ہو گئی ہے نا جانے یہ کیسے ہوا مگر...... یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے بغیر مر جاؤں گا......'' میری نظریں جانے کیوں جھک گئی تھیں میں اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں مسل رہا تھا جیسے کوئی اقرارِ محبت کر کے میں گناہِ کبیرہ کر دیا ہو۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا...... ہوش میں ہو تم......'' وہ چلائی۔

''کیوں کیا ہوا...... میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔'' مجھے اُس کے ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

''اپنی اور میری عمر کا فرق دیکھا ہے...... بچے نظر آتے ہو میرے سامنے۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔

''حور میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور محبت عمر نہیں دیکھتی...... اور جب مجھے کوئی مسئلہ نہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔'' میں اُس کے غیض و غضب کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''تم ایسے باز نہیں آؤ گے...... مجھے تم پر شک تو تھا مگر بچہ جان کر نظر انداز کرتی رہی مگر اب میں اماں جان کو تمہاری شکایت لگاتی ہوں کہ اپنے لاڈلے کو دیکھیے اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے عشق فرما رہا ہے۔'' وہ نفرت سے کہتے ہوئے باہر جانے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''حور میری بات کو سمجھیں...... میں آپ سے دل لگی نہیں کر رہا...... خود سے لڑ لڑ کر تھک چکا ہوں۔ آپ مجھے لاکھ دھتکاریں میں آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' میری آنکھیں نم ہونے لگیں مگر اُس نے کچھ کہے بغیر میرے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ وہ جانے لگی تھی کہ میں نے بھاگ کر دروازہ بند کر لیا اور اُس کے آگے کھڑا ہو گیا۔

''حور میری نیت پر شک نہ کریں...... مجھے

آپ سے وقتی لگاؤ نہیں ہوا جو چند دنوں میں ختم ہوجائے گا...... میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے بغیر بکھر جاؤں گا۔'' میں نے کہتے ہوئے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ میری بے بسی پر دنگ رہ گئی تھی مگر اگلے ہی پل ہوش میں آگئی۔

''تم مرد سب ایک جیسے ہوتے ہو......عورت کو رام کرنے کے لیے جو حربہ بھی استعمال کرنا پڑے کرتے ہو......مگر میں تمہارے جھانسے میں نہیں آؤں گی۔ محبت نے تمہیں ضرور اندھا اور پاگل بنا دیا ہے مگر میرا دماغ سلامت ہے۔ میں تمہارے کسی بہکاوے میں نہیں آؤں گی اور نہ ہی دنیا کے سامنے خود کو تماشا بنواؤں گی۔'' اُس نے پوری قوت سے مجھے دھکا دیا اور دروازہ کھول کر بھاگنے لگی تھی کہ میں نے اُس کا آنچل تھام لیا...... بادل زور سے گرجے تھے۔

اماں جان میرا بستر خالی پا کر میری تلاش میں نکلیں تو مجھے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ حور کا آنچل میں نے تھام رکھا تھا۔ وہ جہاں دیدہ عورت تھیں سب کچھ سمجھ گئیں۔ حور بھاگ کر اُن کے پیچھے چھپ کر رونے لگی۔ اماں جان کی آنکھوں میں کرب کا سمندر تھا۔ انہیں بالکل یقین نہیں آرہا تھا کہ اُن کی گود میں پلنے والا طلحہ اُن کی تربیت کی یوں دھجیاں اڑائے گا۔ میں بے گناہ تھا مگر انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا اور آتش دان سے سُلگتی لکڑی لے کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ نہ ہی اُن کا ہاتھ رُک رہا تھا اور نہ ہی غصہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حور النساء لرز کر رہ گئی۔

''بس کر دیں اماں جان......مر جائے گا۔'' اُس نے انہیں روکنے کی ناکام سعی کی۔

''اماں جان......آپ غلط سمجھ رہی ہیں میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔'' میرے منہ سے بمشکل نکلا اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

جب آنکھ کھلی تو اماں جان میرے قریب بیٹھی رو رہی تھیں۔ میرے ہاتھ کئی جگہ سے جل گئے تھے' وہ جو میری معمولی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ نفرت کے مارے مجھے دیکھ بھی نہیں رہی تھیں۔ میں بمشکل اٹھا اور اُن کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔

''اماں جان مجھے آپ کی قسم ہے میں نے حور النساء کے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا میں تو خود اتنے دنوں سے اذیت میں تھا۔ بہت دفعہ آپ کو بتانا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی کہ آپ کی تربیت پر کوئی حرف آئے۔'' میں تکلیف سے بولا۔

پیار تو وہ مجھ سے بے انتہا کرتی تھیں۔ میری بات سن کر اُن کا دل نرم پڑ گیا اور مجھے گلے لگا کر رونے لگیں۔ میرے زخم دیکھ کر خود کو کوسنے لگیں۔

☆......☆......☆

ساری حقیقت جان کر انہوں نے مجھے سمجھایا۔

''ارے پگلے ایک سے ایک بڑھ کر تیری ہم عمر لڑکی مل جائے گی' تو کیوں خود سے عمر میں خاصی بڑی اُس غریب دکھوں کی ماری کا تماشا بنانا چاہتا ہے۔''

''اماں جان...... میں صرف حور النساء سے ہی شادی کروں گا ورنہ تمام عمر کنوارہ رہوں گا۔'' میں اٹل لہجے میں بولا۔ میری طرف سے مایوس ہو کر اماں جان نے حور النساء کو سمجھانا شروع کیا۔

''دیکھو حور......طلحہ تم سے بہت محبت کرتا ہے مذہب کی نظر سے دیکھا جائے تو عمروں کا فرق

کوئی معنی نہیں رکھتا مرد کے دل میں قدر اور محبت ہونی چاہیے۔ دنیا والوں کے منہ خود بخود بند ہو جائیں گے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔''

اماں جان کے مسلسل اصرار پر حور قائل ہو گئی اور میری محبت میری دلہن بن کر میرے گھر میں آ گئی۔ وہ دلہن بن کر اتنی حسین لگ رہی تھی کہ چاند بھی شرما رہا تھا۔ دل میں ڈھیروں ارمان لیے کمرے میں داخل ہوا تو گہرا اندھیرا دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ وہ سو چکی تھی یا پھر میری کوئی بات بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ میں اِس صورتِ حال کو سمجھ نہ پایا مگر اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ وہ میرے آنے سے پہلے سو جاتی تھی۔ میں محبت کا اظہار کرتا تو وہاں سرد مہری ملتی۔ اُس کا ہاتھ تھامتا تو ناگواری سے جھٹک دیتی۔ حور کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ وہ میرے سب کام کرتی اماں جان کی خوب خدمت کرتی مگر بلا ضرورت مجھ سے کوئی بات نہ کرتی۔ وہ زیادہ وقت اماں جان کے پاس گزارتی، شعوری طور پر وہ کوئی بھی تنہائی کا موقع نہ آنے دیتی میری برداشت جواب دے گئی تو بول اٹھا۔

''حور کیا آپ کو اب بھی مجھ سے محبت نہیں ہے، کیا اب بھی عمروں کا فرق آپ کو پریشان رکھتا ہے۔'' اماں جان محلے میں کسی کام سے گئی تھیں۔ حور کو تنہا پا کر میں اُس کے قریب آ بیٹھا۔ اُسے بانہوں میں تھام کر محبت پاش لہجے میں بولا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسے روتا دیکھ کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ میں اُسے چپ کرواتا تو وہ مزید رونے لگتی۔

''حور آپ کیوں رو رہی ہیں کوئی پریشانی یا تکلیف ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔'' میں نرمی سے بولا۔

''طلحہ تم مجھے ہاتھ نہ لگایا کرو...... میرے قریب مت آیا کرو۔'' وہ روتے ہوئے بمشکل بولی تو میں حیرت سے ششدر رہ گیا۔

''مگر کیوں...... میں کوئی غیر مرد تو نہیں...... شوہر ہوں آپ کا۔'' میں اُس کی بات سن کر متعجب رہ گیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی مگر جب تم میرا ہاتھ تھامتے ہو یا میرے قریب آنے کی کوشش کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میں کوئی گناہ کر رہی ہوں بلکہ گناہ کبیرہ۔'' حور نے کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اور میں اُسے پتھر کا بت بنے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

حور النساء کی باتوں نے مجھے اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ کیا حور کو کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے؟ کیا ابھی بھی وہ عمر کے فرق میں اُلجھی ہے۔ کیا حور کسی اور سے محبت کرتی تھی اور میں نے اُسے زبردستی اپنے ساتھ باندھ لیا ہے' کیا میں محبت پا کر بھی تہی دامن رہا ہوں؟ بہت سے 'کیا' مل کر میرے اردگرد وحشیانہ رقص کرتے تو میں ساری رات راگتا رہتا اور سوچ سوچ کر خود کو نڈھال کرتا رہتا۔ صبح آنکھوں کی سرخی رتجگے کا فسانہ سناتی تو اماں جان میری حالت دیکھ کر مضطرب ہوتیں اور حور نظر چُرا کر رہ جاتی۔ میں اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا زندگی کا پہلا لمحہ تھا جب مجھے اپنی ماں کی شدت سے یاد ستانے لگی۔

''کاش وہ زندہ ہوتی تو میں دل کا دکھ اُن کے سامنے رکھتا۔ وہ شفقت سے مجھے اپنے سینے سے لگاتی اور اپنے آنچل میں چھپا لیتی۔ اور میرے لیے خدا بزرگ و برتر سے گڑگڑا کر دعا

کرتی۔'' کچھ دن تو میں نے صبر سے گزارے۔ پھر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ آخر کو مرد تھا کب تک برداشت کرتا...... میں نے ساری بات اماں جان کے گوش گزار کردی۔ اور ساتھ ہی حور کو دھمکی دے ڈالی کہ اگر یہی معاملات رہے تو یاد رکھنا کہ میں دوسری شادی کرلوں گا۔'' میری دھمکی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اماں جان نے حور کے ساتھ پند و نصائح کا سلسلہ شروع کردیا۔ شوہر کے حقوق' بیوی کے فرائض کے متعلق اُسے دن رات سمجھاتی۔

شاید اماں جان کی باتوں کا اثر تھا کہ میں ایک رات تھکا ماندہ گھر لوٹا تو بجی سنوری حورالنساء کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ یقیناً اُسے ہمارے رشتے کا احساس ہوگیا تھا۔ اُسے یوں بنا سنورا دیکھ کر میرا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ میں اُس کے قریب بیٹھ کر وارفتگی سے اُسے تکنے لگا جوش محبت میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کا بدن یوں کانپ رہا تھا کہ جیسے سخت بخار میں انسان کانپتا ہو۔ میں نے ایک گہری نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی تو وہاں مصنوعی مسکراہٹ محوِ رقص دکھائی دی۔ یعنی اماں جان کے سامنے دکھاوے کے لیے یہ سب بناؤ سنگھار تھا وہ دل سے ابھی بھی مجھے اپنا آپ سونپنے پر راضی نہ تھی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میری کچھ دیر پہلے والی سرشاری اڑنچھو ہوگئی۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوئی آسیب حور پر قابض ہو جو اُسے میرے قریب ہونے سے روک دیتا ہے۔

''آخر یہ کب تک یونہی چلے گا۔ آپ کب تک یونہی عمروں کے فرق میں اُلجھی رہیں گی اور میری اور اپنی زندگی کو اجیرن بناتی رہیں گی۔ آپ کھل کر بتائیں کیا چاہتی ہیں آخر؟'' میرا وجود ریت کی طرح بکھرنے لگا تو میں نے خود کو

غزل

اتفاق اپنی جگہ خوش قسمتی اپنی جگہ
خود بناتا ہے جہاں میں آدمی اپنی جگہ

کہہ تو سکتا ہوں مگر مجبور کرسکتا نہیں
اختیار اپنی جگہ ہے' بے بسی اپنی جگہ

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ

صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنالیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

دوست کہتا ہوں تمہیں شاعر نہیں کہتا شعور
دوستی اپنی جگہ ہے' شاعری اپنی جگہ

انور شعور

سنبھالتے ہوئے انتہائی تحمل سے پوچھا۔
''طلحہ تم مجھے طلاق دے دو...... بس یہی اس مسئلے کا حل ہے۔'' وہ بولی تو اُس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ اُس کی بات نے مجھے یوں چیر کر رکھ دیا جیسے آری لکڑی کو درمیان سے چیر کر رکھ دیتی ہے۔
''مگر کیوں؟'' میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔
''مجھے کچھ نہیں پتہ مگر تم میرے ساتھ یوں اتنا قریب' یہ میرے لیے بہت دشوار ہے۔'' اُس نے روتے ہوئے کہا تو وہ مجھے بہت بے بس و مجبور نظر آئی۔ میں حیران کن نظروں سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے پاس الفاظ نہ تھے کہ میں کیوں اور کیسے پوچھتا مجھے محسوس ہورہا تھا کہ میں کسی لق ودق صحرا میں تنہا بھٹک رہا ہوں میرا کاسئہ دل محبت کے سکوں سے خالی اور ہمیشہ خالی رہے گا۔ غصے کے مارے میرا خون کھولنے لگا میں نے شدت غم میں اُسے انتہائی سختی سے دونوں بازوؤں سے دبوچا تھا کہ اُس نے زوردار دھکا دے کر خود کو میری گرفت سے آزاد کروایا جیسے کوئی اجنبی شخص اُسے 'دعوتِ گناہ' کے لیے ورغلا رہا ہو۔
''دور ہٹ جاؤ...... میرے قریب مت آنا مجھے ہاتھ بھی مت لگاؤ۔'' وہ چلا کر بولی اور یوں رونے لگی کہ جیسے آج رو رو کے دریا بہا ڈالے گی۔

☆......☆......☆

میں نے مکمل خاموشی اختیار کرلی۔ اُس کو طلاق دے کر خود سے جدا کرنا گوارا نہ تھا سو اپنی ذات کو اذیت دینے لگا...... کثرت سے سگریٹ نوشی کرنے لگا...... رات دیر تک دوستوں میں رہنے لگا۔ میرا مزاج انتہائی چڑچڑا ہوگیا کوئی بات کرتا تو کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اماں جان کے ساتھ بھی اکثر بدتمیزی کرنے لگا...... اماں جان میرا حال دیکھ کر تڑپ گئیں۔
''حور کیوں بے چارے کی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہو...... تم سے مرضی پوچھ کر نکاح کیا تھا۔ پھر اب ایسا کیا ہوگیا کہ یوں تنگ کررہی ہو۔ وہ آگے ہی دکھوں کا مارا جس کو اُس کی ماں نے پیدا تو کردیا مگر اپنی ناجائز اولاد کو سنبھالنے اور دنیا والوں سے طعنے سننے کا حوصلہ نہ تھا اِس ننھے وجود کو رات کے اندھیرے میں اُسی شخص کی دہلیز پر چھوڑ گئی جس کا وہ گناہ تھا وہ ایک باعزت شخص تھا بدنامی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے خاموشی سے یہ ننھا بچہ میرے حوالے کردیا کہ کچھ عرصے اُس کا خرچہ دیتا رہا پھر اپنی زندگی میں یوں مگن ہوا کہ اس ننھے وجود کو فراموش کرگیا کہ جیسے روزِ قیامت اِس کے حوالے سے باز پرس سے بھی غافل ہوگیا۔''
اماں جان کے منہ سے اپنا اصل سن کر میرے وجود میں دھماکے ہونے لگے۔ میرے اندر صفِ ماتم بچھ گئی۔ دل بین ڈالنے لگا۔
''میں گندی اولاد ہوں' میرا خون گندا ہے۔''
اماں جان میری موجودگی سے بے خبر حور النساء کو سمجھا رہی تھیں۔ میں وحشیانہ انداز میں گھر سے بھاگ نکلا۔ دور بہت دور مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ ٹھوکر لگی تو احساس ہوا شدتِ غم میں گھر سے بہت دور آگیا ہوں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کہیں کوئی بندہ بشر نہ تھا میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کبھی خود کو نوچتا' اپنے آپ کو زخمی کرکے بھی میرا دل ہلکا نہ ہوا تھا۔ حور النساء کی بے رخی کم تھی کہ یہ آگہی بھی میرے لیے عذاب بنی تھی میں ناجانے کتنی دیر یونہی مٹی میں لت پت گرا روتا رہا کہ ایک دم فون کی بیل بجی تو

ہوش میں آیا۔

''طلحہ تم کہاں ہو...... اماں جان کو دل کا دورہ پڑا ہے انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔'' یہ خبر سنتے ہی میرے وجود میں بھونچال آ گیا تھا ایک اماں جان ہی تو میرا واحد سہارا تھیں۔ میں بھاگم بھاگ ہاسپٹل پہنچا۔ اماں جان کو ہوش آیا تو وہ مجھے دیکھ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔ وہ بار بار ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر بول نہ پا رہی تھیں۔ کافی دیر بعد میں انہیں بہتر حالت میں دیکھ کر پُرسکون ہوا اور آرام کی غرض سے گھر آ گیا۔ حور کو دیکھنے سے بھی گریز کیا مگر بغیر دیکھے جانتا تھا کہ وہ مجھے بہت محویت سے تک رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ میرا دل ہر چیز سے بیزار تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی کمرے میں قدموں کی آہٹ ہوئی وہ یقیناً حور تھی۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ نے میری زندگی کو تماشا بنا کر رکھ دیا۔ آخر خود کو کیا سمجھتی ہیں؟'' میں نے سختی سے اُس کی کلائی تھامی اور گرج کر بولا۔ اُس نے ہمیشہ کی طرح خود کو میری گرفت سے آزاد کروایا اور دو تین تھپڑ اور مارے مجھے گریبان سے پکڑ کر دیوانوں کی طرح مارنے لگی۔ مجھے پہلی بار اُس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مجھے مار مار کر جب نڈھال ہوگئی تو تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔ میں اس ساری صورت حال پر حیران و پریشان بیٹھا تھا کہ حور کی دردناک چیخوں نے گھر کے در و دیوار ہلا دیے۔ اُس نے خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی تھی۔

☆......☆......☆

حور کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اماں جان اسپتال سے واپس آئیں تو ہر وقت روتی رہتیں معافیاں مانگتی رہتیں تو کبھی سجدوں میں گر کر معافی مانگتیں۔

''یا اللہ مجھے معاف کر دے...... میں لاعلم تھی...... میرے ہاتھوں سے کیا ہوگیا۔'' وہ گریہ زاری کرتیں۔

میں اُن کی حالت دیکھ کر عاجز آ گیا تو ایک دن پوچھ بیٹھا۔ اول تو وہ بتانے پر راضی نہ تھیں مگر میرے اصرار پر جو بتایا تو سن کر دل چاہا خود کو حور النساء کی طرح آگ لگا کر ابدی نیند سو جاؤں۔

''حور النساء میری ماں تھی۔ میری وہ بدنصیب ماں جسے بہت کم عمری میں ایک امیر زادے سے محبت ہوئی اُس نے شادی کا وعدہ کیا مگر شادی نہ کی مگر میری صورت میں اپنا گناہ میری بن بیاہی ماں کی گود میں ڈال دیا۔ بدنامی کے ڈر سے وہ مجھے ایک رات اُسی امیر زادے کی دہلیز پر چھوڑ کر روپوش ہوگئی۔ مگر اُس گناہ نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ حالات یوں بنے کہ اُس کی شادی اپنے ہی بیٹے سے ہوگئی۔ وہ نوجوان قصہ الم سنا کر خاموش ہوا تو اُس کی کھانسنے کی آواز مجھے ہوش وحواس کی دنیا میں لائی۔ وہ بری طرح سے کھانس رہا تھا اور میں پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اُسے حیرت سے دیکھتا جا رہا تھا۔ میری زبان کو تالا لگ چکا تھا۔

''ایک بیٹے کی اپنی ماں سے شادی۔'' یہ الفاظ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

''میں نے کہا تھا نا کہ میری کہانی سن کر تمہاری روح بھی لرز جائے گی۔'' وہ نوجوان نڈھال لہجے میں بولا کاش میں اِس دردناک قصے سے ناواقف ہی رہتا۔

''ہے نا میرا مرض لاعلاج۔'' طلحہ نے

کھانستے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔
اُس کی آنکھوں میں رنج والم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ زندگی دم توڑ رہی تھی۔ کچھ سوالات میرے دل میں مچلے تو میں انہیں زبان تک آنے سے روک نہ پایا۔
''کیا تمہاری ماں جانتی تھی کہ تم اُس کے بیٹے ہو؟''
''نہیں میری بدنصیب ماں بھی میری طرح ہی ناواقف تھی کہ میرا اور اُس کا اصل رشتہ کیا ہے۔ اگر کوئی جانتا تھا تو صرف وہ 'عالم الغیب' کہ میں اُس حرماں نصیب کی اولاد ہوں۔ اور اسی وجہ سے جب بھی ہمیں تنہائی میسر آتی تو میری ماں کی کیفیت عجیب ہو جاتی تھی۔ وہ ذات ہمارے رشتے کے تقدس کی حفاظت کر رہی تھی۔ اور دونوں کو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے روک دیا جاتا تھا۔'' طلحہ نے کہتے ہوئے سسکی بھری۔
''کیا مرنے سے پہلے تمہاری ماں حقیقت جان گئی تھی۔'' میں نے پھر پوچھا۔
''ہاں...... وہ جان گئی تھی کہ گردشِ ایام نے اُس کے ساتھ وہ بھیانک چال چلی کہ اُس کا بیٹا ہی اُس کا شوہر بن گیا تھا۔ وہ خود کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تو اپنا مجروح وجود منوں مٹی تلے چھپا لیا ہم دونوں کے آئے روز اختلاف رہتے تو اماں جان اُسے اکثر سمجھاتیں کہ بیوی کے فرائض کیا ہیں اور پھر باتوں ہی باتوں میں اماں جان اور میری ماں پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی جو برسوں پہلے ایک ننھا وجود ایک امیر زادے کی چوکھٹ پر چھوڑ آئی تھی وہ لڑکی حور النساء تھی اور بدنامی کے ڈر سے اُس امیر زادے نے جس پرہیز گار عورت کے حوالے مجھے کیا تھا وہ اماں جان تھیں۔ بس حقیقت جاننے کے بعد اماں جان بستر سے جا لگیں اور حور النساء نے خود کو آگ لگا لی۔ وہ بے چاری بدنصیب مرنے سے پہلے اپنے جگر گوشے کو آخری بار آخری بار اپنے لعل کو جی بھر کر دیکھنا چاہ رہی تھی۔ مگر میں بے خبر بدنصیب......'' طلحہ دھاڑیں مار کر رونے لگا کہ مجھے لگا کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔
''حالات کی ستم ظریفی دیکھی کہ مرد کی زندگی میں دو رشتے انتہائی اہم ہوتے ہیں ماں اور بیوی جو خوشی کا باعث ہوتے ہیں اور مشکل وقت میں سہارا بھی۔ میرے لیے یہ دونوں رشتے ایک ہی عورت میں رکھ دیے۔ وہ بدنصیب میری ماں بھی تھی اور میری بیوی بھی۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپا۔ اُس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا کہ منہ سے خون جاری ہو گیا کہ اُس کی چادر اپنے ہی لہو سے تر تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ ایک شور برپا ہو گیا۔
''ارے کوئی ایمبولینس منگوائے یہ بے چارہ تو مر رہا ہے۔'' کوئی پکارا۔ آناً فاناً ایمبولینس آئی میں اُسے ہاسپٹل لے کر گیا۔ طویل انتظار کے بعد بس یہی سننے کو ملا۔
''سوری ہم مریض کو بچا نہیں سکے۔'' غموں نے طلحہ کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ ویسے بھی جو مذاق حالات نے اُس کے ساتھ کیا تھا اُس کے بعد موت ہی اُس کی آخری پناہ گاہ تھی۔ وہ دونوں بدنصیب ماں اور بیٹا گہری قبر میں اپنا چھلنی وجود لے کر اتر گئے۔ مقدر کیسے راکھ ہوتا ہے زندگی میں پہلی بار میں نے یہ دیکھا تھا۔

اس سرابِ زندگی میں اے خالقِ کن فیکون
میری حقیقت ہے یہی
انا للہ وانا الیہ راجعون

☆☆......☆☆☆

چوتھی طویل کہانی میاں چنوں سے

زندگی کے رنگ

محسن بھوپالی کا خیال

نظر ہو کیوں نہ مری آسماں پر
میں آخر اس بلندی سے گرا ہوں

مہر پرویز دولو

''تم جیسے دیوانے بہت دیکھے ہیں' اگر عشق کے بھوت نے سوار ہو کر سوچنے سمجھنے کی قوت مفقود

کر دی ہے تو گھر جا کر آئینہ غور سے دیکھنا' وہ تمہاری وقعت بتا دے گا۔ تم جیسے محبت کی توہین کرنے والے کو اپنا ملازم رکھنا بھی گوارا نہیں۔ کیونکہ حور کے پہلو میں لنگور والا جملہ سچ نہیں کرنا چاہتی۔"

حقارت سے بولے گئے میرے یہی لفظ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے محفوظ ہوئے کہ مجھے اسی کوئل کی رنگت' پکوڑے جیسی ناک اور چھوٹی آنکھوں' بھدی آواز کے مالک شکیل کی منکوحہ بن کر سہاگ رات کو مسہری پر اُس کے انتظار کے لیے آنکھوں کے دیے جلانے پڑے۔

☆......☆......☆

بھائی کی نعمت سے محروم ہم تین بہنیں' اپنی مرحومہ والدہ کی آنکھوں کا تارا اور دل کا سکون تھیں۔ ہماری ماں کی پوری برادری میں مثال دی جاتی تھی۔

انتہائی شریف' ملنسار' سلیقہ شعار' ٹھنڈے مزاج کی مالک' اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ ہر زیادتی کو خاموشی سے برداشت کر لیتی' شکوہ کبھی زبان پر نہ لائی۔ ہم تینوں بہنیں والدین کے لاڈ پیار اور محبت سے خوشیوں کے جھولوں میں ہلکورے لیتے جوانی کی پگڈنڈی پر چلنے لگیں۔ بچپن سے جوانی تک کے سفر کا والدین کی محبتوں کے طفیل پتہ بھی نہ چلا۔ ہر وقت روتی دھوتی' نہانے سے دور بھاگنے والی' بکھرے بال اور کھیل کود کے دوران مٹی میں کھیل کر مٹی ہو جانے والی نازو نخرے اور غرور کی نگری میں داخل ہو چکی تھیں۔

جب گلی کی نکڑ والی دکان کے چھپڑ کے نیچے سے آوازیں کسی جانے لگیں' تاک جھانک کرنے والوں سے راستے آباد ہونے لگے' تھڑے' بازار' گلی میں منتظر آنکھیں ہمارے دیدار کے لیے ترسنے لگیں تو ہمیں لڑکی ہونے کا فخر محسوس ہونے لگا' غرور ساتھ دینے لگا۔ آوارہ منش' ترسی نگاہوں کے بھکاری دیکھتیں تو عجیب سکون محسوس ہوتا۔ اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتیں' کسی کو نظر التفات کے قابل تصور نہ کرتیں' غرور سے تنی گردن میں عجیب خمار ہوتا' کسی کو خاطر میں لانا اپنی توہین سمجھتیں۔ منتظر نگاہوں کو انتہائی حقارت سے جھڑک کر آگے نکل جاتیں۔

حسن کا جادو راگ الاپ رہا تھا' دیکھنے والوں پر نشہ طاری تو ہونا تھا۔

بچپن کے کھیل' گڈے گڈی کا کھیل' کوکلے چھپا کی' چھپن تلاش دماغ سے محو ہو گئے۔ سکھیوں کے سنگ طے کئے فاصلے خواب ہو گئے اور ہم تین بہنیں پریوں کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ جہاں بھی من چلے بیٹھتے' ہمارا ذکر ضرور ہوتا۔

والدین کو اولاد جوان ہونے کا احساس ہوا تو بڑی بہن عابدہ کا رشتہ ماموں کے وٹے میں ہوا' میرا دوسرا نمبر تھا لیکن حسن کی دوڑ میں صرف گھر میں نہیں پورے گاؤں میں میرا ثانی کوئی نہ تھا۔ اس بات کا احساس تاک جھانک کرنے والوں کے علاوہ آئینے نے بھی کروایا تھا۔ پہروں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود ہی خود کو داد دیتی رہتی جب اپنے آپ کے حسین ہونے کا یقین ہوا تو میں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ حسن کی آگ میں جل کر کوئلہ بننے والے مجنوں ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔

میری غزالی آنکھیں گلاب کی پتیوں کی طرح نرم و نازک لال ہونٹ' صراحی دار گردن' سیاہ رات کی طرح لمبے گھنے بال' ہرنی جیسی چال کتنے ہی دل یہ حسن کا چلتا پھرتا مجسمہ دیکھ کر گھائل

ہو جاتے۔ جوانی مستانی کی وجہ سے گلی کی نکڑ‘ کوٹھے کی دیوار کا سایہ‘ دکان کا تھڑا‘ جانوروں کی چھاؤں کے لیے بنایا گیا چھپڑ آباد ہونے لگے۔

جب بھی میری ایک جھلک دیکھنے کا کوئی منتظر‘ گلی کی نکڑ‘ دکان کے تھڑے‘ سایہ دار چھپڑ یا بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگے میٹرک ریڈنگ کے بہانے ترس ترس کر چور کی طرح آنکھ کی پتلیوں کو آگے پیچھے گھما کر مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھتا تو غرور سے میری گردن تن جاتی آنکھوں میں رعونت اتر آتی‘ دل ہی دل میں للکارتی۔

’’کوئی مجھ سا ہو تو سامنے آئے۔‘‘

ایک دن میں ہمسائے کے گھر گئی تو اسکول گئے بچے ابھی واپس آئے تھے‘ کھانے کے دوران اپنی ماں کو کہنے لگے۔

’’استاد جی نے بولا ہے کل غرور کا سر نیچا کہانی لکھ کر لانی ہے۔‘‘

اُس وقت مجھے یہ بات سمجھ نہ آئی‘ مجھے کیا پتہ تھا کہ غرور کا بھی سر ہوتا ہے‘ یہ حقیقت تو بہت بعد میں اُس وقت کھل کر سامنے آئی‘ جب حسن کی دیوی سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو ماورائی مخلوق سمجھنا شروع کر دیا۔ لڑکے بالے ایک اشارے پر مندری‘ چھلا‘ پیتل کا بنا ہوا دل والا لاکٹ تحفے کی صورت میں دیتے۔

تحفہ دیتے وقت جب اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوتا تو کتنی ہی دیر تسکین کے تالاب میں غوطہ زن رہتے۔

ایک دفعہ میرا ایک خود ساختہ عاشق سنگ بابا تخی سرور سے میرے لیے مندری‘ جوڑی‘ چھلیاں دی‘ گلابی رنگ کی چوڑیاں‘ خوبصورت کلپ اور پیتل کی زنجیر میں جڑا لاکٹ لایا تو میں نے بھی حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اُسے اپنے ہاتھوں سے کروشیے کی کڑھائی والا گلابی‘ سبز پتیوں والا رومال دیا تو اس کا دیوانہ پن دیکھنے کے قابل تھا یوں فریفتہ ہوا کہ جان مانگوں تو گلا کاٹ کر میرے ہاتھوں پر رکھ دے۔‘‘ اُس نے جان سے گزر جانے کا وعدہ کر ڈالا۔ اپنے حسن کی اتنی پذیرائی دیکھ کر میں تو ہواؤں میں اڑنے لگی‘ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگی۔ آسمان سے اتری حور کا گمان ہونے لگا۔ غرور کے جھولے میں ہلکورے لیتے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ میرے زوال کے دنوں کی پہلی اینٹ رکھ کر بنیاد کا افتتاح کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

ابو جی کے دل میں بیٹے کی خواہش کا ارمان انگڑائی لینے لگا۔ بے اولاد جوڑوں کو اولاد اور بیٹیوں والے ماں باپ کو بیٹے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔

دو وقت کی روٹی پوری ہو یا نہ ہو بیٹے کی خواہش میں بیٹیوں کی لائنیں لگا دیتے ہیں اور جب تیرھویں چودھویں نمبر پر بیٹا پیدا ہوتا ہے تو زمین کا ٹکڑا اگر ہو تو بک کر پیٹ کے ایندھن کے لیے صرف ہو چکا ہوتا ہے‘ بعض اوقات باپ کی وفات کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے۔

کبھی کبھار باپ خوشی غمی کے احساس سے محروم ہو چکا ہوتا ہے تب نرینہ اولاد پیدا ہوتی ہے۔ لمبے عرصے بعد پیدا ہونے والے بیٹے ماں باپ اور بہنوں کی آنکھ کا تارا ہوتے ہیں۔ دنیا جہاں کی ہر پابندی سے آزاد‘ جو مرضی کرتے پھریں ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا‘ ناز و نعم میں پلے یہ نوجوان بعض اوقات والدین کو اتنا خوار کرتے ہیں کہ والدین کو اپنی دعاؤں پر شرمندگی اور افسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسے لاڈلے نوجوان

معاشرے کے لیے کم ہی سود مند ثابت ہوتے ہیں۔

جوادھیڑ عمر بزرگ خود مزدور ہو' کسی کی زمین پر جھونپڑی بنا کر رہتا ہو' اپنی چاند کا ٹکڑا بیٹی کا رشتہ رنڈوے سات جوان بچوں کے باپ کو دے کر اپنے اپنے ماتھے پر بیٹے کی خواہش کے لیے سہرا سجائے' بیٹا پیدا ہونے کی آس امید بھی نہ ہو تو ایسے باپ کو کیا کہیں؟ اگر بیٹی کو اپنی خواہشات کی صلیب پر لٹکانا بھی ہے تو کم از کم کسی خوشحال تن تنہا بزرگ کے پلے تو باندھا جائے۔

جس بزرگ کو روٹی پوری کرنے کے لیے سارا دن وڈیرے کے ڈنگروں کو چارہ ڈالنا پڑے' کھیتوں کو پانی لگائے' بیوی اور بیٹیاں سارا دن کھیتوں میں کام کریں اور فارغ ہو کر حویلی میں جھاڑ پونچھ کریں' وڈیرے کے بیٹوں اور رشتے داروں کی ہوس بھری نگاہوں کا نشانہ بنیں' ایسے شخص کو بیٹے کی خواہش کے لیے بیٹی قربان کرنے سے پہلے ضرور سوچنا چاہیے۔

ابو نے بیٹے کی خواہش کے لیے دوسری شادی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی' دوست احباب کو وٹے سٹے پر رشتے کے لیے کہا۔ رشتے کے معاملے میں دیہاتوں میں ایک بہت بڑی مصیبت رشتوں کے تناور درخت کو ٹنڈ منڈ کرنے کے لیے منہ پھاڑے کھڑی ہوتی ہے۔ ہم دیہاتی لوگ غیر برادری میں رشتہ نہیں کرتے' غیر برادری کا نوجوان جتنا امیر ہو' خوبصورت سلیقہ شعار ہو' تعلیم یافتہ' خوشحال ہو اور صاحب استطاعت ہو اس کو رشتہ نہیں دیتے۔

برادری والا چاہے سارا دن ٹوکری میں پتھر ڈھوئے' سبزی کا ٹھیلہ لگائے گاؤں کے چوک میں جوتے پالش کرے' اسے رشتہ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ برادری کا نوجوان ہے جس جگہ میرے رشتے کی بات چلی اور ریشم کی طرح مضبوط ہوئی' وہ شخص میرا ہونے والا شوہر ایک زمیندار کے جانوروں کو چارہ ڈالتا تھا جبکہ میری سوتیلی ماں بننے والی اس کی بہن حویلی میں صفائی ستھرائی کرتی اور دیگر چھوٹے موٹے کام سرانجام دیتی۔ دونوں گھرانوں کو شادی کی جلدی تھی اس لیے جلد ہی ہم لوگ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے' اور ابھی میری دلہنیا پن کی رچھ بھی نہیں اتری تھی کہ مجھے حویلی میں سوتیلی امی جان کی جگہ ڈیوٹی سرانجام دینی پڑی۔

میں حویلی میں کام کرتے ہوئے ملازم کم اور مالکن زیادہ نظر آتی تھی' حویلی والوں کا جو بھی رشتہ دار' عزیز دیکھتا' ایک بار تو اس پر سکتہ طاری ہو جاتا' آنکھیں جھپکنا بھول جاتا' سانسوں کی روانی اتھل پتھل ہونے لگتی۔ حویلی کے مکینوں پر میرے حسن کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔

میرے حسن کے چرچے حویلی سے نکل کر گاؤں کی گلیوں اور راتوں کو چولہوں کی زینت بن گئے۔ حویلی کے اوباش امیرزادوں نے یتیم کا مال سمجھ کر میرے حسن کی دولت کو لوٹنے کی منصوبہ بندی کرنی شروع کر دی۔

حویلی کا بڑا سائیں میرے صدقے واری جاتا' کام کے بہانے کمرے میں بلا کر پاؤں دبانے کو کہتا' کبھی سرسوں کا تیل سر میں لگانے کو کہتا' بیڈ پر سامنے بٹھا کر میرے چہرے کا طواف کرتا رہتا' ہر مشکل میں مدد کرنے کو کہتا۔ دوسری طرف اس کا بیٹا باپ سے چھپ کر مجھ پر تحائف کی بارش کرنے لگا۔ کام کرنے کی بجائے فارغ بٹھائے رکھتا' کمرے میں مووی چلا کر ساتھ بٹھا کر مووی دکھاتا' ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈی ہوا میں

بیڈ پر آرام کرنے کو کہتا۔ کبھی تو اپنی حرکات سے یوں ظاہر کرتا جیسے میں ملکہ ہوں اور وہ میرا ملازم......

یہاں آتے ہی قیمتی اشیاء کے حصول اور استعمال کے میرے تمام خواب شرمندہ تعبیر ہوگئے۔ جن چیزوں کی خواہش بڑے مایوس دل کے ساتھ کرتی تھی وہی اشیاء چھوٹا سائیں لمحوں میں میرے حوالے کر دیتا۔ تفکرات' پریشانی' غم اور غربت کے بادل چھٹنے کی دیر تھی کہ میرے حسن کا چاند آدھی رات کی بجائے دن کو بھی طلوع ہونے لگا۔

اچھی صحبت' مرغن غذا' بہترین لباس اور طرز زندگی' بناؤ سنگھار اور ہلکے پھلکے میک اپ نے میرے حسن کو چاند کی نگری بنا دیا۔ بڑے سائیں کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی چندھیا گئی تھیں۔ رات کو بہانے سے اپنے کمرے میں بلوالیتا۔ میں سر کی مالش کرتی جبکہ میرا خاوند پاؤں دبا کر غلامی کا حق ادا کرتا' رات کو سائیں نے خود دودھ پینے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پلانا شروع کر دیا۔ کام کے اوقات کم کر دیے گئے بلکہ کمرہ خاص تک محدود ہوگئی۔ ہمارے مسائل اور مشکلات ترجیحی بنیادوں پر حل ہونے لگیں۔ نوازشوں کی بارش ہونے لگی میری اور میرے خاوند کی تنخواہ بڑھا دی گئی۔ رات کو تنہا بھی مجھے خدمات سرانجام دینا پڑتیں۔ پیار محبت چاہت کے قصے کہانیاں سننا پڑتیں۔

سائیں جی میرے بالوں کی مانگ نکالنے لگے۔ بھوکے گدھوں کی طرح کتنی ہی دیر میرے جسم کو بھنبھوڑتا رہتا۔ دن کے وقت بیٹے کی ہوس کا شکار بنتی۔

باپ جونہی حویلی سے باہر نکلتا' بیٹا الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوتا' میرا حال اور ضروریات پوچھتا اب تو اس کے طفیل کانوں میں سونے کے جھمکے لٹکنے لگے جیب خرچ دل کھول کر دیتا۔

ایک دن باپ بیٹے کی حرکات اور خدمات کا ذکر اپنے خاوند سے کیا تو وہ الٹا مجھے موردالزام ٹھہرانے لگا۔

"اُن عزت دار لوگوں کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کرنا' چھوٹے مالک پر شاید تم خود مرمٹی ہواُن کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ہو' ہوسکتا ہے کام کرنے والی حقیر نوکرانی سمجھ کر مالک نے تم کو گھاس نہ ڈالی ہو اور اس کے بدلے ان معزز' شریف لوگوں پر تہمت لگا رہی ہو' میں لمبے عرصے سے اُن کا نمک کھا رہا ہوں۔ مجھے نمک حرام نہ بناؤ' جھوٹے' من گھڑت قصے میرے مالکوں کے بارے میں مت سناؤ۔ اُن لوگوں کو کس چیز کی کمی ہے ان کے ادنیٰ سے اشارے پر پرستان سے پریاں آنے کو تیار ہیں' تم کس کھیت کی مولی ہو' شکر کرو تمہارے ہاتھوں سے وہ کھانے پینے کی چیزیں لے لیتے ہیں وگرنہ ہم 'کمیں' لوگوں کی وقعت ہی کیا ہے۔

ہم کہاں اور یہ فرشتہ سیرت عظیم' غریب پرور انسان کہاں تمہارے آنے سے قبل بھی ایک ملازمہ نے چھوٹے مالک پر زبردستی عزت لوٹنے کا الزام لگایا تھا۔ سائیں جی نے نہ صرف اسے نوکری سے نکال باہر کیا بلکہ چوری کے جھوٹے مقدمے میں تھانے بھی بند کروا دیا۔ کہیں وہی کہانی تمہارے ساتھ بھی نہ دہرا دی جائے۔ یاد رکھنا' میں تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔ اپنے مالکوں کا نمک خوار ہوں' چاہے جان چلی جائے نمک حرامی نہیں کروں گا' مجھے تمہارے بجائے اُن کی عزت

زیادہ عزیز ہے۔ خبردار! آئندہ میرے مالکوں کی عزت پر کیچڑ نہ اچھالنا ورنہ بہت برا نتیجہ نکلے گا۔"

☆......☆......☆

میری سوتیلی ماں اکثر میکے آجاتی اور پھر واپس سسرال جانے کا نام نہ لیتی۔ مجھ سے پہلے حویلی آجاتی' خود ہی کام کرنے میں مصروف ہوجاتی' رات کو خدمت کے بہانے بڑے سائیں کے کمرے میں سوجاتی جبکہ دن کو چھوٹے سائیں کے آگے پیچھے پھرتی' کمرے کی صفائی کرتی' کپڑے استری کرتی جوتے پالش کرکے اپنے ہاتھوں سے تسمے ڈال کر پہناتی۔ کام کے دوران مجھے چھوٹے سائیں کے کمرے کے نزدیک نہ جانے دیتی' بلاوجہ رعب جھاڑتی۔ جب میں کام نبٹا چکی ہوتی تو مجھ تنگ کرنے کے لیے واش روم سرف سے دھونے کو کہتی۔ یہاں آکر میری سوکن' سوتن اور مالکن کا کردار ادا کرتی۔ غرض ہر طریقے سے مجھے گھٹیا' نیچ ذات اور نیچ کردار کی مالک ظاہر کرنے کی کوشش کرتی۔ میرے کیے ہوئے ہر کام میں کیڑے نکالتی' سائیں جی کے سامنے رو رو کر اپنے آپ کو مظلوم اور میرے باپ کو ظالم ظاہر کرتی' بھوکا' ننگا' گھٹیا' بے گھر ہونے کے طعنے دیتی' سائیں جی کے سامنے درندہ صفات کا مالک ظاہر کرتی' پورے جہاں کی خامیاں اسے میرے باپ میں نظر آتیں۔ مالکوں کی نگاہوں سے گرانے کا ہر حربہ آزمایا' مالک بھی پرانی ملازمہ کی خدمات سے روگردانی نہ کرسکے' اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہوگئے۔

چھوٹے سائیں اگرچہ اُس کے پیار سے محظوظ ہورہے تھے مگر اس کے ساتھ میرے حسن کے دیوانہ پن کے بھی معترف تھے' میرے سنگ گزرے خوشی کے لمحات بھی بھلا نہ پائے' اپنی خلوت کا ساتھی بنانے کے لیے آس لگائے بیٹھے تھے' اور میں نے بھی اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ جب میرے خاوند کو اعتراض نہ تھا تو میں کفرانِ نعمت کیوں کرتی' سوتیلی ماں نے چھوٹے سائیں کو مجھ سے بدظن کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا' مجھ پر جھوٹی تہمتوں' یارانے' عاشقی' عیاشی کی بھرمار کردی' مگر میرے حسن کے پروانوں کو تو میری روشنی سے غرض تھی' میں کون سی اُن کی رشتے دار تھی جو وہ غیرت کرتے' اور وہ صرف موقع کی تلاش اور میری ہاں کے منتظر تھے۔ ہاتھ آئی سوغات کو وہ کسی صورت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ مجھے چھوٹے سائیں سے دور کرنے میں ناکام ہوئی تو اس حویلی میں اپنا کھویا مقام پانے کے لیے مقابلے پر اتر آئی۔ اس نے بھائی کی غیرت اور خاوند کی عزت کو کوڑیوں کے بھاؤ نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنت حوا صرف حسد اور سوتیلے پن کی وجہ سے انسانیت کی معراج سے اس حد تک گرسکتی ہے اگرچہ سوچا نہیں جاسکتا' مگر میرے ساتھ ایسا ہوا اور شاید بہت سوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہو۔

اب تو اُس کی راتیں حویلی میں گزرنے لگیں' شام کو یوں بن ٹھن کر حویلی جاتی جیسے کسی بہت بڑی تقریب کی مہمان خصوصی ہو' بڑے سائیں کی رات دن خدمات کے ثمرات یوں حاصل کیے کہ بڑے سائیں کی آشیرباد سے عدالت میں خلع کا دعویٰ دائر کردیا۔

نوٹس ملنے کی دیر تھی کہ میرا باپ مجھے لینے آگیا کیونکہ وٹے سٹے کا معاملہ تھا۔ میری روانگی کے وقت سوتیلی ماں کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ اسی دن کے لیے تو اس نے اپنا سہاگ داؤ پر لگادیا

تھا۔ اُس کی دیرینہ خواہش یوں پوری ہوئی کہ راستے کا پتھر خود بخود سرک گیا۔ اب وہ آزادی سے ہر معاملے میں خودمختار بننے جارہی تھی' راستے کی رکاوٹ دور ہورہی تھی اگلے ہفتے میں نے بھی تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کردیا اور جو شہر سے دور جنگل کنارے آباد بستی کے باسی تھے انہیں زندگی میں پہلی بار تسلی سے شہر جانا نصیب ہوا۔

مسائل کی ڈوری میں اُلجھے تو وکیلوں اور عدالت کی کٹھن گھیریوں سے آگاہی ہوئی ہم پینڈو اَن پڑھ لوگ تھے' عدالتی امور اور وکیلوں کی ہدایات اور مطالبات کی خاک سمجھ آتی تھی' اسی شہر میں مقیم دور پار کے تیز طرار' ہرفن مولا لفظوں کے محلات بنانے والے کوئل کی رنگت' پکوڑے جیسی ناک اور چھپکلی جیسی آنکھوں والے رشتے دار شکیل نے یہ بارگراں اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھانے کے لیے خدمات پیش کیں۔

وہ تھانے اور کچہری کا ٹاؤٹ تھا' کمیشن لے کر لوگوں کے جائز وناجائز کام کرواتا تھا۔ کیس دائر کرنے کی دیر تھی کہ بھنورے کی طرح میرے حسن کے پھول پر منڈلانے لگا' بہانے سے گھر کا چکر لگاتا' گاہے بگاہے کیس کے زیر زبر سمجھانے کے بہانے حسن کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگا۔ اکثر کیس کے بہانے شہر لے جاتا' وکیل کے چیمبر کے چکر لگوانے کے بعد کھانے پینے کے لیے ہوٹل پر لے جاتا چونکہ میرا کیس چل رہا تھا اور وہ پیروی کررہا تھا اس لیے میں بھی بلاخوف وخطر اس کے ساتھ عدالتوں کے چکر لگانے لگی۔ پیشی پر جانے کے بہانے ہوٹلوں میں دعوتیں اڑانے لگی' لیکن میں نے ایک بات کی بہت احتیاط کی کہ اسے ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیا اور نہ ہی اس کا مان توڑا کیونکہ وہ میرا کیس لڑ رہا تھا۔

جب میرے پیار کی حدت نے اُسے پگھلا کر پانی پانی کردیا تو وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا' دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر حرف مدعا زبان پر لے آیا' پہلے تو پیار محبت' تاعمر ساتھ نبھانے اور جان سے گزرنے کے دعوے کرتا رہا' پھر اچانک اٹھ کر میرے پاؤں میں بیٹھ کر ہاتھ جوڑ کر اور آنسو بہا کر محبت کی خیرات کے لیے التجا کرنے لگا' میرے ہاتھوں کو چومنے لگا اور پھر اپنی آنکھوں کو میری مخمور نگاہوں میں ڈال کر ان جھیل سے کٹوروں میں ڈوب کر خودکشی کرنے کی دھمکی دے ڈالی۔

اس کی بے بسی پر مجھے بھی ترس آگیا' میری چاہت کے سمندر میں ڈوب کر وہ تو گوہر نایاب پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی' محنت کا ثمر پا کر بہت ہی مخمور تھا۔ مزید ایک پیشی بھگتنے پر مجھے طلاق ہوگئی۔ آزادی کا پروانہ تھامتے ہی زندگی کو کسی کی غلامی میں دینے کا مجھے مکمل اختیار مل گیا۔

طلاق کا طوق گلے میں ڈالنے کا غم اور آزادی کی خوشی عجیب صورت حال بن گئی تھی۔ مستقل گھر میں ہی رہنے لگی' جبکہ شکیل پہلے کی طرح بلاجھجک گھر میں آنے لگا دنیا دار لوگوں کی طرح ہم بھی مفاد پرست نکلے' اور پھر ایک دن ابو نے اس کے گھر آنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا' کام ہوجانے پر میں بھی بے اعتنائی برتنے لگی' مجبوری کے عالم میں اس کے ساتھ سلام دعا کرتی' اس کو چائے پانی دینا مجھے سزا لگتا' میری آنکھیں ماتھے پر تھیں اب مجھے کون سا اس سے کام تھا جو میں اس کے آگے پیچھے پھرتی' اور چاہتوں کے جھولے میں جھلاتی' شکیل دھن کا پکا نکلا' جب بھی آتا ہوٹل کے کمرے میں کیا شادی کا وعدہ یاد دلاتا' باپ سے بات کرنے کو کہتا۔

محبت کے دیوانے بھی عجیب مجنوں ہوتے ہیں' میری بے رخی کو بھی محبت اور ہاں کا اظہار سمجھتا۔ میں نے اسے گھاس نہ ڈالنے کی قسم کھالی اور اس نے مجھے پانے کی قسم کھالی' کمزوری عورت کی صفت میں شامل ہے' میرے ارادے بھی ڈگمگانے لگے' سوچ وفکر متزلزل ہونے لگی' نفرت کی آگ محبت کے پانی سے بجھنے لگی۔ وہ شخص اپنے پیار' محبت اور جہد مسلسل سے میرے پیار کے بادل کو اپنی زندگی کی جھونپڑی پر برسنے میں مجبور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی مستقل چاہت نے مجھے بھی اسے اپنانے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔

بے شک میں خوبصورت اور نوجوان تھی' مگر طلاق کا جھومر ماتھے پر تھا۔

''گھر بیٹھی لڑکیاں جو مرضی پاپڑ بیلتی پھریں شریف شمار کی جاتیں ہیں مگر طلاق یافتہ لڑکی جتنی مرضی پاک باز' باکردار' پاکیزہ سیرت کی مالک ہو' اسے دی گئی ناجائز طلاق کو بھی اس کا جرم سمجھا جاتا ہے' اور معاشرے میں انتہائی نفرت اور حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ جب ایک بار پھر گھر بسانا ہی تھا کیوں نا اس چاہت کی آگ پر جلنے والے پروانے سے شادی کرلی جائے۔ رات کو مصمم ارادہ کرکے اگلے دن ہاں کرنے سے قبل اس کے گھر کے بارے میں تحقیقات کا فیصلہ کیا۔

پہلی حقیقت کا انکشاف ہوتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہ نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ تین بچوں کا باپ بھی تھا۔

اس حقیقت کا انکشاف ہوتے ہی میں نے خواب میں بھی اس کے آنے پر پابندی لگادی' سوتے جاگتے خیالوں میں 'سوکن' چیرنے پھاڑنے کے لیے چھری لے کے میری طرف

غزل

یاد آتے ہیں وہ بچپن کے زمانے کتنے
اُن دنوں تھے یہ دن رات سہانے کتنے

آ کے ٹھہرے تھے ذرا دیر کو ہم تم دونوں
شہر میں ہوگئے مشہور فسانے کتنے

ہم تو صبحوں کے سرابوں میں بچھائے آنکھیں
دیکھتے رہتے ہیں خواب اب بھی سہانے کتنے

چند یادوں کا سہارا لیے جب بھی گزرے
آگئے پاؤں تلے اپنے زمانے کتنے

سیدھے سادھے سے جو لگتے تھے کبھی ہم کو سعید
آگئے ان کو بھی دیکھو تو بہانے کتنے

سعید الظفر صدیقی

بڑھتی ان حالات کی وجہ سے سخت پریشان تھی جبکہ اس کی محبت کا دریا ساون بھادوں کے دریا کی طرف کناروں سے باہر اچھلنے لگا۔

ایک دن رشتے داروں اور برادری کے معززین کے ہمراہ ہمارے گھر پر دھاوا بول دیا۔ پنچایت کے سامنے میرے باپ کے پاؤں پکڑ لیے اور بیٹا بنانے کے لیے ترلے کرنے لگا۔

''میں آپ کا سگا بیٹا نہیں' مگر حقیقی بیٹے سے بڑھ کر آپ کی خدمت کروں گا' آپ کا اعتماد بحال رکھوں گا' آپ کے رشتے دار میری وفا کی مثالیں دیں گے' آپ کی بیٹی کو ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھوں گا' وقت کی دھوپ میں خود تو جل جاؤں گا مگر اسے پیار کے سائے میں محفوظ رکھوں گا اس کے ہر دکھ درد' پریشانی کی دوا بن کر رہوں گا۔''

اس کے جذبات اور بزرگوں کے اصرار پر ابو نے کچھ عرصے کی مہلت مانگی۔

جب وہ لوگ چلے گئے تو ابو نے مجھے بلایا اور کہا۔

''بیٹی! تجھے طلاق کا داغ لگ چکا ہے۔ تیری اہمیت پہلے والی نہیں رہی' ہمارے معاشرے کے لوگ طلاق یافتہ عورت کے سائے سے بھی نفرت کرتے ہیں' جس گھر میں جوان بیٹیاں ہوں' اسے وہاں کوئی داخل نہیں ہونے دیتا کہ اس کا نحوست والا سایہ ہماری بیٹیوں کے مقدر پر نہ پڑے' اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں' سسرال' میکے کے امن وسکون اور عزت وحرمت کی بربادی کا ذمے دار گردانا جاتا ہے' میرے بعد تمہارا کون ہے جو سدا تمہارے سر پر محبت اور حفاظت کا ہاتھ رکھے گا' ماں اور بھائی کی محبت سے پہلے محروم ہو' آوارہ تنکے کو تو ہوا بھی سکون سے کسی جگہ نہیں رہنے دیتی' تم تو جیتی جاگتی' جوان' خوبصورت لڑکی ہو' تمہاری عزت کو نوچنے کے لیے کئی کوے' باز' شکرے منتظر ہوں گے' مگر جب اپنانے کی بات کرو گی تو تمہاری ہر ایک ایک ادا پر فدا ہونے والے تھوکیں گے' بدکردار' فاحشہ کے طعنے دیں گے' اس وقت تمہاری فریاد کوئی نہیں سنے گا' ہر فرد تم کو مجرم سمجھے گا' تمہاری رہی سہی عزت بھی اچھالی جائے گی۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ 'ہاں' کر دو' شادی شدہ ہے تو کیا ہوا' نوجوان ہے' چلتا پھرتا پرزہ ہے' تم سے چاہت کرتا ہے' ہمیشہ تمہارے تابع رہے گا' کسی پریشانی سے دوچار نہیں ہوگی' تمہارے سر پر سایہ ہوگا' کسی کی جرأت نہیں ہوگی کہ تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھے' اخراجات پورے کرنا اس کی ذمے داری ہے۔ اگر وہ تم سے شادی کر رہا ہے تو اس بندھن کو نبھائے گا' تمہیں اہمیت دے گا۔ تمہاری ضروریات اور خواہشات کی ذمے داری پوری کرے گا۔ ایسے رشتے روز نہیں آتے' ہوسکتا ہے کل کو کسی رنڈوے' یا آوارہ نکمے' نشئی کا رشتہ آئے بہتر ہے ہم اس سے سنہری وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔''

''ابا جی' وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے' ان چار افراد کو سنبھالے گا یا مجھے سہارا دے گا تین بچوں کی ماں 'سوکن' کے روپ میں مجھے کب برداشت کرے گی' وہ لڑکی اُن کی قریبی رشتے دار ہے' اگر اس کے حق پر ڈاکہ ڈالا گیا تو پوری برادری اٹھ کھڑی ہوگی' اس گھر میں میری کون سنے گا' میں تو بغیر تنخواہ کے اس کے بچوں کی ملازمہ ہوں گی' میرے دکھ پر وہاں کون ہوگا جو رنجیدہ ہوگا۔'' ہچکیوں کے دوران میں نے ابو کو جواب دیا تھا۔

مقررہ دن سے قبل ہی جمیل جواب لینے کے لیے گھر آ گیا۔ ابو کے جواب دینے سے قبل میں

نے اُسے ٹکا سا جواب دے کر لاجواب کر دیا۔

''اگر بیوی اور بچوں کی خدمت کے لیے کسی کنیز کی ضرورت ہے تو کسی یتیم' بے سہارا 'لاوارث لڑکی یا بیوہ کا انتظام کرو' یتیم خانے کا دروازہ کھٹکھٹاؤ' آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے' کیوں جیتے جی مجھے سوکن کی نفرت کی آگ میں جلا کر بھسم کرنا چاہتے ہو۔''

میرا اتنا سخت جواب سن کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا' لگتا یوں تھا اس کے جسم میں موجود خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو' آنکھوں کی برکھا برسنے لگی۔

''میں تمہارے بغیر زندہ رہنا سزا سمجھتا ہوں' میں تو کب کا تمہارا بے دام غلام بن چکا ہوں' تجھے پانے کے لیے بیوی بچے تو کیا دنیا کی شاہی چھوڑ سکتا ہوں۔''

''اگر تم نہ ملیں تو موت کو گلے لگا کر چاہت کا حق ادا کر جاؤں گا۔ یہ میری ضد نہیں پگلے دل کی مجبوری ہے' جو صرف تمہارے نام کی مالا جپتا ہے تم میری روح کی غذا' سانسوں کی بحالی ہو' خون کی روانی ہو' جو نظر نہیں آتا مگر زندگی کی روانی کا موجب ہے' تم مجھے جواب نہیں دے رہی ہو بلکہ موت کے حوالے کر رہی ہو۔ تم میری زندگی کے مقصد سے انکار کر رہی ہو' تمہارا یہ فیصلہ میری موت کا پروانہ ہے۔'' آنسوؤں کی برسات کے دوران لہو لہو رلانے والا جواب دیا۔

''تم جیسے دیوانے بہت دیکھے ہیں' جو چاند تارے توڑ کر بالوں میں سجانے کے دعوے تو بہت کرتے ہیں مگر گاؤں کے ساتھ والے کھیت سے سرسوں کا ساگ بھی نہیں توڑ کر لا سکتے' کسی کو پانے کی خاطر مرنے کا دعویٰ کرنا بہت آسان ہے مگر جان سے گزر جانا بہت مشکل' تو مرے یا زندہ رہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں' مجھے پہاڑ جیسی زندگی گزارنے کے لیے مستقل سہارا چاہیے' دیے کی لو پر جل جانے والا پروانہ نہیں جو خود تو جلے ساتھ مجھے بھی جلا ڈالے۔'' میں نے اسے دوٹوک جواب دیا تھا۔

میرا جواب سنتے ہی وہ اپنا سامنہ لے کر چلا گیا۔ اس کی روانگی کے بعد میں نے سکھ کا سانس لیا' اس زبردستی کے عاشق سے تو جان چھوٹی۔ مگر میری یہ خام خیالی ثابت ہوئی۔ مجھے پانے کے لیے وہ تو پہاڑ سے شہد کی نہر نکالنے کے لیے بھی تیار تھا' زندگی کی قربانی دینا تو وہ اعزاز سمجھتا تھا۔

اگلے دن پتہ چلا کہ اس نے گھر جاتے ہی بہت سی نشہ آور گولیاں کھا کر زندگی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔

بے شک وہ میرا کچھ نہ لگتا تھا' لیکن اس کی قربانی ثمر مانگنے کے لیے میرے دل کے دروازے پر کشکول تھامے محبت کی بھیک کے لیے صدائیں دینے لگی۔ گریہ زاری اور بے قدری پر مبنی التجاؤں نے میرے دل کی نگری میں ہلچل مچا دی اسے کہے ہوئے سخت لفظ میرے دماغ کی چولیں ہلانے لگے' اتنی بڑی آزمائش میں ڈال کر میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔

میں ابو کے ہمراہ اسپتال گئی' وہاں اس کی ماں اور معصوم بچوں کا رو رو کر برا حال تھا۔

ماں نے ہمارے پاؤں پر اپنا دوپٹہ رکھا اور گڑگڑا کر بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

''اس کا روگ پوچھو' آخر کون سی پریشانی ہے' جس نے اسے مرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کل رات کا خاموش چھت کو گھورتا رہتا ہے' یا پھر روتا ہے۔ اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے میں اپنی زندگی

گردی رکھ دوں گی، کاش کوئی اس کا دکھ جو اس کو گھائل کر رہا ہے، مجھے بتا دے۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئیں ابو بھی سگریٹ پینے کے بہانے باہر چلے گئے۔ ان کے باہر جانے کی دیر تھی کہ رو رو کر اس کی ہچکی بندھ گئی، میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھے۔

"خدارا! مجھے زندگی دے دو، تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک، روح کی غذا اور دل کی دھڑکن ہو، تم میری زندگی ہو جسے میں گزارنا چاہتا ہوں، مجھے اپنے دل کا مکین بنالو، میری بیوی نے ناک میں دم کر رکھا ہے میرے مرنے کی اطلاع اس کو ملی ہے مگر وہ یہاں ہونے کی بجائے خوش ہے، تمہاری خاطر میں اسے طلاق دے دوں گا، تم اور میں الگ رہیں گے، تمہاری راہوں کے کانٹے پلکوں سے صاف کروں گا، میری وفا پر تم غرور کرو گی، اگر تم نے مجھے اپنانے سے انکار کیا تو آج نہیں تو کل موت کو گلے لگا کر اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر جاؤں گا۔"

اتنا سننا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ دھن کا پکا نکلا، اس کی محبت سچی تھی، وہ جیت گیا اور میں ہار گئی ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں وعدے کیے یہ سنتے ہی وہ تازہ دم، ہشاش بشاش اور صحت مند نظر آنے لگا۔

ماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بیٹے کو پرسکون اور خوش دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

ہمارے ملنے کی دیر تھی کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا، میرے وعدے اور اقرار نے آب حیات کا کام کیا۔ اگلے ہفتے چند خواتین اور مرد حضرات ایک بار پھر اس کے لیے ہمارے گھر موجود تھے۔ ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی اور ہاں کر کے اُن کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا گیا۔ شادی کی تاریخ مقررہ کر دی گئی۔ اگلے چند روز شادی کی تیاریوں میں گزر گئے۔ ہم نے کون سی تیاری کرنی تھی، لیکن وہ ایک شاندار شادی ہنگامہ کے انتظام میں لگ گیا۔

وہ بارات یوں لے کر آیا جیسے علاقے کے نواب کے اکلوتے بیٹے کی بارات ہو، وہ اور میں دوسری بار شادی کر رہے تھے۔ مگر انتظامات اور رسومات سے ایسا قطعی طور پر نہیں لگ رہا تھا۔ جب میری ڈولی سسرال پہنچی تو استقبال کے انتظامات دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی، اتنی پذیرائی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

میں تو دوسری شادی کی وجہ سے اندر ہی اندر خوف اور گھبراہٹ کا شکار تھی۔ مگر دہلیز پار کرنے پر پانچ مرلے کا پلاٹ تحفے میں دیا گیا۔

ساس اور جٹھانیاں صدقے واری اور آؤ بھگت میں مصروف ہو گئیں۔

منہ دیکھنے والی خواتین تو فخر کے ساتھ میری تعریفوں کے پل باندھنے لگیں جبکہ آنے والی خواتین میری خوبصورتی کے چمکتے چاند کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ میری ساس کو مبارکباد دینے لگیں۔

"کہیں سے چاند کا ٹکڑا چرا کر لائی ہو؟" اتنی تعریف کے جملے سن کر میرا سر فخر سے تن گیا، دل میں تہیہ کر لیا کہ ساس کی بہو کی بجائے سگھڑ بیٹی بن کر گھر کا سارا انتظام سنبھالوں گی۔

سہاگ رات کو سرتاج نے خوشیوں کے جھولے میں سلایا۔ منہ دکھائی میں سونے کی چین اور انگوٹھی دی تمام رات اپنی وفاؤں کی یاد دہانی کرواتا رہا۔

’’تمہاری خوشنودی کی خاطر، دنیا کی ہر چیز تمہارے قدموں میں ڈھیر کردوں گا‘ کل ہی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔‘‘

رات کو میں نے بھی ایک فیصلہ کرلیا‘ جس پر صبح عمل کرنے کا ارادہ تھا۔ علی الصبح اٹھ کر غسل کیا۔ نماز پڑھی پھر دلہن والے لباس کے ساتھ زیورات پہنے اور ہلکا پھلکا میک اپ کیا۔

شکیل کو بلایا اور اس سے پوچھا۔

’’تمہاری پہلی بیوی اور بچے کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ تو اپنے میکے میں ہے‘ بچے بھی اس کے ساتھ ہیں غصے اور ناراضگی کی وجہ سے شادی میں شرکت نہیں کی۔‘‘ مزید گویا ہوا۔

’’آج شام تک شادی کے ضروری امور نبٹانے کے بعد ان سے ہمیشہ کے لیے تعلقات ختم کردوں گا‘ مجھے ایسے رشتہ داروں کی کوئی ضرورت نہیں۔‘‘

’’اگر تم کو مجھ سے پیار ہے اور یہاں مجھے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہو تو میرا ایک کہنا مانو‘ مجھے اپنی بیوی کے پاس لے چلو‘ یہی میری آخری اور پہلی خواہش ہے اس کے بعد ساری زندگی تم سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔‘‘ غرض بڑی مشکل سے اُسے قائل کیا۔

ہم دونوں میاں بیوی چلتے چلتے ان کے دروازے پر پہنچ گئے‘ اندر قدم رکھا تو دیکھا۔ میری سوکن غموں کے پہاڑ کے نیچے دبی زندگی کے لیے سسک رہی تھی۔ ساتھ ہی بیٹھے بچے رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے۔

گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر تمام لوگ حیرت واستعجاب سے ہمیں دیکھنے لگے۔ میں نے دکھوں کی گٹھڑی بنی سوکن کو دور سے ہی پہچان لیا‘ قریب جا کر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کھڑا کیا اور گلے سے لگالیا۔ منہ پر بوسے لیے اور کتنی ہی دیر سینے سے لگائے پیار ومحبت کے پھول نچھاور کرتی رہی۔ جب ملنے سے فارغ ہوئی تو اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور بولی۔

’’تمہاری چھوٹی بہن ہوں تم کو لینے آئی ہوں سسرال سے میکے بیٹیوں کے جنازے جاتے ہیں۔ گھر بار چھوڑ کر میکے کے مسائل نہیں بڑھانے دوں گی۔ وہ گھر تمہارا تھا اور رہے گا میں تو تمہارے بچوں کی آیا ہوں۔ اب تمہارے آرام کرنے کے دن شروع ہو چکے ہیں‘ تمام کام میں کروں گی تم صرف نگرانی کرو گی۔ گھر داری‘ رہنے کے اصول وضوابط سکھاؤ گی۔ ہر قدم پر میری رہنمائی کرو گی‘ یاد رکھو! اگر تم اپنے گھر نہیں جاؤ گی تو میں بھی وہاں قدم نہیں رکھوں گی‘ تمہارے ساتھ یہیں رہوں گی۔ اب میرا مرنا جینا تمہارے سنگ ہے۔‘‘ یہ سن کر وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔

میں نے اس کا بازو پکڑا‘ بچوں کو ساتھ لیا اور گھر لے آئی۔

سسرال والے ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے میں نے سب لوگوں پر واضح کردیا۔

’’آج سے یہ میری بڑی بہن ہے گھر کی مالکہ اور سیاہ وسفید کی مالک ہے میں تو آپ سب لوگوں کی خدمت کے لیے آئی ہوں میری خوشی اس کی خوشی ہے۔‘‘

یہ سنتے ہی تمام لوگوں کی آنکھیں تشکر سے آبدیدہ ہوگئیں۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا‘ ہم حقیقی بہنوں کی طرح ایک چھت تلے زندگی گزار رہی ہیں۔ مجھے سوکن کی چھوٹی بہن ہونے پر فخر ہے۔ زندگی کے رنگ بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆☆......☆☆

پانچویں طویل کہانی منچن آباد سے

مسکراہٹ

شبنم شکیل کا شعر

اچھی قسمت بھی کہیں سینت کے رکھ دی ہوتی
یوں تو ماں نے سبھی داج سنبھالا اب تک

حسین خواجہ

جب آپ کے سامنے کوئی آپ ہی کی خوبیاں بیان کرتا ہے تو اُس وقت آپ کے

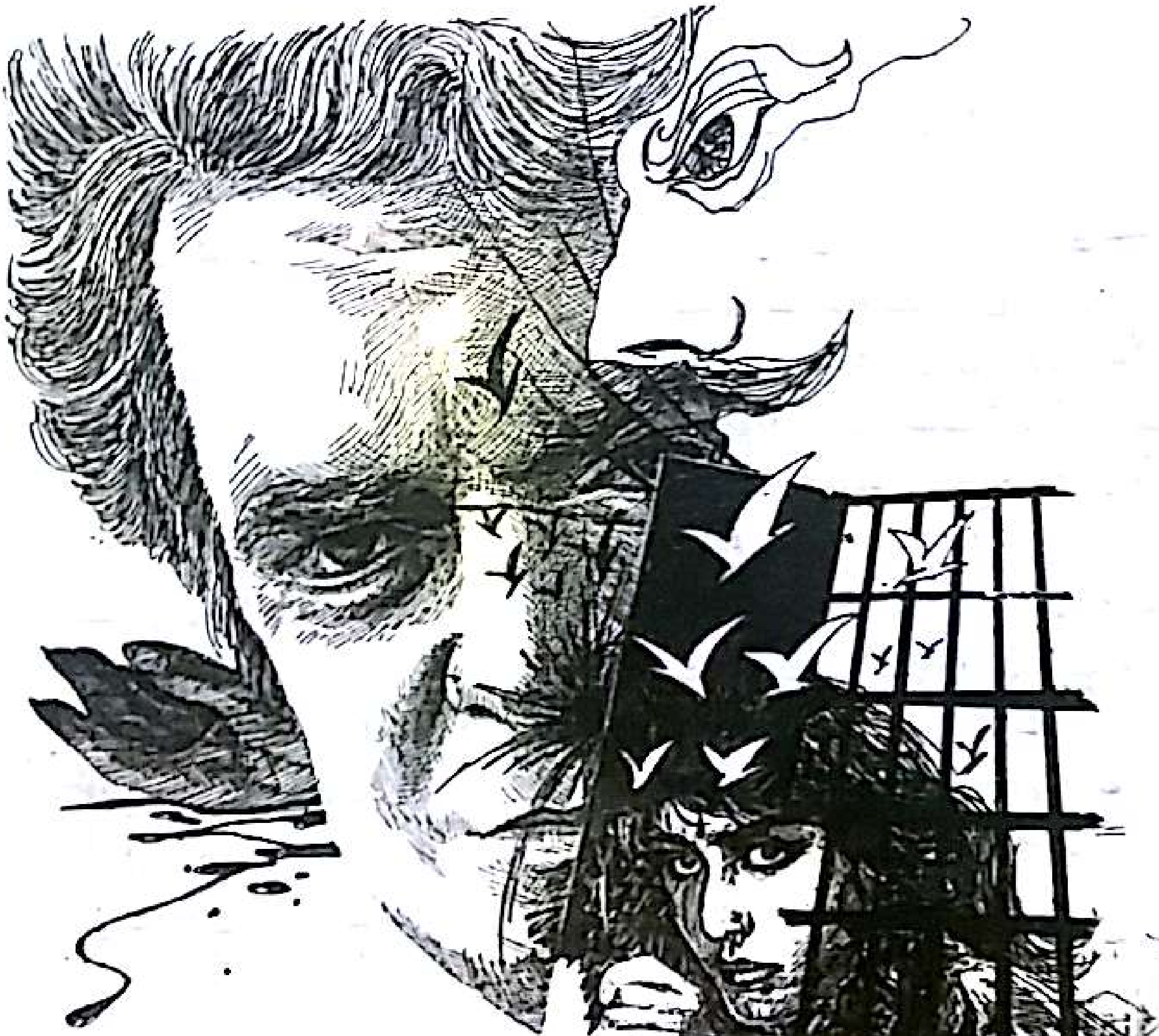

چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آ جاتی ہے' اور واضح طور پر یہ کہہ رہی ہوتی ہے۔

''ارے تم نے یہ کیا سمجھا اور کیا جانا۔''

میرے ذاتی خیال میں عورت کی زندگی تب تک ہی زندگی ہوتی ہے جب تک وہ ماں باپ کے گھر ہوتی ہے' شادی کے بعد تو صرف اور صرف ایک محاذ ہوتا ہے۔

میں نادیہ ایک غریب خاندان کی عام سی لڑکی ہوں' جس کی دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ اکثر اہم ضروریات کو بھی یہ کہہ کر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے' ابھی اپنے حالات ٹھیک نہیں...... ! کہیں پڑھا تھا کہ زندگی میں اگر سادگی اختیار کر لی جائے تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے' لیکن اِس سادگی میں کہیں نا کہیں ایسا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ زندگی اتنی بھی سادی نہیں گزرنی چاہیے کہ زندگی' زندگی ہی نا لگے' لیکن ہمارے حالات ایسی زندگی پر ہی مجبور کرتے تھے۔

بیٹیاں عذاب نہیں ہوتیں' لیکن غریب کے لیے آج کے اس ظالم غربت زدہ دور میں کسی عذاب سے کم بھی نہیں ہوتیں جہاں اپنی بساط سے زیادہ جہیز دینا پڑتا ہے' میرے والد صاحب ریٹائرڈ ماسٹر تھے' گھر کا گزر بسر اُن کی پنشن اور ٹیوشن سے ہوتا تھا۔ میں پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی' اب آپ ہی سوچیں ایک ریٹائرڈ ماسٹر کے گھر کے کیا حالات ہوں گے اور بچوں کے منہ پر کیا رونق ہوگی' ظاہری سی بات ہے بے بسی اور مفلسی تو واضح طور پر نظر آتی ہوگی۔

میں ابھی میٹرک میں ہی تھی کہ ایک دن خالہ کنیز ہمارے گھر آئیں خالہ کنیز دراصل امی کی بہت اچھی دوست تھیں' اور اُن کی اکلوتی بیٹی روبینہ میری بہت اچھی سہیلی تھی' اس طرح خالہ کنیز کے ساتھ ہمارا دلی رشتہ تھا اور وہ رہتی بھی ہمارے گھر کے قریب ہی تھیں' خیر تو خالہ امی کو سلام کرتے ہوئے بولی تھیں۔

''بہن رضیہ! میں آج تمہارے لیے ایک خوشی کی خبر لائی ہوں۔''

''کنیز خدا کا خوف کرو خوشی کی خبر اور غریب کے لیے۔'' اس پر خالہ کنیز نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہن میں مذاق کر رہی ہوں کیا؟'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک تو خوشی کی خبر اور اوپر سے یہ شکل' بات ہی نہیں جچتی' خیر اچھا بول کیا بات ہے۔''

''میں اپنی نادیہ کے لیے رشتہ لے کر آئی ہوں' میرے جاننے والے ہیں' مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کہیں رشتہ کروادو' بہت امیر گھرانہ ہے' لڑکے کا اپنا کاروبار ہے کپڑے کا' اور بینک میں جاب بھی کرتا ہے۔''

''ارے نہیں' ابھی نادیہ کی عمر ہی کیا ہے اور ویسے بھی میں نے اپنی بیٹی کو ابھی پڑھانا ہے۔''

''رضیہ پاگلوں والی بات مت کر' اچھے رشتے بار بار نہیں آتے اور ویسے بھی تم اپنی بیٹی کو کتنا پڑھا لوگی' نویں جماعت والی وردی' جوتا اور بستہ تو وہ دسویں جماعت میں لے کر گئی ہے' کتابیں بھی تم پورے محلے سے مانگتی پھرتی ہو اور ویسے بھی اپنے جیسے غریبوں کے بچے کہانیوں میں ہی پڑھتے ہیں' حقیقی زندگی میں تو بس محنت مزدوری ہی ہوتی ہے' اگر میں نے اپنی روبینہ کا رشتہ پہلے ہی نہ کر دیا ہوتا تو میں خود اِن لوگوں کے ساتھ رشتہ کر لیتی' ویسے بھی انہوں نے تو مجھ سے روبینہ ہی مانگی تھی' لیکن میں نے کہا۔ بھئی آپ لوگوں نے بہت دیر کر دی' میں نے تو اپنی روبینہ کا رشتہ کر دیا ہے' اب

میں آپ لوگوں کا رشتہ اپنی روبینہ جیسی لڑکی کے ساتھ کروا دیتی ہوں' تو اس پر وہ لوگ مان گئے۔''

''اچھا میں سوچ کر بتاؤں گی۔'' امی نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''لو کرلو بات' اب اِس میں سوچنے والی کیا بات ہے' تم بس مجھے دن بتاؤ کہ کس دن وہ لوگ نادیہ کو دیکھنے آئیں؟''

''کنیز لڑکے کی عمر کتنی ہے؟'' امی نے سوال کیا تھا۔

''میرے دیور سکندر کی عمر کا ہے اور بہت ہی شریف لڑکا ہے۔''

''کنیز خدا کا خوف کرو' وہ سکندر کی عمر کا ہے اور اوپر سے تم' اُسے لڑکا کہہ رہی ہو' سکندر کی تو اپنی بیٹی بیاہنے کی عمر ہے' اور اُس کی عمر کے بندے کو میں اپنی نادیہ دے دوں' کل کو جو بھی جوڑی دیکھے گا تو کہے گا' باپ بیٹی جا رہے ہیں اور دوسرا کہیں وہ شادی کے بعد زیادہ ہی شریف نا نکل آئے' اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تو اِس کی دو ہی وجہ ہوں گی' یا تو عاشقی معشوقی کرتا رہا ہوگا اب تک' یا پھر شادی کے قابل ہی اب ہوا ہوگا۔''

''رضیہ کیسی پاگلوں والی بات کر رہی ہے' مرد اور عورت کی عمر کا شادی کے بعد کب پتا چلتا ہے' کل کو جب نادیہ دو بچے جنے گی تو اُس کے برابر ہی لگنے لگی گی۔''

''کنیز میرا دل تو نہیں مانتا' خیر پھر بھی نادیہ کے ابو کے ساتھ بات کرتی ہوں پھر کچھ بتاؤں گی تمہیں۔''

اب خالہ کنیز نے مجھے آواز دی اور بولیں۔

''ارے نادیہ جلدی سے اپنی خالہ کو چائے پلا دے پھر میں جاؤں۔''

کچھ ہی دیر میں' میں خالہ کے لیے چائے لے کر آئی تو وہ بولیں۔

''بیٹا اب تم ذرا اپنا ہاتھ گھرداری میں پکا کرلو' پرائے گھر جانا ہے۔'' پھر خالہ تو چائے پی کر چلی گئیں' اور امی بہت ہی پریشان تھیں۔

جب شام کو ابو گھر آئے تو امی نے کہا۔

''نادیہ کے ابو! آج آپا کنیز اپنی نادیہ کا رشتہ لے کر آئی تھیں' وہ لڑکے والوں کی کافی تعریف کر رہی تھیں۔'' امی کی اس بات پر ابو گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے' امی نے ابو کی سوچ کا تسلسل توڑتے ہوئے کہا تھا۔

''نادیہ کے ابو کیا ہوا' کیا سوچ رہے ہو آپ' کچھ تو بولو۔''

ابو نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

''وقت بھی کتنا ظالم ہے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا' آج میری نادیہ بیاہنے کے قابل ہو گئی ہے' اگر تم سچ پوچھو تو میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں' اچھا چلو صبح میں بھائی صاحب سے مشورہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔

دوسرے دن ابو نے تایا جی کو بلوایا تھا۔

''بھائی صاحب! نادیہ کا رشتہ آیا ہے اب آپ نے تو اپنے بچوں کے فرائض ادا کر لیے ہیں' آپ تو ان معاملات کو بہت اچھے طریقے سے سمجھتے ہیں' مجھے اور رضیہ کو تو کوئی سمجھ نہیں آ رہی کہ لڑکے والوں کے ساتھ کیسے بات کرنی ہے؟''

تایا جی جواباً بولے تھے۔

''چھوٹے! بات یہ ہے کہ بیٹی کا فرض یوں ہی ادا نہیں ہو جاتا' ابھی تو پتا نہیں کتنے ہی لوگ آئیں گے کھانا کھائیں گے اور انکار کر کے چلے جائیں گے' اپنا معاشرہ بہت ظالم ہے' لڑکی کو تو ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے مویشی منڈی میں گائے بھینس کو دیکھا جاتا ہے' رب کریم خیر کرے' میری

تو یہی دعا ہے کہ پہلی ہی بار میں اچھے لوگ ملیں اور بس رشتہ ہو جائے۔''

''بھائی صاحب پھر اتوار والے دن اُن کو بلالوں؟'' ابو نے تایا جی سے سوال کیا تھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''اچھا رضیہ پھر تم آپا کنیز سے کہہ دو کہ وہ لوگ اتوار کو آجائیں۔'' امی نے ابو کے بات کے جواب میں تایا جی سے سوال کیا تھا۔

''بھائی صاحب اُن کے لیے کس کس چیز کا اہتمام کرنا ضروری ہوگا؟''

''رضیہ زیادہ خرچہ کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں' آج کل تو لوگوں نے فیشن بنایا ہوا ہے کہ لڑکی کے گھر جاؤ کھاؤ پیو لڑکی کا مذاق بناؤ اور چلتے بنو' پہلی بار صرف اور صرف چائے پانی ہی کافی ہوتا ہے۔''

دوسرے دن امی نے خالہ کنیز کو پیغام بھیجوایا تھا کہ مجھ سے آکر ملو' جب وہ آئیں تو امی نے کہا۔

''بہن کنیز لڑکے والوں سے کہہ دو کہ اتوار کے دن آجائیں۔''

''وہ تو میں کہہ دوں گی لیکن اُن کے کھانے کا اچھا سا بندوبست کرنا۔''

''نادیہ کے تایا جی نے کہا ہے کہ زیادہ فضول خرچہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے' ویسے بھی آج کے دور میں تو لوگوں نے فیشن بنایا ہوا ہے رشتے کے بہانے مفت کی دعوت اڑانے کا' اور بہن ہماری اتنی گنجائش بھی کہاں ہے اب تم تو سبھی جانتی ہو۔'' امی نے بالکل سچ بات کہی تھی۔

''رضیہ امیر لوگوں میں یونہی رشتے نہیں ہو جاتے' اپنا آشیانہ پھونکنا پڑتا ہے۔''

''بھئی نہیں چاہئیں ہمیں ایسے امیر لوگ۔''

امی نے جھلا کر کہا تھا۔

''لو کر لو بات' خود بھی ساری زندگی غربت کی چکی میں پسی ہو اور اب بیٹی کو بھی پیسو گی۔ رضیہ ہوش کے ناخن لو اور ویسے بھی اگر رشتہ ہو جاتا ہے تو کل کو سسرال میں عزت کس کی ہوگی آخر اپنی ہی بچی کا سر اونچا ہوگا نا؟''

☆......☆......☆

تایا جی تائی اماں اتوار کے دن صبح صبح ہی ہمارے گھر آگئے تھے۔ خالہ کنیز نے کہا تھا کہ وہ لوگ صبح دس بجے آئیں گے اور میں بھی انہی کے ساتھ ہی آؤں گی۔

امی نے جلدی جلدی اچھا سا کھانا تیار کیا اور پھر معزز مہمانوں کا انتظار شروع ہو گیا' انہوں نے کہا تھا کہ وہ لوگ دس بجے آئیں گے' لیکن خالہ کنیز نے امی کو فون کر کے بتا دیا کہ ہم لوگ تو بارہ بجے آئیں گے اور پھر ساڑھے بارہ بجے کے قریب اُن کا دوبارہ فون آیا کہ تقریباً دو بج سکتے ہیں۔

امی ابو بہت پریشان اور مایوس ہو رہے تھے کہ تایا جی نے کہا۔

''رضیہ میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ زیادہ خرچہ مت کرنا اب اگر وہ لوگ آج نا آئے تو؟'' اس پر ابو بے ساختہ بولے تھے۔

''نہیں بھائی صاحب ایسی بات نہ کریں' میں نے بہت خرچہ کیا ہے۔''

''چھوٹے اسی لیے تو میں نے پہلے منع کیا تھا لیکن تم لوگوں نے تو میری ایک بھی نا مانی' اکثر لوگ کہہ کر نہیں بھی آتے۔''

''بھائی صاحب ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟''

''چھوٹے' محلے والے غلط باتیں کر کے اکثر لوگوں کو پریشان بھی کرتے ہیں' اس لیے ایسا ہوتا

ہے۔''
''بھائی صاحب ہمارے محلے میں تو ایسا کوئی بھی نہیں۔''
''اب اگر ایسا کوئی بھی نہیں ہے تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو۔''
میرے چھوٹے بہن بھائی جو صبح سے اس بات کی خوشی منا رہے تھے کہ باجی کا رشتہ آ رہا ہے' اب وہ بھی مایوس ہو چکے تھے' خیر امی نے ڈھائی بجے کے قریب خالہ کنیز کو دوبارہ کال کی اور پوچھا۔
''وہ لوگ کب تک آئیں گے؟ اب تو کھانا بھی ٹھنڈا ہو چکا ہے۔''
''شام پانچ بجے کا پکا وعدہ ہو چکا ہے' نا ایک منٹ کم اور نا ہی ایک منٹ زیادہ۔'' خالہ کنیز نے ہنس کر کہا تھا۔
''بہن کنیز اگر وہ لوگ نہیں آ رہے تو بھی بتا دو۔'' امی نے صاف بات کی تھی۔
''نہیں رضیہ' ایسی کوئی بات نہیں ہے' بلکہ میں تو خود اُن کو صبح سے دس کال کر چکی ہوں۔''
جب فون بند ہوا تو تایا جی کہنے لگے۔
''چھوٹے مجھے تو نہیں لگتا کہ آج وہ لوگ آئیں گے' اب ہمیں اجازت دو۔''
''بھائی صاحب چار بج چکے ہیں' پانچ بجے تک مزید اُن کا انتظار کرتے ہیں۔'' اس پر تائی اماں کہنے لگیں۔
''اچھا لو تمہاری خاطر یہ بھی کر لیتے ہیں۔''
تمام افرادِ خانہ صبح سے بھوکے بیٹھے تھے کہ مہمان آئیں گے تو اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے' پھر پونے پانچ کے قریب خالہ کنیز کی کال آئی دو منٹ میں ہم لوگ تمہارے گھر کے دروازے پر ہوں گے۔'' اور پھر ذرا دیر میں ہمارے دروازے کے آگے ایک کار آ کر رُکی تھی۔
ابو اور تایا جی نے مہمانوں کا استقبال کیا تھا' خالہ کنیز' روبینہ اور دو عورتیں اُن کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھیں' میں کمرے کی کھڑکی سے باہر کا سارا منظر دیکھ رہی تھی' یہ لوگ حقیقتاً کافی امیر نظر آ رہے تھے۔
علیک سلیک کے بعد خالہ کنیز نے کہا تھا۔
''روبینہ جاؤ اور نادیہ کو لے کر آؤ۔'' روبینہ میرے پاس کمرے میں آ کے بولی تھی۔
''یار بس دعا کرو کہ تمہارا یہاں رشتہ طے ہو جائے' یقین کرو بہت اچھے لوگ ہیں' تمہاری تو قسمت ہی کھل جائے گی۔''
''روبینہ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے جواباً اُس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔
''یار کچھ بھی نہیں ہوگا اور ویسے بھی اس میں ڈرنے والی کون سی بات ہے؟''
ابھی میں اور روبینہ بات کر ہی رہے تھے کہ اسی دوران امی نے آ کے کہا تھا۔
''نادیہ چائے لاؤ۔''
میں چائے لے کر گئی اور سب کو سلام کیا تھا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ماتھے پر پسینہ بھی تھا۔
جب میں نے چائے ٹیبل پر رکھی تھی تو خالہ کنیز نے مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔
''یہ ہے میری نادیہ بیٹی۔''
''ماشاء اللہ بہت خوبصورت بیٹی ہے۔'' مہمان خاتون نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
''جی اب تو آپ ہی کی بیٹی ہے۔'' خالہ کنیز نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
''کیوں نہیں' کیوں نہیں۔'' مہمان خاتون

نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''اچھا نادیہ اور روبینہ اب تم دونوں کمرے میں جاؤ۔'' خالہ کنیز نے ہمیں جانے کے لیے کہا تھا۔

''رضیہ باجی! میں ہوں فیاض کی بڑی بہن شگفتہ' اور یہ ہے میری کزن سلمٰی' کنیز باجی آپ کی نادیہ کی بہت تعریف کرتیں تھیں تو ہم نے سوچا کیوں نا ایک بار دیکھ ہی لیا جائے' لیکن ہائے افسوس کہ کنیز باجی نے نادیہ کے بارے میں جو کہا بہت ہی کم کہا۔''

''بس بہن یہ سب تو آپ لوگوں کی محبت ہے' ورنہ ہم لوگ کہاں اس قابل۔'' امی بہت لجاجت سے بولی تھیں۔

''پلیز آپ ایسی بات نا کریں آج کے دور میں آپ جیسے اچھے لوگوں کا مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں۔'' شگفتہ باجی نے امی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''نادیہ بیٹا کھانا لگادو۔'' امی نے مجھے پکار کر کہا تھا۔

''رضیہ باجی' ابھی کھانا نہ لگائیں پہلے ہم کچھ ضروری باتیں کرلیں۔'' شگفتہ باجی نے بہت رسان سے کہا تھا۔

''میرے والدین وفات پا چکے ہیں' میں تین بھائیوں کی ایک ہی بہن ہوں' میرا ایک چھوٹا بھائی ریاض' سعودیہ میں مقیم ہے' مجھ سے ایک بڑا بھائی ہے' وہ لندن میں اپنی فیملی کے ساتھ سیٹل ہے۔ میری شادی لاہور میں ہوئی ہے۔ فیاض جس کے رشتے کے لیے میں آئی ہوں وہ بھی مجھ سے چھوٹا ہے اُس کا اپنا کپڑے کا کاروبار ہے' ساتھ ہی بینک میں جاب بھی کرتا ہے۔ ہماری کوئی بھی شرط نہیں ہے' بس آپ سے اتنا کہنا چاہوں گی کہ شادی ہم لوگ سادگی سے کریں گے' ممکن ہے شادی میں لندن والے بھائی صاحب نا ہوں' جہیز کا ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے' بس آپ نے جو تھوڑا بہت تیار کیا ہوا ہے ہم اسی میں راضی ہیں' آپ کی نادیہ میں ہمیں وہ چیز نظر آئی ہے جو آج کی لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی' بس آپ ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھیں اور جلدی سے یہ بتادیں کہ آپ ہمارے گھر کب آئیں گی؟''

''جی میں نادیہ کے ابو کے ساتھ مشورہ کر کے کنیز آپا کو بتادوں گی۔'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''جی بہتر' اب آپ کھانا لگوادیں' کیونکہ مجھے آپ کی نادیہ پسند آگئی ہے۔'' شگفتہ باجی نے امی کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

ان لوگوں نے کھانا کھایا اور پھر چلے گئے ان کے جانے کے بعد تایا ابو تو اُن کی تعریف کرنے لگے اور کہنے لگے۔

''بھئی بہت اچھے لوگ ہیں' میں نے اپنی زندگی میں ایسے لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے جو کہیں جب تک رشتہ نہ ہوجائے ہم لوگوں نے لڑکی والوں کے گھر سے کچھ بھی نہیں کھانا۔''

''اچھا بھائی صاحب مجھے تو لگتا ہے کہ یہ رشتہ ہوجانا چاہیے' آپ کا کیا خیال ہے؟''

''چھوٹے یہ رشتہ سو فیصد ہوجانا چاہیے۔''

یہ رشتہ ہوجانے پر امی ابو بہت ہی خوش تھے' اور تایا جی بہت حیران تھے کہ اتنے اچھے لوگ' نا جہیز کا لالچ اور نا ہی مغروری' بس پھر میری شادی ہوگئی۔

شادی کا انتظام بہت اچھا تھا' لیکن میرے سسرال والوں نے بہت کم لوگوں کو بلوایا تھا' مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خواب چل رہا ہے لیکن

خواب تو بس ذرا دیر کا ہوتا ہے اور پھر حقیقت شروع ہوتی ہے' جو بہت تلخ اور دیر پا ہوتی ہے۔ امی ابو نے اپنی ساری جمع پونجی میری شادی پر لگا دی تھی۔ بس یہ سوچ کر کے اب ہماری بیٹی ایک بڑے گھر جا رہی ہے' کہیں اس کو کسی بات پر شرمندگی نہ ہو۔

☆......☆......☆

شادی سے پہلے' ازدواجی زندگی کے جو سنہری خواب ہوتے ہیں' وہ تو میری شب عروسی میں ہی ٹوٹ گئے تھے' شب عروسی میں میرے مجازی خدا فیاض صاحب کمرے میں داخل ہوئے تھے اور کرسی کو بیڈ کے قریب کر کے اس پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگا کر بولے تھے۔

''او کیا نام ہے تمہارا' ہاں نادیہ او سوری ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نا تو مجھے لمبی چوڑی بات کرنی آتی ہے اور نا ہی مجھے اس کا شوق ہے' اور نا ہی مجھے پسند ہے' میں تمہیں ایک دو باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ تم میری زندگی میں نئی آئی ہو تو تم مجھے جتنی جلدی سمجھ لو گی اتنا ہی اچھا ہو گا۔''

میں فیاض صاحب کے اس ناگوار رویے پر بہت حیرت زدہ تھی کہ اس بندے کے دل میں جذبات نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے اور ویسے بھی مجھے سہاگ رات کے حوالے سے جو کچھ روبینہ نے بتایا تھا ایسا تو کچھ بھی نہیں چل رہا تھا۔

اس دوران میں فیاض صاحب نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس وقت اس کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں یعنی کہ میں تم سے ہی بات کر رہا ہوں اگر تم یہ فلمی سین بند کر کے میری بات کان کھول کر سن لو گی تو تمہارے لیے اچھا ہو گا' گھونگھٹ اٹھاؤ اور کان کھولو۔''

میں نے کہا۔

''گھونگھٹ تو آپ نے اٹھانا ہے یہ رسم ہوتی ہے۔'' اس پر فیاض صاحب نے کہا۔

''یقین کرو میں بالکل بھی نہیں چاہتا کہ آج کی رات اپنی لڑائی ہو' لہٰذا میرے ساتھ بحث مت کرو' جتنا کہا ہے اتنا کرو۔''

میں نے خود ہی اپنا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''جی میں آپ کی بات سن رہی ہوں۔''

''بہتر یہی ہو گا کہ سمجھ بھی لو' تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کے بعد میں تمہیں کسی غیر مرد کے ساتھ بے تکلف ہوتا بالکل بھی نہ دیکھوں' ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہو گا' مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا کہ تم میرے کسی کزن کے ساتھ بات کرو اور دوسرا یہ کہ ایک کام مجھے تمہیں دوبارہ نا کہنا پڑے اور آخری بات میرے معاملات میں کبھی بھی دخل اندازی مت کرنا' تمہیں اس گھر میں ہر وہ چیز ملے گی جس کا تم حق رکھتی ہو' اچھا کوئی سوال؟''

جواب میں میں خاموش رہی تھی تو پھر فیاض صاحب نے الماری کھولی تھی اور اس میں سے ایک باکس نکالا تھا اور مجھے تھماتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ لو تمہارا منہ دکھائی کا تحفہ' پورے پانچ لاکھ کا سیٹ ہے' اچھا اب میں چینج کر کے آتا ہوں۔''

فیاض صاحب کی باتوں سے مجھے واضح طور پر پتا چل گیا تھا کہ اُن کی زندگی میں' میں محض ایک خادمہ ہوں کیونکہ خادمہ کو نا تو بار بار کام کہا جاتا ہے اور نا ہی اس کو ہماری زندگی میں یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے پیش کرے' اور نا ہی اس کو ہمارے معاملات میں دخل اندازی کی اجازت ہوتی ہے' مجھ پر تو خادمہ والی شرائط لاگو ہوئی تھیں'

آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ میری نئی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

ولیمے والے دن کچھ عورتوں کو تو پہلے سے ہی پتا تھا کہ مجھے منہ دکھائی میں پانچ لاکھ کا سیٹ ملا ہے' اور کچھ نے مجھ سے خود ہی پوچھ لیا تھا کہ منہ دکھائی میں کیا ملا ہے' اور کچھ عورتوں سے میں نے یہ بھی سنا کہ بھلا یہ منہ ہے جس پر فیاض نے پانچ لاکھ کا سیٹ دیا۔

لیکن اکثریت اُن عورتوں کی تھی جو کہہ رہی تھیں' نادیہ بہت خوش قسمت ہے جسے فیاض جیسا پیار کرنے والا شوہر ملا ہے' اِس کی تو قسمت ہی کھل گئی' ایسی باتوں سے میرے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آجاتی تھی۔

شادی کے ایک ہفتے بعد جب شگفتہ باجی اپنے گھر جانے لگیں تو وہ مجھ سے بولیں۔

''نادیہ مجھے پتا ہے کہ میرا بھائی بہت غصے والا ہے لیکن تم اگر صبر سے کام لوگی تو تمہارا گھر بنا رہے گا جو بھی مسئلہ ہو اپنے ماں باپ کو بتانے سے پہلے ایک بار مجھے ضرور بتا دینا۔''

''جی باجی! آپ فیاض کی ہی نہیں' میری بھی بڑی بہن ہیں' آپ کو نہیں بتانا تو اور کس کو بتانا ہے۔''

''یہ ہوئی نا دانائی کی بات۔'' انہوں نے مجھے گلے لگا کر کہا تھا۔

شگفتہ باجی کے جانے کے بعد اب گھر میں' میں اور فیاض صاحب ہی تھے' مجھے محلے میں کسی کے گھر جانے کی اجازت تھی اور نا ہی کسی کو میرے پاس آنے کی اجازت تھی۔ ایسا تو ہوسکتا تھا کہ ہمارے محلے کے کچھ لوگ برے ہوں' لیکن سارے کا سارا محلّہ تو برا نہیں ہوسکتا تھا۔

صبح اٹھنا فیاض صاحب کو ناشتہ کرا کے دفتر روانہ کر دینا اور پھر سو جانا' اُن کے آنے سے پہلے کھانا تیار رکھنا' صرف ہفتے کے روز اُن کے ساتھ امی کے ہاں جانا دو گھنٹے بیٹھ کر اُن کے ساتھ ہی واپسی اور اگر کبھی امی زیادہ ہی مجبور کرتیں کہ آج رات ہمارے پاس رہ جاؤ تو میرا صاف صاف کہہ دینا۔

''نہیں نہیں امی پھر فیاض کے دفتر جانے میں مشکل ہوتی ہے۔''

خالہ کنیز کی بیٹی اکثر مجھے شرمندہ بھی کر دیتی۔

''نادیہ یار! اب اتنی بھی کیا شوہر پرستی کبھی کبھار تو میکے میں بھی رات رہ لیا کرو۔'' اُس کی اِس بات پر میرے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آجاتی تھی میں اس ساری صورت حال سے اب بہت تنگ آچکی تھی' بس کوئی دن جا رہا تھا کہ فیاض صاحب کے ساتھ میری لڑائی ہونے والی تھی۔

ایک دن روبینہ مجھ سے ملنے آئی ہوئی تھی اوپر سے فیاض صاحب بھی گھر آگئے تھے اور روبینہ کو دیکھ کر بولے تھے۔

''بہن آج آپ کیسے میرے غریب خانے کا راستہ بھول گئیں؟''

''نہیں بھائی جان ایسی کوئی بات نہیں' دراصل بس گھر کے کاموں سے فرصت ملے تو بندہ کہیں جائے' اچھا بھائی جان کبھی آپ بھی آئیں نا ہمارے گھر۔''

''میں نے کہیں خاک جانا ہے' کبھی نادیہ کو کہو کہیں جانے کے لیے تو کہتی ہے فیاض آج نہیں کل چلیں گے اب بھئی اپنی بیگم کے بغیر تو میں بھی کہیں نہیں جاسکتا۔''

فیاض صاحب نے زوردار قہقہہ لگاتے

ہوئے کہا تھا' پھر بولے تھے۔

''روبینہ بہن شادی کے بعد پہلی بار اپنے گھر آئی ہیں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دینا۔'' اور پھر وہ اپنے روم میں چلے گئے تھے۔

کچھ دیر بعد فیاض صاحب نے مجھے آواز دی تھی اور جب میں کمرے میں گئی تھی تو انہوں نے میرے ساتھ تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''یہ کب سے آئی ہوئی ہے؟''

''بس آپ کے آنے سے بیس منٹ پہلے ہی آئی ہے۔''

''اچھا اس کو بولو اب چلی جائے۔''

''فیاض صاحب! گھر آئے مہمان کو میں کیسے کہہ دوں کہ اب وہ چلی جائے اور ویسے بھی آپ نے خود ہی تو اُسے کھانے کے لیے روکا ہے' چلیں ٹھیک ہے میں کھانا کھلا کر اُسے فارغ کرتی ہوں۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ تم اسے کھانا کھلا کر فارغ کرو' کیا تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی؟''

''جی آ گئی۔'' خیر میں کمرے سے باہر آئی میرے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی میں نے روبینہ سے پوچھا۔

''یار تیری شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں؟''

میرے اِس سوال پر روبینہ کو بہت حیرت ہوئی' لیکن اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''دو سال......''

''دیکھو میری شادی کو تو ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے' یار اگر آج فیاض صاحب گھر جلدی آ ہی گئے ہیں تو اب تم میرے حال پر رحم کیوں نہیں کرتیں۔' یار پلیز ابھی چلی جاؤ تمہاری دعوت اُدھار رہ گئی۔''

میری اس بات پر روبینہ نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر جاتے جاتے کہنے لگی۔

''یار تمہیں ایک مشورہ دوں۔''

''نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اور پھر میں روبینہ کو رخصت کر کے جب کمرے میں داخل ہوئی تھی تو فیاض صاحب نے کہا تھا۔

''آج کے بعد کوئی میرے گھر میں نا آئے۔''

''جی بہتر......''

اب میں ان حالات سے بہت تنگ آ گئی تھی' بس پھر کیا تھا میں نے باجی شگفتہ کو کال کی تھی اور اپنے تمام مسائل انہیں بتا دیے تھے۔

''باجی! فیاض صاحب نا تو مجھے محلے میں کہیں جانے' اور نا ہی میرے رشتے داروں کو میرے پاس آنے دیتے ہیں۔' سنا تھا شادی کے بعد ہنی مون ہوتا ہے یقین کریں اس چیز سے تو میں ابھی تک واقف نہیں ہوئی' آپ فیاض کو تھوڑا بہت سمجھائیں۔''

''ٹھیک ہے میں فیاض کے ساتھ آج بات کرتی ہوں تم پریشان نہ ہونا۔''

اب میں دل ہی دل میں خوش تھی کہ آج فیاض صاحب کی بھی شامت آئے گی' مجھ پر کتنا رعب جماتے ہیں' آج باجی اُن کی خبر لیں گی' بس پھر کیا تھا میری نظر گھڑی پر تھی اور فیاض کے آنے کا انتظار شروع تھا کہ فیاض صاحب اپنے مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی آ گئے اور آتے ہی مجھے کہنے لگے۔

''جلدی سے ایک گلاس پانی لے کر بیڈ روم میں آؤ۔''

جب میں نے فیاض صاحب کو پانی کا گلاس دیا تو انہوں نے ایک ہی سانس میں سارا پانی پیا

اور بولے۔

''کرسی پر بیٹھو۔''

اب میں تھوڑا سا ڈر گئی تھی' خیر کرسی پر بیٹھ گئی' فیاض نے اپنی پینٹ کی بیلٹ اُتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور مجھ سے پوچھا۔

''شادی کی پہلی رات میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟''

''جی......!''

''جی کی بچی' میں نے شادی کی پہلی رات تمہیں کیا کیا سمجھایا تھا اس کا جواب دو؟''

میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''فیاض صاحب آپ کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟''

''میں نے تم سے کہا تھا نا' میرے معاملات میں کبھی دخل اندازی مت کرنا۔''

''جی کہا تھا۔'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''پھر تم نے باجی کو فون کر کے کہا ہے کہ میں تم پر ظلم کرتا ہوں' جب تمہیں گھر میں ہر چیز ملتی ہے پھر تم نے باہر کیا کرنے جانا ہے؟ میں تم جیسی لڑکیوں کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا ہوں' خاوند کے پیسے سے یاروں کو عیش کرواتی ہیں' آوارہ گردی کا تمہارا شوق میں آج پورا کرتا ہوں۔''

فیاض صاحب نے مجھے اتنا مارا تھا کہ کمر پر بیلٹ اور منہ پر تھپڑوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ میں تو وہ لڑکی تھی جسے ماں باپ نے کبھی ڈانٹا بھی نہیں تھا' اور مجھ پر اتنا ظلم کیا گیا تھا' جیسے میں کوئی عادی مجرم ہوں' اتنی سخت سزا دی گئی تھی مجھے.....

جب فیاض صاحب مجھے مار مار کر تھک گئے تھے تو بولے تھے۔

''اب کرواپنے ماں باپ کو فون اور کہو کہ تمہیں آ کر لے جائیں۔''

یہ بات سن کر میں نے فوراً فیاض صاحب کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور اُن سے معافی مانگنی شروع کر دی تھی۔

''پلیز فیاض صاحب مجھ پر اتنا ظلم مت کریں۔'' پھر فیاض صاحب نے خود ہی ابو کا نمبر ملا دیا تھا ابھی بیل جا ہی رہی تھی کہ میں نے اُن کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا تھا اور کال کاٹ دی تھی۔ فیاض صاحب نے دوبارہ اپنی بیلٹ اٹھائی تھی اور میرا وہ حشر کیا تھا کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بیڈ پر پڑی تھی' اور فیاض صاحب میرے زخموں کی پٹی کر رہے تھے۔ اِس سے پہلے کے میری آنکھوں میں آنسو آتے وہ بولے تھے۔

''پہلے ہی بہت مشکل سے میرا موڈ ٹھیک ہوا ہے اب رو کر دوبارہ خراب مت کرنا پلیز اور ہاں آج رات کا کھانا میں باہر ہی کھالوں گا تمہارے لیے گرم دودھ پڑا ہے سائیڈ ٹیبل پر' وہ پی لینا اور ہاں صبح ناشتہ ضرور تیار کرنا اب تم آرام کر لو باقی بات صبح ہو گی۔''

یہ کہہ کر وہ تو باہر چلے گئے تھے اور مجھ پر زندگی کی وہ حقیقت کھلی تھی جس کا نام زندگی ہی ہے۔ میں بار بار سوچ رہی تھی کیا میں واقعی ایک بدچلن عورت ہوں' یا پھر فیاض صاحب نے غلط کیا ہے' کیا وہ میرے کردار پر شک کرتے ہیں' اور اگر کرتے ہیں تو کس بنا پر کرتے ہیں؟ خیر دوسرے دن مجھے ناشتہ بنانے میں بہت مشکل ہوئی' لیکن مجھے پتا تھا اگر میں نے ناشتہ نہیں بنایا تو فیاض صاحب میرا ناشتہ کریں گے۔

اپنے زخمی ہاتھوں سے ناشتہ بنایا اور بیڈروم

میں لے گئی' فیاض صاحب نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کل جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا مجھے اس کا بہت دکھ ہے' لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنے اصولوں پر سمجھوتہ بالکل بھی نہیں کرسکتا' بڑی سمپل سی بات ہے کہ مجھے تمہارا باہر جانا اچھا نہیں لگتا' شادی کے بعد عورت خاوند کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیے تو اس کو پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ خلعہ لے لے' تمہارے ساتھ جو کل ہوا مجھے اُس کا بہت دکھ تو ہے لیکن افسوس نہیں ہے' میری زندگی کے فقط تین ہی اصول ہیں اور اگر میں خود ہی اُن پر پورا نہ اتر سکوں تو مجھے مرد کون کہے گا' یہ اتنی لمبی چوڑی بات میں نے تمہارے ساتھ کی ہے اور میرا نہیں خیال کہ ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی اس کمرے میں موجود ہے' اگر تم ساتھ میں ہاں یا جی لگالوگی تو اچھا ہوگا۔''

فیاض صاحب کی اِس بات پر میں اور ڈر گئی تھی۔

''یا رب کیا اب دوبارہ میری شامت آئے گی؟''

''میں اس وقت یہی سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے منہ پر زخم ہیں' اس وجہ سے تم نہیں بول پائی ہو' لیکن آئندہ ایسا نا ہو۔''

''جی بالکل بھی نہیں ہوگا۔'' میں نے بے ساختہ کہا تھا۔ پھر فیاض نے میرے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی سوال؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''فیاض صاحب آپ نے میرے ساتھ شادی کیوں کی ہے' اگر میں بری عورت ہوں۔''

فیاض صاحب نے ٹھنڈی سانس لی ایک لمحے کے لیے اپنی گردن بھی جھکائی اور پھر مجھے تھپڑ مارا اور کہا۔

''میں نے سوال کرنے کو کہا ہے بکواس کرنے کو نہیں کہا۔'' اور پھر فیاض صاحب دفتر کے لیے نکل گئے۔ اور میں آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے چہرے کے زخموں کا جائزہ لیتی رہی اور اس دوران میری آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی' اور میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کیا ماں باپ بیٹیوں کو اس دن کے لیے پیدا کرتے ہیں' یا پھر یہی بیٹیوں کی تقدیر ہوتی ہے؟

دوسرے دن مجھے فیاض صاحب نے بتایا۔

''نادیہ کل تمہاری امی کی کال آئی تھی کہہ رہی تھیں کہ تمہارے ابو کی طبیعت کافی خراب ہے' آج شام کو میں جلدی آجاؤں گا پھر تمہارے ابو کی خیریت پوچھنے چلیں گے۔''

''فیاض صاحب آپ امی کو کال کرکے کہہ دیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں کیا اپنے ابو کا پتا لینے نہیں جانا تم نے؟''

''ایسی بات نہیں' دراصل میرے چہرے کے زخم دیکھ کر امی پریشان ہوجائیں گی۔''

میرے جواب پر فیاض صاحب کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی اور وہ بولے تھے۔

''ویری اسمارٹ۔''

خدا اور مجازی خدا کا اب مجھے صاف صاف فرق پتا چل گیا تھا' خدا وہ ہوتا ہے جو خوشیاں دیتا ہے اور مجازی خدا وہ ہوتا ہے جو اِن خوشیوں کو خراب کرتا ہے۔

☆......☆......☆

یہ امید بہت ظالم چیز ہے' نا جینے دیتی ہے نا

ہی مرنے دیتی ہے' بس زندگی سُلگائے رکھتی ہے۔ میری زندگی میں بھی بس اب ایسی ہی ایک امید جاگ اٹھی تھی' جس سے مجھے لگا تھا کہ اب بہتر دن آئیں گے۔ اب میری شادی کو تقریباً چار ماہ ہو چکے تھے ایک دن فیاض صاحب کے گھر آنے سے پہلے میں نے تھوڑا میک اپ کرلیا' سوچا آج فیاض صاحب شاید میرے ساتھ اچھے موڈ میں پیش آئیں گے جب میں انہیں یہ خوشی کی خبر دوں گی کہ فیاض صاحب میں امید سے ہوں سو میں تیار ہو کر اُن کا انتظار کر رہی تھی' جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئے تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔

''اوہ...... سوری لگتا ہے میں غلط ٹائم پر آ گیا ہوں' ویسے کس کا انتظار ہو رہا تھا؟''

میں فوراً اٹھی اور منہ واش کر آئی' میں نے کپڑے بھی بدل لیے کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو فیاض صاحب نے کہا۔

''کیا تمہارے سنگھار پر میرا کوئی حق نہیں' جو تم فوراً کپڑے بدل آئی ہو۔''

اب مجھے پتا تھا کہ میرا جواب جو بھی ہو مار تو مجھے ضرور پڑنی ہے' لیکن میں نے فیاض صاحب کو اتنا ضرور کہا تھا۔

''فیاض صاحب پلیز مجھے آج مارنا مت' میں امید سے ہوں اور اسی خوش خبری کے لیے تیار ہوئی تھی' پر پتا نہیں کیوں میں بار بار بھول جاتی ہوں کہ میں بیوی نہیں خادمہ ہوں۔''

''اگر خادمہ ہوتیں تو آج امید سے نا ہوتیں۔'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

خیر پھر کچھ ہی لمحوں بعد میں نے فیاض صاحب سے پوچھا تھا۔

''آپ نے کیا بچے کے لیے کوئی نام سوچا ہے؟''

''ان فضولیات کے لیے تم ہو نا۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

''فیاض صاحب کیا آپ کو باپ بننے کی خوشی نہیں ہے؟'' میرے سوال کے جواب میں فیاض صاحب بہت تلخ لہجے میں بولے تھے۔

''دیکھو نادیہ تم امید سے ہو اور میں اس دوران کوئی لڑائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا' اب پلیز تم مجھے مجبور مت کرو کہ میں کوئی قدم اٹھاؤں' مجھے پسند نہیں ہے کہ کوئی مجھ سے بار بار سوال کرے۔'' میرے لیے ایک امید کی کرن تھی وہ بھی ڈوب گئی۔

لوگ میرے سامنے فیاض صاحب کی تعریف کرتے نہیں تھکتے کہ لوگوں سے یہ کتنے اچھے طریقے سے ملتے ہیں سو اُن سے اچھا اور پیار کرنے والا خاوند تو شاید پوری دنیا میں نہیں ہوگا۔

☆......☆......☆

ایک وہ زندگی تھی جو اب خواب لگتی ہے اور ایک یہ زندگی ہے' جو عذاب لگتی ہے' ماں باپ نے سوچا تھا کہ امیر لوگ ہیں بیٹی سکھی رہے گی' جو لوگ شادی میں آئے انہوں نے کہا تھا کہ نا ساس ہے اور نا نند' سنگل فیملی ہے لڑکی تو اپنی ہی موج میں رہے گی' خالہ کنیز کو کہتے سنا۔

''دیکھا رضیہ! تمہاری بیٹی کو کتنے سکھ ملے ہیں' جبھی تو وہ ماں باپ کا گھر تک بھول گئی بھئی عیش کی زندگی کس کو پسند نہیں۔'' سہیلیوں کو کہتے سنا۔

''نادیہ تم بہت مغرور ہو گئی ہو...... اور کچھ لوگوں کو تو یہ بھی کہتے سنا۔

''نادیہ اکثر باتوں کا جواب بھی نہیں دیتی' بس ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہوتی ہے۔

☆☆......☆☆

نیا سلسلے وار ناول

ایک بہت ہی خاص، منفرد موضوع پر دلچسپ تحریر

ریشم کے دھاگے

غیاث الدین غیاث کا خیال

تقاضہ وقت کا ہے یہ کہ لکھو
لکھیں گے ہم کہ ہم راقم ہوئے ہیں

روشانے سبعین مہاردی

شمال مغربی اُفق پر چھدرے چھدرے بادل تھے۔ سرخ اینٹوں والے اِس بنگلے پر کچی پکی دھوپ کی ترچھی کرنیں بھی نیالی سی تھیں۔ نتھری نتھری صبح گویا اپنی خوبصورتی کہیں اُدھار رکھ آئی تھی۔ گلاس وال پر سنہری کرنوں کا جال سا بن گیا تھا۔ چھنک چھنک کر آتی روشنی نے کمرے کا نیم تاریک خواب ناک سا ماحول یوں سبوتاژ کیا کہ بنا کسی الارم کے وہ لمحوں میں جاگ گئیں۔ اُن کا پہلو خالی تھا، گویا وہ مارننگ واک کے لیے نکل گئے تھے۔

''خدایا! کیسی جان لیوا خاموشی ہے، جو در و دیوار سے لپٹ سی گئی ہے۔'' انہوں نے کمرے کے چاروں اطراف طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔ پچھلے کئی دن سے یہ گھر اُداسی کی بکل مارے ہوئے تھا۔

''کیا کوئی انہونی ہونے والی ہے؟''

''اُف! یہ صبح صبح کیسی فضولیات چل رہی ہیں میرے دماغ میں؟'' انہوں نے دماغ کو منتشر خیالات کی آماجگاہ بننے سے روکنے کے لیے خود کو جیسے لتاڑا۔ کنپٹیاں سہلاتے ہوئے گہرے سرخ ملائم کمبل کو انہوں نے ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں کستے ہوئے واش روم جانے کا قصد کیا۔ نرم دبیز ایرانی قالین پر جھک کر سلیپر پہنتے ہوئے اُن کا سر لحہ بھر کو چکرایا، لیکن خود پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے لمحوں میں خود کو کمپوز کیا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ شدید ڈپریشن اور Anxiety کا شکار تھیں۔ فریش ہونے کے بعد وہ ٹاول سے چہرہ رگڑتے ہوئے باہر آئیں تو پریشے ٹرالی دھکیلتی اندر آ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر بشاشت سے مسکائی۔

''صبح بخیر اماں......'' اُس کے سرخ و سپید چہرے پر محبت کی تازگی تھی۔ اماں اور بابا کی طرح وہ بھی سحر خیزی کی عادی تھی۔ جبکہ تیمور خان آفریدی دیر تلک سونے کا عادی تھا۔ اماں کا لاڈلا اور بگڑا ہوا۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' وہ چائے کا کپ اُن کی طرف بڑھاتی پوری توجہ اور محبت سے بولی۔ وہ ہمیشہ سے بیڈ ٹی لینے کی عادی تھیں' اور پریشے صبح کی چائے اُن کے لیے خود ہی بناتی۔

''میں ٹھیک ہوں بچہ...... قدرے بہتر ہوں۔'' زرین گل اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بے ساختگی میں ایک ٹک اُسے دیکھنے لگیں۔

وہ کتنی سمجھدار' حساس اور فرمانبردار تھی۔ اُن کے دل کی ٹھنڈک اور بابا کی آنکھوں کا نور تھی' اُن کی پہلوٹی کی اولاد' پریشے خان آفریدی...... ماں کے یوں بغور تکنے پر وہ بلش ہوگئی۔ انار سے گالوں پر شفق کی لالی دوڑ گئی۔ کچی نیند سے جاگنے کے باعث کنچوں سی نیلی آنکھوں کے پپوٹے گلابی ہو رہے تھے۔

''کیا ہوا اماں...... کن سوچوں میں مستغرق ہیں آپ؟'' سنہری بارڈر والے قیمتی نازک کپ کی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے اُس سے استفسار کیا۔

''نہیں...... بس یونہی سوچ رہی تھی' کہ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں اور جب میری بیٹی بھی اپنے گھر چلی جائے گی تو صبح صبح مجھے خانم (میڈ) کے ہاتھ کی بدمزہ اور پھیکی چائے پینی پڑے گی۔'' خوشبودار گرم چائے کا سپ لیتے ہوئے اُن کا لہجہ قدرے مغموم تھا۔ جانے کیوں اِن دنوں وہ اتنی حساس ہو رہی تھیں۔

''او' میری پیاری ماں...... میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی' میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔'' وہ بے ساختہ کھلکھلاتے ہوئے اُن کے شانے سے سر ٹکا گئی۔

''نہیں بچہ...... دنیا کی یہی ریت ہے۔ بیٹیوں کو ایک دن بابل کا آنگن چھوڑ کر جانا ہی پڑتا ہے۔ میری پری بھی ایک دن ضرور دلہن بنے گی۔ دنیا کی سب سے خوبصورت دلہن۔'' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وارفتگی سے اُس کا ماتھا چوما۔ اُن کے لاڈ صرف تیمور کے لیے نہیں تھے وہ بھی اُن کی دُلاری تھی۔

''اوہو...... میں تو نہیں شادی کرنے والی۔'' پری نے اپنی مرمریں بانہوں کا گھیرا اُن کے گرد تنگ کیا اور چہرہ اُن کے مشفق سینے میں چھپا لیا۔ وہ اُس کے ریشمی بال سہلانے لگیں۔

''تیری چھٹیاں تو ختم ہونے والی ہیں؟ کب سے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرنی ہے؟'' انہوں نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

وہ اسلام آباد میں پہاڑوں کے دامن میں گھری قائداعظم یونیورسٹی میں انتھروپالوجی میں ماسٹرز کی طالبہ تھی۔ سیکنڈ سمسٹر کے بعد وہ اپنے آبائی گھر سیدو شریف (مینگورہ کا نواحی علاقہ) میں چھٹیاں گزارنے آئی تھی۔

''صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے میری چھٹی ختم ہونے میں' یہ وقت اتنی تیزی سے کیوں گزر جاتا ہے۔'' اُس نے منہ بسورا تو زرین گل کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''پھر سے وہی روٹین' اسٹڈیز اور بھاگم بھاگ...... اُف خدایا...... زندگی اتنی تیز رفتار کیوں ہے؟'' وہ اکتائی ہوئی تھی۔

''اوہو...... اصل کہانی کچھ اور ہے؟'' زرین گل نے جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کی' تو پریشے نے ناراضگی سے انہیں دیکھا۔

''آپ لاعلم نہیں ہیں اماں......'' اُس نے بھی دو بدو جتایا...... زرین گل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ کچھ دیر پہلے کی ساری کلفت جانے کہاں جا سوئی تھی۔ بیٹی کے ساتھ یہ ذو معنی مکالمہ انہیں لطف دے گیا۔

''جب سے بابا ریٹائرڈ ہوئے ہیں پچھلے چھ ماہ سے آپ دونوں نے یہیں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ گھر کو اکیلے مینج کرنا کس قدر مشکل ہے میرے لیے' کچھ اندازہ ہے آپ کو......؟ اور وہ آپ کا لاڈلا تیمور کتنا تنگ کرتا ہے مجھے' اُسے صبح صبح یونیورسٹی جانے کے لیے جگانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔'' وہ سراپا احتجاج تھی۔

''بچہ وہاں تمہاری مدد کے لیے کئی ملازم موجود ہیں' اور پھر میرا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے۔ صرف کچھ مہینوں کی دوری ہے۔ بابا کوشش کر رہے ہیں کہ سوات یونیورسٹی میں تمہاری مائیگریشن ہو جائے۔ تیمور کا فائنل سمسٹر ہے۔ تمہارے بابا اُس کے اچھے رزلٹ کے منتظر ہیں' پھر وہ انگلینڈ چلا جائے گا اور تم یہاں ہمارے ساتھ رہو گی۔'' انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے مفصل جواب دیا۔

آدم خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد پچھلے چھ ماہ سے وہ اسلام آباد اور مینگورہ کے درمیان گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔

اگرچہ پچھلے چوبیس سال سے وہ اسلام آباد میں سکونت پذیر تھے لیکن اُن کا پورا خاندان یہاں سوات میں سالوں سے آباد تھا۔ تیمور اور پریشے دونوں کی اسکولنگ بیکن ہاؤس اسلام آباد سے ہوئی تھی۔ لیکن پریشے سیدو شریف میں ہی پیدا ہوئی تھی' سو اپنے آبائی گھر سے اُسے حد درجہ اُنسیت تھی۔ کئی کنال پر پھیلے اِس گھر سے اُس کا بچپن جڑا ہوا تھا۔ جو قدیم فن تعمیر سے آراستہ تھا' لیکن اُس کی آرائش جدید پیمانوں پر کی گئی تھی۔

''یہاں کتنا سکون ہے ناں اماں...... آئی وش کہ مجھے واپس اسلام آباد نہ جانا پڑے' میں آپ کے اور بابا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ...... پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے...... آئی ریئلی ڈونٹ کیئر۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ وہ ضدی نہیں تھی لیکن اکلاپے سے اُسے نفرت تھی۔

زرین گل نے تفکر سے اُسے دیکھا۔

تیمور اپنی یونیورسٹی لائف اور فرینڈز کے ساتھ اتنا بزی رہتا تھا کہ اُس کی موجودگی کے باوجود پریشے بہت اکیلی پڑ گئی تھی۔

''تیمور کے سمسٹر ختم ہونے تک تمہیں وہاں رُکنا ہی ہوگا پری۔'' وہ پریشانی سے بولیں۔

''لیکن اماں اسلام آباد میں ہمارا اپنا گھر ہے' ہم ماہ و سال سے وہاں رہ رہے ہیں' پھر بابا نے یہاں سیدو شریف میں رہنے کا فیصلہ کیوں کیا؟'' کئی دنوں سے وہ جس اُلجھن کا شکار تھی بالآخر وہ زبان پر آ گئی تھی۔

اسلام آباد F/8 میں اُن کا فرنشڈ گھر تھا۔ لیکن پچھلے کچھ ماہ سے بابا اور اماں کے مبہم رویوں کے باعث وہ سخت کنفیوژن میں تھی۔ لیکن اُس کے ایگزامز اور پھر اماں کی ناسازی طبع کے باعث وہ مصلحتاً خاموش رہی۔ پر اب حالات اِس نہج پر تھے کہ اُس کے لیے خاموشی ناگزیر تھی۔

''کچھ سکیورٹی ریزنز کی وجہ سے تمہارے بابا نے یہاں قیام کرنے کا فیصلہ لیا ہے۔'' اُن کا لہجہ ناچاہتے

ہوئے بھی قدرے سخت ہوگیا۔
''کیوں...... کیا بابا کسی خطرے میں ہیں؟'' وہ بھونچکی رہ گئی' اُس کی ہراساں شکل دیکھ کر زرین گل کو اپنے لہجہ کی سختی پر افسوس ہوا۔ آدم خان کے لیے حالات کتنے سنگین تھے وہ اِس سے بے خبر تھی۔
''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اِس ایشو پر مزید کوئی بات نہ کریں۔'' زرین گل کے قطعی انداز نے اُسے مزید حواس باختہ کردیا۔
''پلیز اماں...... مجھ سے کچھ نہ چھپائیں...... میرے بابا کس پرابلم میں ہیں؟'' وہ لجاجت سے بولی۔
''پریشے! میری بیٹی' تمہارے بابا کو کچھ نہیں ہوگا ٹرسٹ می۔'' بیٹی کو یوں لمحوں میں نچڑتا دیکھ کر وہ مضبوط اور اٹل لہجے میں بولیں' وہ بہت بہادر اور باہمت خاتون تھیں۔
پریشے کی اُلجھنیں مزید بڑھ گئی تھیں۔ اماں سے کچھ اگلوانا ناممکن تھا' سو وہ خاموشی سے برتن سمیٹنے لگی۔
''تیمور سو رہا ہے؟'' انہوں نے اُس کا دھیان بٹانا چاہا لیکن وہ ہنوز گم صم تھی۔
''جی......!'' مختصر جواب آیا۔
تیمور شوخ چنچل' دوستوں میں گھرا رہنے والا' ہنگامہ پرور زندگی کا دلدادہ تھا' جبکہ پریشے اُس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ بے حد حساس' ذہین کتابوں کی رسیا اور نسبتاً سنجیدہ مزاج لڑکی تھی۔ جس کے لیے لوگوں سے جلدی گھلنا ملنا بے حد مشکل تھا۔ اُس کے دوست بھی بہت چنیدہ اور خاص ہوتے تھے۔ وہ بے حد مخلص' محبت کرنے والی اور خوبصورت شخصیت کی مالک تھی۔ وہ بابا سے بہت اٹیچڈ تھی' اگرچہ اُن کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ اپنی فیملی کو بہت کم وقت دے پاتے۔ وہ کہوٹہ میں تعینات تھے۔ اُن کی مصروفیات کا سلسلہ لامتناہی تھا۔ اور گھر آنے کا کوئی مخصوص وقت بھی مقرر نہ تھا' لیکن اِس کے باوجود پریشے بابا کی سب سے لاڈلی تھی۔
زرین گل بغور اُس کے چہرے کے تاثرات ملاحظہ کررہی تھیں۔ پریشانی اُس کے ہر عضو سے ہویدا تھی۔
''بیٹی پریشے! انسان کو ہمیشہ مثبت انداز میں سوچنا چاہیے۔ اللہ بھی اُس کی مدد کرتا ہے' تم تسلی رکھو۔ تمہارے بابا کے ساتھ کچھ بھی برا نہیں ہوگا۔'' اُن کا انداز ناصحانہ تھا۔ بابا سے اُس کی محبت اُن سے چھپی نہ تھی۔
''جی اماں...... اللہ خیر کرے گا۔'' وہ شاید خود کو تسلی دے رہی تھی۔
''چلو...... خانم سے کہو' پیاز چوپ کرے...... میں چینج کرکے آتی ہوں۔ آج بریک فاسٹ میں بناؤں گی۔ اپنی بیٹی کی پسند کے لچھے دار پراٹھے اور چیز آملیٹ۔'' لمبے بال جوڑے میں سمیٹتی وہ اُس کا گال چھو کر محبت سے بولیں تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر سج گئی۔

☆......☆......☆

''ایک وائٹ کافی پلیز......'' معیز خان ہمیشہ اپنے مخصوص انداز میں آواز لگاتا' اور کوسٹا کافی کے بیرے کی توجہ حاصل کرلیتا۔ بیرا بھی ہلکی سی اسمائل پاس کرکے اُس کی من پسند کافی تیار کردیتا۔
''سر......!'' گرماگرم کافی اُس کے سامنے تھی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد یہاں آکر کافی

پینا معیز خان کی ایک مستقل روٹین تھی۔
سگریٹ سلگاتا ہوا معیز ایک ہاتھ میں بھاپ اڑاتی کافی کا کپ تھامے سامنے والے پارک میں موجود لکڑی کے بینچ پر جا بیٹھا۔ ویسٹ لندن کا یہ پارک جو کہ النگ براڈوے کے بالکل برابر میں تھا' خوبصورت پھولوں اور ہریالی سے بھرا ہوا تھا۔ آج تو سورج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ بہت سے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے اس پارک میں نرم گرم دھوپ کے مزے لینے کے لیے آئے تھے۔ بینچ کے سامنے والے درخت کے نیچے ایک آئرش بزرگ جو کہ سماعت سے محروم تھا' جانے کیوں سوکھے پتے جمع کرتا' اور پھر ایک پھٹے ہوئے تھیلے میں ڈال لیتا۔
''لگتا ہے کوئی بے چارہ دکھیارا پاگل ہے۔'' معیز نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔
''اور یہ نرمالہ کہاں رہ گئی؟'' ریسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے وہ بڑی بے چینی کے ساتھ بڑبڑایا۔ سگریٹ ختم ہوتے ہی اُس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور نرمالہ کو فون کرنے لگا۔
''ہیلو......'' فون پر نرمالہ کی دلکش آواز گونجی۔ معیز کو لگا جیسے دور کسی مندر میں کئی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔
''یار......کہاں رہ گئی ہو؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔
''سوری معیز! آج میں بہت بزی ہوں' ملنے نہیں آسکتی۔'' دوسری طرف سے نرمالہ کی مدھر آواز گونجی لہجہ معذرت خواہانہ' نرمی اور حلاوت لیے ہوئے تھا۔
معیز کا دل یکا یک جیسے ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔
''نرمالہ Are You Mad؟ آج یونیورسٹی کا آخری دن ہے اس کے باوجود تم نہیں آرہی ہو؟'' وہ مایوسی اور خفگی سے مستفسر تھا۔
''ہاؤ......!'' معا معیز خان نے اپنے پیچھے ایک اونچی آواز سنی' تو چونک گیا' اُس نے مڑ کر دیکھا تو اُس کے دونوں شانوں پر ہاتھ دھرے وہ نرمالہ تھی جو اُسے بے وقوف بنانے پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔
''احمق لڑکی! بالکل بچوں جیسی امچیور حرکتیں کرتی ہے۔'' معیز خان ایک دم چڑ گیا تھا۔
''تمہیں ستانے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے۔'' سلونا چہرہ دھوپ کی حدت سے تمتما رہا تھا۔
''کدھر رہ گئی تھی بے بی؟ میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔'' معیز نے معصومانہ شکوہ بھری نرم آواز میں استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔
''معیز......! کیا بتاؤں......آج پھر سمبل کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اُسے گھر ڈراپ کرنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔'' نرمالہ نے محبت سے اُسے دیکھا' جو رگ و جاں سے بھی زیادہ قریب ہو گیا تھا۔
سمبل نرمالہ کی بہت پرانی سہیلی تھی۔ اپنے ماں باپ کا اکلوتا سہارا تھی اور ایڈورٹائزنگ کمپنی میں نرمالہ کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ اُس کی ماں بوڑھی اور معذور تھی' سو بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ نرمالہ کے ساتھ آؤٹ گوئنگ کرتی ہو۔
''ہاں بھئی جانتا ہوں وہ تم سے چپک جاتی ہے تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن تمہیں بتانا چاہیے

تھا کہ نرمالہ کا شہزادہ بے تابی سے اُس کا انتظار کر رہا ہے۔'' معیز خان نے موضوع کو خوبصورتی کے ساتھ بدلتے ہوئے شوخ لہجہ میں کہا۔

''اچھا جی......!'' اُس چنچل پری زاد نے بھی اپنی ہرنی جیسی موٹی موٹی آنکھیں اُس پر گاڑتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''جی ہاں......'' اُس کے نرم گداز ہاتھوں کو اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے وہ اُسے عجیب دیوانگی سے تکنے لگا تو نرمالہ نے محجوب سے انداز میں رخ موڑ لیا۔

''او گاڈ! تم بلش کر رہی ہو۔'' معیز خان خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔

وہ بظاہر بولڈ لگتی لیکن فطرتاً شرمیلی تھی' حالانکہ وہ یہیں (لندن) کی بورن تھی۔ اور اِس وقت اُس کا یوں شرمانہ معیز خان کو دیوانہ سا کر گیا۔ وہ بے خود سا ہو کر ایک ٹک اُسے وارفتگی سے تکنے لگا۔

''اوہ......نرمالہ...... بے بی' میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں' اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہونے والا...... جاب ملتے ہی میں تمہیں تم سے بھی چرا لوں گا۔ تم صرف میری ہو۔'' مدہوشی میں اپنی محبت کے منتر پڑھتا ہوا وہ اُسے بھی پاگل کر رہا تھا۔ اُس کی بے تابی کا منظر آج بہت نرالا تھا مگر نرمالہ کی لجاہٹ میں کچھ پریشانی کا عنصر بھی تھا۔

اُس کی آنکھوں میں اُداسی کے بادل چھائے دیکھ کر معیز خان شوخی و شرارت بھول کر فی الفور سنجیدہ ہو گیا۔

''یہ پریشانی کیوں؟'' نرمالہ کا پھول سا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھامتے ہوئے وہ استفسار کر رہا تھا۔

''اِک لمحے کو تمہیں کھونے کے ڈر نے میری دھڑکنیں روک دی ہیں۔'' سادہ سی وہ لڑکی اپنے جذبوں کے اظہار میں بھی سچی اور کھری تھی۔

''پگلی...... معیز خان تمہیں ایک پل اک لمحے کے لیے بھی خود سے دور نہیں ہونے دے گا۔'' اِس کے لہجے کی شدتیں اُس کی سچائی کی گواہ تھیں۔

''ہماری محبت کے نصیب میں شاید ہی وصل کی راحت ہو۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں۔ ہمارے درمیان مذہب' کلچر' قومیت' دین دھرم کی اتنی اونچی اونچی فصلیں کھڑی ہیں' جنہیں عبور کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم روایات کی بیڑیوں میں پابندِ سلاسل ہیں۔'' اُس کے لہجہ میں گہرے درد کی کوک تھی۔ اور آنکھ آنسوؤں سے تر تھی۔

''محبت کسی حدود و قیود کی پابند نہیں ہے نرمالہ......'' وہ ہٹ دھرمی سے باغیانہ انداز میں بولا۔

''تو اِس رشتے کا انجام......؟''

''شادی...... میں تم سے شادی کروں گا۔'' اُس نے لمحوں میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ لیا۔

نرمالہ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی' آج سے پہلے کبھی اُس کے اور معیز خان کے درمیان گفتگو اِس رخ پر نہیں آئی تھی' اِس غیر متوقع بات پر وہ ورطۂ حیرت میں تھی۔

دو سال سے وہ اُس کے عشق میں مبتلا تھا لیکن شادی......؟ اُن کے درمیان کبھی ایسی کوئی کمٹمنٹ نہیں

ہوئی تھی' وہ جانتی تھی کہ وہ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے' لیکن خود کو معیز خان سے ملنے سے کبھی روک نہیں پاتی۔

معیز خان نے اُسے گم صم دیکھا۔ تو دھیرے سے اُس کا سر اپنے شانے پر ٹکا لیا۔

''بے بی' ہر بات کا اِک وقت مقرر ہوتا ہے' اگرچہ میں نے تم سے کبھی شادی کا وعدہ نہیں کیا تھا لیکن مجھے لگا کہ تمہارے لیے Under Stood ہو گا' اب ظاہر ہے معیز خان کے جذبے اتنے ارزاں تو نہیں ہیں' کہ یونہی کسی پر بھی لٹاتا رہے۔'' وہ محبت سے اُسے سمجھا رہا تھا۔ جو اِس غیر متوقع فیصلے پر مسرائز سی تھی۔

''لیکن تمہارے آغا جان اور بی بی جان......؟'' اُس کے لب محض پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

''وہ میری ہیڈک ہے۔'' اُس کا انداز قطعی تھا۔

آغا جان اور بی بی کبھی بھی نرمالہ کو قبول نہیں کرتے ...... یہ بات معیز خان کے لیے دردِ سر نہیں تھی۔ وہ خود سر' ہٹیلا اور اپنی من مانی کرنے والا تھا۔ اگر اُس نے نرمالہ سے شادی کا فیصلہ لیا تھا تو اُسے کوئی بھی روک نہیں سکتا تھا یہاں تک کہ آغا جان بھی نہیں......

اُس کے فیصلے چٹانوں کی سی سختی لیے ہوتے تھے۔

نرمالہ اُس کا عشق تھی۔

اور اِس عشق کے لیے وہ ہر رشتہ داؤ پر لگانے چلا تھا۔

''لیکن میرے باؤ جی...... اُن کا تو دھرم بھرشٹ ہو جائے گا...... وہ اِس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''اُف ایک اور فصیحت حاضر تھا۔'' معیز نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''تو میں تمہیں کڈنیپ کر لوں گا......'' اُس کے پاس ہر پرابلم کا حل تھا۔

''بس مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں...... ویسے بھی تمہارا اسینس آف ہیومر خاصا فضول ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''اور......اور وہ جیسپر سنگھ بھی آ رہا ہے کل کی فلائٹ سے۔'' نرمالہ کی آواز میں تفکر پنہاں تھا۔

معیز کو اِس سے اُس جیسپر کا تذکرہ زہر سے بھی برا لگا۔

''وہ کمینہ کیوں آ رہا ہے؟''

''باؤ جی اُس سے میری سگائی کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ پریشانی سے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اضطراب اور بے قراری اُس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

جیسپر سنگھ نرمالہ کے باؤ جی کے جگری یار سرجیت دھاری وال کا اکلوتا بیٹا تھا' جو امرتسر (پنجاب) سے آ رہا تھا۔ چار سال پہلے جب وہ انڈیا گئے تھے تو باؤ جی نے اپنے دوست کو یہ وچن (وعدہ) دیا تھا کہ وہ نرمالہ اور جیسپر کا بیاہ کریں گے۔ Thames Valley University سے کلچرل اسٹڈیز کر رہی تھی۔ جیسپر سنگھ اُس کے (Calibe) کا بندہ نہیں تھا۔ اُن کے درمیان کسی قسم کی ذہنی مطابقت اور ہم آہنگی نہ تھی۔ سو نرمالہ نے صفا چٹ انکار کر دیا کہ وہ جیسپر سے شادی نہیں کرے گی۔ لیکن

اُس کے انکار کو باؤ جی نے بچپنا سمجھ کر خاطر خواہ اہمیت نہ دی اور اب اُس کی آمد کا سن کر معیز کا دماغ بھک سے اڑ گیا' وہ اپنی جگہ سے یوں اچھلا' جیسے اُسے کسی زہریلے بچھو نے ڈس لیا ہو۔

''Are You Serious؟'' معیز نے استعجابیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اوہ گاڈ......!'' محبت کے چھن جانے کی محض سوچ ہی کتنی اذیت ناک تھی۔ کرب کے ناگ اُس کی رگوں میں زہر اتارنے لگے۔ وہ اُس کے لیے اپنا ہر رشتہ داؤ پر لگانے کو تیار تھا۔ اور وہ کسی اور سے سگائی کر رہی تھی۔

غصے سے اُس کی مٹھیاں بھینچ گئیں' اور نرمالہ کے شانے سے لپٹی باہیں یکا یک ڈھلک گئیں۔

نرمالہ اُس کے اتنے شدید ری ایکشن پر بھونچکی رہ گئی۔

''معیز! تم ٹھیک ہو ناں......'' وہ فکرمندی سے اُس کی طرف بڑھی لیکن معیز خان نے اُس کا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔

''اگر تمہارا رشتہ طے ہو چکا تھا تو پچھلے دو سال سے تم میرے ساتھ کیا کر رہی ہو؟'' وہ اردگرد سے بے نیاز ہو کر چلایا۔ اُس کی آنکھوں میں غصے اور جنون کی اتنی شدت تھی کہ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے شرمندگی اور تاسف سے اردگرد دیکھا لوگ متوجہ ہو رہے تھے۔

''معیز ...... پلیز ...... میری بات تو سنو۔'' وہ لجاجت سے بولی۔

''کیا سنوں ...... ہاں ...... یہی کہ تم کسی اور سے شادی کرنے جا رہی ہو۔'' اُس کی آواز رندھ گئی اور ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔

''میں کسی سے بھی شادی نہیں کر رہی معیز خان ...... اور نہ ہی ایسا کرنے کا سوچ سکتی ہوں۔ میں بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں' جتنی محبت تم مجھ سے کرتے ہو۔'' وہ سخت بے بس دکھائی دے رہی تھی۔

''اور جب باؤ جی نے سرجیت انکل کو وچن دیا تھا' اُس وقت بھی میں نے اِس شادی سے فوری انکار کر دیا تھا' لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنی ضد کے اتنے پکے ثابت ہوں گے۔'' وہ اضطراری انداز میں قدرے سخت لہجے میں بولی۔

''اوکم آن یار! تم پنجاب کے کسی پنڈ میں نہیں رہتیں جو تمہارے باؤ جی تمہیں یوں پریشرائز کر رہے ہیں۔ تم یو کے جیسی کنٹری کی باسی ہو جہاں جانوروں تک کے حقوق کی پاسداری کی جاتی ہے' تم تو پھر ایک ویل ایجوکیٹڈ لڑکی ہو جو اپنے رائٹ کے لیے ہر کسی سے فائٹ کر سکتی ہے۔ سو یہ لاچاری اور بے بسی کا ڈرامہ میرے سامنے نہیں چلے گا۔'' وہ چڑ کر اہانت آمیز لہجے میں بولا۔

نرمالہ اپنی توہین پر لب کچل کر گئی۔

''معیز! تم اتنے سنگ دل کیسے ہو سکتے ہو' تم جانتے ہو ناں' باؤ جی دیدی کے دیہانت (موت) کے بعد میرے بارے میں کس قدر حساس ہو گئے ہیں۔ وہ مجھ سے بے حد پریم کرتے ہیں۔ میں انہیں دکھ نہیں دے سکتی پلیز گیو می سم ٹائم' میں اِس ایشو کو اپنے طریقے سے کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ مصالحانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔

''اور مجھے دکھ دے سکتی ہو تم؟'' وہ سخت بدگمان ہوا۔

''معیز' تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟'' وہ کبیدہ خاطر تھی۔

''خوب سمجھ رہا ہوں' کہہ دو کہ تم اس ریلیشن شپ کو لے کر مزید نہیں چل سکتیں۔'' وہ سرد اور بے لچک لہجے میں بولا۔

وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا خودسر' جنونی اور ہٹیلا!...... جبکہ نرمالہ محبت سے گندھی' نرم خو سی حساس لڑکی تھی' وہ معیز خان کے مزاج سے خائف تھی لیکن اپنے دل کے سامنے بے بس تھی۔ جو دن رات صرف اُسی کے نام کا راگ الاپتا رہتا۔

''وائے گرو کی سوگند...... میں تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی' اور تم......!'' اس الزام پر وہ تڑپ کر رہ گئی۔ غم و غصہ سے بات حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ اشکوں کا ریلا آنکھوں سے بہہ نکلا۔ جو معیز خان کو بھی تڑپا گیا۔ وہ یکدم نرم پڑ گیا' کچھ بھی تھا' وہ نرمالہ سے پاگلوں کی طرح محبت کرتا تھا۔

''یہ اچھا ہے بھئی' جانتی ہو ناں کہ تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔'' بے بسی سے کہتا وہ قریب ہوا اور نرمی سے تھام کر اُسے اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''تم بہت برے I Hate You' دنیا کے سب سے برے آدمی خوامخواہ ہی مشتعل ہو جاتے ہو۔'' نازک ہاتھوں سے اُس کے شانے پر دھموکہ جڑتے ہوئے وہ چڑ کر بولی۔

''میں بہت زیادہ ڈر گیا تھا' کہ کہیں وہ اُلو کا پٹھا جیسپر تمہیں لے اڑا تو......؟'' معصومیت بھری خفگی سے کہا تو نرمالہ بے اختیار روتے روتے ہنس دی۔

معیز خان کو اُس کے ملیح چہرے پر دھوپ چھاؤں سا یہ منظر اتنا بھلا لگا کہ وہ بے اختیار اُسے دیکھے گیا۔

''تمہارے بنا زندگی کا تصور بھی نہیں۔'' اُس کے انداز میں اتنی شدت اور جنون تھا کہ وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

لندن کی سرمئی شام عجیب یاسیت لیے ڈھل رہی تھی۔ ایک دوسرے میں گم دونفوس اِس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ کوئی چٹان چہرے والا انہیں اپنی سخت نظروں کے حصار میں لیے ہوئے ہے۔

☆......☆......☆

عجیب طلسم کدہ تھا...... چاروں اطراف دھواں ہی دھواں...... فضاؤں میں بارود کی خوشبو تھی۔ لوگوں کا جمِ غفیر...... اور اُن میں ایک جانا پہچانا چہرہ...... جو لہولہان تھا...... خوابیدہ وجود کی سانسیں دھونکنی کی مانند چلنے لگی۔ دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے قرار تھا۔

اُس چہرے کے ہر ہر عضو سے اپنائیت ٹپک رہی تھی۔ اُس کے قدم لحہ بہ لحہ' اُس شناسا چہرے کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن وجود جیسے پتھر کا ہوگیا۔ اِردگرد ڈھیروں اژدھے منہ کھولے کھڑے تھے۔ اُس کی رگیں ٹوٹنے لگیں۔ قیامت سی قیامت تھی۔

''مجھے بچاؤ...... تیمور خان میرے بیٹے...... مجھے بچاؤ۔'' کثافت زدہ فضائیں زخمی وجود کی نحیف آواز سے گونج اٹھیں۔

''بابا......!'' اُس کے ذہن میں یکا یک دھماکے ہونے لگے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ سخت ٹھنڈ میں بھی پورا وجود پسینے سے تر بتر تھا۔

''اُف خدایا! یہ کیسا خوف ناک خواب تھا جس نے میرے دماغ کی ساری چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔'' دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ سخت وحشت زدہ تھا۔

کمرے کا ماحول خنکی لیے ہوئے تھا۔ لیکن اُس کا پورا وجود جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ اِس پر مستزاد کچی نیند کا خمار...... تیمور خان کی طبیعت سخت بوجھل اور مضطرب ہوگئی۔ غائب دماغی سے چلتا ہوا وہ کھڑکی تک آیا اور پردے برابر کردیے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادلوں کا گھیرا تھا۔

سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اُسے کافی کی شدید طلب ہوئی۔ وہ سلیپر گھسیٹتا باہر آیا تو خانم کو کچن میں مصروف پایا۔

''خانم! پلیز میرے لیے ایک کپ بلیک کافی بنادیں۔'' اُس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اُس کی طبیعت کے بوجھل پن کے واضح غماز تھے۔

''خاناں! تیری طبیعت کچھ اچھی نہیں لگ رہی ام کو۔'' خانم کا مقامی لب ولہجہ ماں کا سا مشفقانہ انداز لیے ہوئے تھا۔ وہ ہمیشہ اُس کے لیے ایسے ہی متفکر رہتیں۔ پریشے اور تیمور خان انہی کی گود میں پلے بڑھے تھے اِس لیے وہ گھر میں فیملی ممبر کی سی حیثیت رکھتیں۔ خصوصاً تیمور سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔

''میرے سر میں بے حد درد ہے خانم۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ اُس کی اضطرابی کیفیت اُس کے چہرے سے مترشح تھی۔

''او بچہ...... شاید تم کو سردی لگ گیا ہے، ام تم کو ابھی کافی بنا کر دیتا ہے، ساتھ میں سر درد کا گولی بھی......'' خانم سخت متفکرانہ انداز میں کافی میکر کی طرف بڑھتے ہوئے عجلت و پریشانی سے بولیں۔

''جی...... میں بابا کے پاس جارہا ہوں اُن کے روم میں...... کافی وہیں لے آیئے گا۔''

''لیکن صاحب تو مارننگ واک کے لیے گیا ہے، زیتون کے باغ کی طرف۔'' مصروف سے انداز میں خانم نے مطلع کیا۔

''واپس نہیں آئے اب تک؟'' اُس نے مندی مندی آنکھوں سے ایک اچٹتی نگاہ لاؤنج میں وال کلاک پر ڈالی، جہاں صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ بابا فجر کے بعد واک کے لیے نکل جاتے اور عموماً سات بجے تک واپس آجاتے تھے۔ آج اُن کی تاخیر نے تیمور خان کو پریشان کردیا۔

وہ انتہائی سرعت سے اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

''خاناں...... او...... بچہ...... ہماری بات تو سنو......'' خانم آوازیں لگاتی رہ گئیں لیکن وہ اَن سنی کر کے یہ جا وہ جا......

اُس کا یہ اُلجھا اُلجھا رویہ خانم کو بھی اُلجھن میں مبتلا کر گیا۔

''خدایا! جانے کیوں یہ لڑکا ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔'' اب وہ پریشانی سے بڑبڑا رہی تھیں۔

سی کے کی شرٹ پر بلیک لیدر جیکٹ پہنے اب وہ جوگرز کے لیسز باندھ رہا تھا، جب موبائل کی تیز بیپ نے اُس کی سوچوں کا ارتکاز توڑ دیا، انجانے خدشات اُسے وہم بن کر ستا رہے تھے۔ اور اِس وقت بابا کی خیریت کے علاوہ اُسے کچھ درکار نہ تھا، سوسیل فون کی بجتی بیل کو نظر انداز کردیا، لیکن فون کے دوسری جانب

بھی کوئی بلا کا ڈھیٹ تھا۔ وہ انتہائی عجلت میں تھا۔ انگلش میوزک کی دھن پر بجتی تیز بیل اُسے سخت کوفت میں مبتلا کر گئی۔ بیزاری سے اُس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھایا تو فروا کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔

''ہیلو......'' اُس نے نوٹ 5 کی بڑی سی اسکرین پر ٹچ کیا تو بلبل سی چہکتی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ جسے سن کر اُس کی کوفت حد سے سوا ہوگئی۔

پچھلے تین دن سے معید کے ساتھ مٹر گشتی کرنے اور سونے کے علاوہ اُس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اُسے خود سے کال کرنا تو کجا' اُس کی کالز اور میسجز کو آنسر تک نہیں کیا تھا۔ لاپرواہی سی لاپرواہی تھی۔ سو اُس کی کلاس تو بنتی تھی' لیکن فی الحال وہ عزت افزائی کے موڈ میں نہ تھا۔

''دنیا کے سب سے بڑے نکمے' سو رہے ہوگے یقیناً...... حسبِ عادت وحسبِ معمول۔'' شوخ آواز والی کی بے تکلفی ظاہر کر رہی تھی کہ دونوں میں تکلف کی کوئی حد نہیں تھی۔

وہ نیند کا رسیا تھا' سب جانتے تھے۔

''گویا یہ بھی اب طعنہ بن گیا تھا۔'' تیمور کا موڈ مزید خراب ہوا۔

''دیکھ موٹی! میں اِس وقت بہت جلدی میں ہوں' مجھے کہیں جانا ہے تجھ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' یہ سنجیدہ وخشک لب ولہجہ غالباً دوسری جانب غیر متوقع تھا۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شاید اُسے برا لگا تھا۔ تیمور کے حلق سے ایک گہری سانس برآمد ہوئی۔

''آئی ایم سوری یار...... میں کچھ پریشان ہوں۔'' وہ سخت خجالت کا شکار ہوا۔

''سب خیریت ہے ناں تیمور؟'' وہ بے چینی سے مستفسر ہوئی۔

وہ سنہرے دل والی ایسی ہی حساس تھی۔ ہر کسی کی تکلیف پر تڑپ جانے والی اور یہاں تو معاملہ تیمور خان کا تھا' جو اُس کی روح میں مقیم تھا۔ لہو کی حرارتوں میں شامل تھا۔ اُس کے دل کا باسی تھا۔

''اللہ کرے خیریت ہی رہے......'' بوجھل ذو معنی لہجہ فروا کو مزید بوکھلاہٹ کا شکار کر گیا۔

''پچھلے تین دن سے تم کہاں تھے' تمہاری کوئی خبر نہیں تھی۔'' اُس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔

''معید اور کچھ دوستوں کے ساتھ بزی تھا یار...... باربی کیو نائٹ کی' کچھ Hiking بس مصروفیت کی وجہ سے تمہارا فون پک نہیں کر پایا۔'' وہ سر کھجا کر رہ گیا۔

''تو پھر کیا یک ایسا کیا ہوگیا؟'' وہ استعجاب میں گھری ہوئی تھی۔

''I Will Talk To You L'ate۔'' گھمبیر لہجہ باور کرا رہا تھا کہ فی الوقت وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر ہے۔ کال کٹ چکی تھی۔ وہ حیران و پریشان سی موبائل ہاتھ میں تھامے وہیں کھڑی رہ گئی۔

تیمور خان کا رخ پورٹیکو کی طرف تھا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اُس نے وسیع لاؤنج عبور کیا' خانم افتاں وخیزاں سی اُس کے پیچھے لپکیں۔

''ارے بچہ' کدھر جا رہا ہے تم......''

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اگنیشن میں چابی گھمائی Amazon کا جناتی سائز انجن گڑگڑایا۔

''کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔'' اُس نے وہیں سے ہانک لگائی جو خانم کے خاک بھی پلے نہ پڑی۔

دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی فارم ہاؤس کے آہنی گیٹ کے سامنے تھی۔ دریا خان نے سرعت سے گیٹ کھولا۔

ڈرائیو وے کے دونوں اطراف خوبانی' ناشپاتی' اور سیب کے درخت پوری شان سے ایستادہ تھے' جو پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔

''چھوٹے صاحب آپ؟'' دریا خان اسے صبح صبح دیکھ کر حیران ہوا تو وہ یکدم چڑ گیا۔ گویا دیر سے جاگنا اُس کے لیے عذاب ہی بن گیا تھا۔

''کیوں میرے صبح صبح اٹھنے پر کوئی پابندی ہے؟'' وہ اُس پر چڑھ دوڑا۔

''نہیں...... مم...... میرا مطلب......'' وہ گڑبڑا گیا۔

''بابا واک کرتے ہوئے یہاں آئے تھے؟'' سخت لہجہ استفہامیہ انداز لیے ہوئے تھا۔

''جی...... جی بڑے صاحب باغ میں رفیع اللہ (منشی) کے ساتھ کاروباری معاملات پر حساب کتاب کر رہے ہیں۔'' دریا خان نے منمناتے ہوئے کہا تو تیمور کی جان میں جان آئی اسی اثناء میں آدم خان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ والہانہ انداز میں اُن کی طرف بڑھا اور اُن کے شفیق سینے سے لگ گیا۔

''شکر ہے خدا کا...... بابا بالکل ٹھیک ہیں۔'' اُس نے دل میں سوچا اور انہیں اپنے مضبوط آہنی بازوؤں میں مزید زور سے بھینچ لیا۔

اُس کی یہ وارفتگی اور اچانک آمد انہیں خوشگوار حیرت میں مبتلا کر گئی۔

''ارے...... رے...... بیٹا...... یہ اپنے جوان بازوؤں کی طاقت مجھ بوڑھے پر کیوں آزما رہے ہو؟'' انتہائی خوشگوار موڈ میں انہوں نے کراہنے کی مصنوعی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''بابا آپ بھی ناں؟'' وہ خجل سا ہو کر دھیرے سے اُن سے الگ ہو گیا۔ آدم خان نے ایک احساسِ تفاخر سے اُس کے صحت مند توانا اور مضبوط وجود کو دیکھا' اور محبت سے استفسار کیا۔

''آج میرا بیٹا اتنی جلدی کیسے اٹھ گیا؟''

''اب پلیز یہ مت کہیے گا کہ اتنی صبح کیسے اٹھ گیا۔'' ناراضگی بھرا انداز احتجاج لیے ہوئے تھا۔ پس پردہ کیا کہانی تھی سب کو ادراک تھا۔

آدم خان زیرِ لب مسکرا دیے۔ وہ تیمور خان کے چہرے کے تاثرات بغور دیکھ رہے تھے' اگرچہ وہ ریلیکس نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا' لیکن کچھ تو تھا جو وہ یوں مضطرب سا یہاں بھاگا چلا آیا تھا۔

''میرا بیٹا اب مجھے بتائے گا کہ معمہ کیا ہے' یہ اضطراب' یہ وارفتگی' یہ پشیمانی کیوں؟'' گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ گویا اُسے کھوج رہے تھے۔

''اوہ خدا...... بابا کی زیرک نگاہوں سے کچھ چھپانا کس قدر مشکل ہے۔'' بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے اُس نے گاڑی ریورس کی اور بے چارگی سے سوچا۔

''بابا...... میں گزری کچھ ساعتوں میں بے حد کرب اور ذہنی اذیت سے گزرا ہوں۔ میں نے بہت برا خواب دیکھا جس نے میری رگ و جاں کو حد درجہ مضطرب کر دیا۔ اور پھر آپ کی تاخیر نے مجھے مزید حواس باختہ کر دیا۔'' اُس نے صاف بات کرنے کی ٹھانی۔ کیونکہ علاوہ ازیں کوئی چارہ نہ تھا۔ آدم خان بے حد

سنجیدگی سے اُسے سن رہے تھے۔اُن کے پُروقار چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔
''بابا' میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا......کبھی نہیں۔'' معاً اسٹیئرنگ پر اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ وہ اُن کے سامنے ٹوٹنا نہیں چاہتا تھا۔لیکن ریت کی بھربھری دیوار کی طرح بکھر گیا۔آنسوؤں کی نمی چہرے کو بھگوگئی۔
آدم خان اُس کی شدت پر دنگ رہ گئے۔کیا خون کے رشتے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ انہیں قبل از وقت ہی آنے والی انہونی کی آگہی ہوجاتی ہے۔اُن کے چہرے پر درد کا سایہ سا لہرایا' لیکن انہوں نے خود کو منتشر ہونے سے روکا' کہ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے۔اپنی ذات سے اُس کا والہانہ لگاؤ اُن سے پوشیدہ نہ تھا' اُن کے جگر کا ٹکڑا اُن کے لیے قلزم اشک میں ڈوبا ہوا تھا' کیا گزرتے وقت کا کوئی لمحہ اِس سے بڑھ کر قیمتی بھی ہوسکتا تھا۔اِک افسردہ سی مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں سے چپک گئی۔
''خاناں...... یارا...... کیسے وہم پالے ہوئے ہے تُو......؟ اور یہ لڑکیوں کی طرح ٹسوے بہانے کے بعد تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تُو؟'' وہ دوستانہ انداز میں اُسے یوں طعنے کس رہے تھے گویا اُس کے لنگوٹیے یار ہوں۔
تیمور نے شکوہ کناں نظروں سے انہیں دیکھا۔
''بابا آپ مجھے بہلانے کی کوشش مت کریں پلیز۔'' اُس کا لہجہ ملتجی تھا۔
''بیٹا......اپنے دل ودماغ سے سب خوف جھٹک دو' صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو' سب وہم دور ہوجائیں گے۔'' انہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ دھرا اور اپنی محبت بھری چھایا میں لے لیا۔
تیمور کو یک گونہ تقویت کا احساس ہوا معاً اپنے چاروں اطراف اُسے گاڑیوں کے ٹائر چرچرانے کی آواز آئی' آدم خان تو پدرانہ جذبات سے اتنے مغلوب تھے کہ فوری سنبھل ہی نہ پائے' لیکن تیمور خان کی ساری حسیات جیسے الرٹ ہوگئیں۔خطرہ اُن کے سر پر منڈلا رہا تھا۔وہ چاروں طرف سے گھر گئے تھے' تیمور خان نے انتہائی سرعت سے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر گن نکالی' لیکن اُس سے پہلے ہی فضا زوردار دھماکے سے گونج اٹھی۔

☆......☆......☆

وہ اسلام آباد کی سڑکوں پر یونہی بے مقصد خاک اڑاتی پھر رہی تھی۔تارکول کی سڑک بھی گول ہر پل کچلے جانے کے غم میں دکھ بول رہی تھی۔
آج وحشت حد سے سوا تھی۔
جنون تھا......شدت تھی......حدت تھی......دیوانگی تھی......
کچھ بے ربط قصے تھے......!
اَن کہی کہانیاں تھیں......!
بے اختیاری تھی......!
وہ اُداس روتی شام کے گلے لگ کر سسکنے لگی۔
سردی اُس کی رگ رگ میں اترنے لگی۔

کیسا روگ تھا...... کیسا جوگ تھا؟

''اللہ...... اُس انجان کے دل تک میرے عشق کی رسائی کیوں نہیں ہوتی؟'' آج ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اشکوں نے اُس کا دامن بھگو دیا۔ برسوں سے یہ درد دل کا وارث تھا۔

تین دن...... صرف تین دن کی بے اعتنائی نے یہ حال بنا دیا تھا۔

وہ جو رگ وجاں سے زیادہ قریب تھا۔ بچپن کا سنگی ساتھی تھا۔ سنگدل کیوں اتنا بے نیاز تھا۔ کیوں نہیں سمجھتا تھا کہ زندہ رہنے کے لیے وہ...... صرف وہی لازم وملزوم تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ تھک کر اُس نے گاڑی کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ شہر بھی اُس کے وجود کی طرح خاموشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اُس کا سامنا ممی سے ہوا۔

''کہاں تھیں تم؟ کتنی کالز کیں بٹ نو رپلائی؟'' ممی سخت غصے میں تھیں۔ اُن کے ماتھے پر گہرے بل پڑے ہوئے تھے۔

''وہ ایکچوئیلی...... کچھ سگنل پرابلم تھا' پھر میری بیٹری ڈیڈ ہوگئی...... سو......'' وہ کمزور اور بودے بہانے گھڑ رہی تھی۔

ممی نے متاسفانہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تمہارا یہ لاپرواہ اور غیر ذمہ دارانہ رویہ مجھے بے حد طیش دلاتا ہے فروا۔'' اُن کا اشتعال ہنوز تھا۔

''سوری ممی......'' اُس نے سر جھکا کر بے چارگی سے گویا اعترافِ جرم کیا۔

''میں تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی تھی بیٹا...... اور پھر زرمینے بھی کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' ممی اُسے شرمندہ دیکھ کر قدرے نرم پڑ گئی تھیں۔

''زرمینے...... کب آئی وہ؟''

زرمینے کی اچانک آمد نے اُسے چونکا دیا۔ کاش وہ اس وقت رب سے کچھ اور مانگ لیتی۔ اِس وقت اُسے شدت سے کسی اپنے کے سہارے کی ضرورت تھی۔

''دو گھنٹے پہلے محترمہ کسی آفت کی طرح نازل ہوئی ہیں۔'' اُن کے لہجے میں زرمینے کے لیے ڈھیروں محبت تھی۔

''اُف یہ زرمینے اور اُس کے سرپرائز......'' فروا بڑبڑائی۔

''زرمینے تمہارے روم میں ریسٹ کر رہی ہے' تم فریش ہو جاؤ' میں رحمت بی سے کہہ کر کھانا اُدھر ہی بھجوا دیتی ہوں۔'' ممی کی مامتا اب پوری طرح جاگ اٹھی تھی۔

''لیکن ہم تو کھانا سب کے ساتھ ہی کھائیں گے۔'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس نے مڑے بغیر کہا۔

''ہم کھانا کھا چکے ہیں۔''

انہوں نے جتایا۔

ممی کے اِس خفیف سے طنز پر فروا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''آئی فورگیٹ ممی...... کہ کرنل پاپا نہیں بلکہ آپ ہیں سو کھانا آٹھ بجے سے لیٹ کیسے ہو سکتا ہے' میں کیسے بھول گئی کہ میری ممی پوری اسٹیلر ہیں۔'' اُس نے وہیں سے مڑ کر شرارت بھری نظروں سے دیکھتے

ہوئے نشانہ لگایا۔ ممی ہر کام اپنے مخصوص وقت پر کرنے کی عادی تھیں، جو فروا کو کبھی کبھی سخت گراں گزرتی۔
''اگر میں پوری اسٹیلر ہوں تو تم آدھی ایڈیٹ ہو۔'' انہوں نے بھی دوبدو جواب دیا تو وہ ہنستی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔
زرمینے بی بی پوری شان سے اُس کے بیڈ پر محو استراحت تھیں۔ اُسے یوں خواب خرگوش کے مزے لیتے دیکھ کر فروا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
''کمینی! آنے سے پہلے ایک فون کال تک نہیں کی؟'' وہ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھی اور کشن کھینچ مارا۔
''یا وحشت!'' زرمینے ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔
''کیا آفت ٹوٹ پڑی تجھ پر...... کچھ تو تمیز سیکھ لے؟'' زرمینے نے اُسے گھرکا، نیلی آنکھوں میں کچی نیند کے خمار نے گلابی ڈورے ڈال دیے تھے۔
''منحوس، کتنا مس کیا میں نے تجھے، اور تو نے آنے سے پہلے انفارم کرنا ضروری نہیں سمجھا؟'' وہ اوور ایکسائٹمنٹ میں اُس کی نازک کمر پر دھوکہ جڑتے ہوئے اُس سے لپٹ گئی۔
''بی بی...... سرپرائز بھی کسی شے کا نام ہے؟'' اپنی کمر سہلاتے ہوئے زرمینے منہ بنا کر بولی۔
''میں نے تجھے بہت مس کیا۔'' فروا کی آواز رندھ گئی وہ ابھی بھی اُس سے لپٹی ہوئی تھی۔
''پگلی......'' زرمینے اُس کی حساس طبع سے آگاہ تھی، سو جواباً اُس نے بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے زور سے بھینچ لیا۔
''اور میں نے بھی تمہیں بلکہ تم سب کو بہت مس کیا، اسی لیے اِس بار پورے دو ماہ تمہارے ساتھ رہنے کے لیے آئی ہوں۔'' زرمینے سرشاری سے بولی۔
''سچ......'' فروا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ صرف اُس کی بچپن کی دوست نہیں تھی بلکہ اُس کی راز داں اُس کی غمگسار اور دمساز بھی تھی۔ اُس کی خاموش محبتوں کی گواہ...... اُس کی شدتوں کی امین...... اُس کی ذات کا کوئی پہلو زرمینے آفندی سے مخفی نہ تھا۔
''ہاں...... سچ......'' وہ شرارت سے مسکائی کہ اچانک دروازے پر دستک کی آواز نے چند ساعتوں کے لیے اُن کا ارتکاز توڑ دیا۔ رحمت بی گرما گرم کھانا لائی تھیں۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے زرمینے کی بھوک چمکا دی۔
''واؤ...... قورمہ...... یخنی پلاؤ...... شامی اور دم والا قیمہ...... خالہ نے میری فیورٹ ڈشز بنوائی ہیں۔'' وہ ایک ایک ڈونگے کا ڈھکن اُٹھا کر انتہائی اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔
''زرمینے بٹیا! بیگم صاب نے آپ کے لیے کھانا خود بنایا ہے۔'' رحمت بی محبت سے بتا رہی تھیں۔
''سو سوئٹ!'' خالہ کے ہاتھ کا بنا کھانا اُسے ویسے بھی بہت مرغوب تھا۔
''فروا بٹیا...... مزید کچھ چاہیے ہو تو انٹرکام کر دینا۔'' رحمت بی جاتے جاتے پلٹیں فروا نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''اور تیرا وہ بندر...... کہاں ہے آج کل۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد منہ چلاتے ہوئے زرمینے نے

ذو معنی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
''وہاٹ...... بندر......؟'' فروا کا دل جل کر راکھ ہو گیا۔ اُس نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔ جو لاپرواہی سے کھانے پر یوں ٹوٹی ہوئی تھی جیسے پہلی بار نصیب ہوا ہو۔
''مرتو......'' فروا نے جلے دل سے کہا تو زرمینے کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
''ہاں......تو بندر ہی تو ہے۔'' چمچ بھر بھر کے پلاؤ کھاتی ہوئی وہ فروا کو زہر سے بھی بری لگی۔
''اُف خدایا...... بندر اور تیمور......؟ یہ تو حد ہی ہو گئی۔''
اُس نے متاسفانہ انداز میں کہا۔
''اچھا چل چھوڑ ناں...... ویسے موصوف کدھر ہیں۔ خالہ بتا رہی تھیں تمہاری یونیورسٹی سے اِن دنوں آف ہے۔'' اُس نے حسب عادت بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔ تو فروا نے ایک گہری سانس لی۔
''پہلے تو تسلی سے ٹھونس لے...... پھر تجھے اپنے دل کا حال بھی بتا دوں گی' اور اُن موصوف کے بارے میں بھی۔'' اُس نے تیز لہجے میں کہا۔
''ہمم...... یہ تیور...... مطلب دشمنِ جاں سے ناراضگی چل رہی ہے۔'' وہ اپنے تئیں اندازے لگا رہی تھی۔
''نہیں...... وہ سیدو شریف میں ہے۔'' اپنی پلیٹ میں بے دلی سے چمچ چلاتے ہوئے فروا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ زرمینے دیکھ رہی تھی کہ وہ بالکل بھی رغبت سے کھانا نہیں کھا رہی۔
''فروا...... کچھ ہوا ہے؟'' وہ محتاط انداز میں جیسے اُسے جانچ رہی تھی۔
''زرمینے...... اُس کی محبت عذاب بن رہی ہے۔'' اُس کے گلوگیر لہجے نے زرمینے کو فی الفور سنجیدہ کر دیا۔
''یکطرفہ جذبے مات کے سوا کچھ نہیں فروا...... شاید وہ کسی اور سیارے کا ہے' جو تمہاری کشش ثقل سے کئی سو میلوں کی دوری پر کسی اور کہکشاں میں ہے۔'' زرمینے گہرے دکھ سے بولی۔
''تمہارے لبوں پر نسوانیت کا قفل سجا ہے' تو کیا ہوا؟ تمہاری بولتی آنکھوں میں پنہاں شدتوں سے کیوں بے خبر ہے وہ؟ کیوں اُسے تمہاری بولتی ہوئی خاموشیاں نظر نہیں آتیں۔ اور تم بے وقوف لڑکی' کیوں سالوں سے اُسے اپنے دل میں آباد کیے ہوئے ہو؟ تیمور خان کی بے نیازی پر تو وہ غصہ تھی ہی' لیکن فروا کی خاموشی اور بے بسی بھی اُسے طیش دلا رہی تھی۔ سو وہ یکدم اُس پر برس پڑی۔
''ہاں سب لاحاصل ہے۔'' فروا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سج گئی۔
''بھول جاؤ اُسے......'' زرمینے سنگ دل بن گئی' جانِ عزیز دوست کی مزید بے بسی و دل آزاری گوارہ نہ تھی۔
''کیسے؟'' بالآخر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔
''کیسے بھولوں اُسے؟ وہ ہر سانس میں شامل ہے۔ اُس کے بنا میری سانسیں رُکنے لگتی ہیں۔'' وہ دیوانگی سے بولی۔
ایسا عشق......!

ایسی شدتیں......!

ایسا پاگل پن......!

زرمینے انگشت بدنداں رہ گئی۔ کئی ساعتوں تک اُس کی سانس سینے میں اٹکی محسوس ہوئی۔ زبان گویا تالو سے چپک کر رہ گئی۔ وہ ٹرانس کی کیفیت میں چلتی ہوئی فردا کے قریب آئی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا۔

''خود کو سنبھالو پلیز۔'' فردا کو گلاس تھماتے ہوئے وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

وہ صحراؤں کی سی پیاسی تھی' ایک ہی سانس میں پورا گلاس پانی پینے کے بعد اُسے لگا کہ اُس کے اندر کی تلخی قدرے کم ہو گئی ہے۔

''آئی ایم سوری...... میں نے تمہیں بھی پریشان کر دیا......'' شرمندگی سے کہتے ہوئے اُس نے گلاس واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھا تو بے دھیانی میں اُس کا ہاتھ ٹیبل پر پڑی خوبصورت تصویر سے ٹکرایا۔ جو لمحوں میں زمین بوس ہو کر کرچی کرچی ہو گئی۔

زرمینے بھی بوکھلا گئی۔

''چچ...... چچ......'' اُس کے منہ سے تاسف سے نکلا۔ وہ اُس کے اور تیمور کے بچپن کی تصویر تھی۔ وہ صرف ایک تصویر نہیں تھی' اُس کی متاعِ جاں تھی۔

''یہ کیسے ٹوٹ گئی؟ کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔'' فردا تو جیسے اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اُس کا پاگل پن زرمینے کو وحشت زدہ کر رہا تھا۔

''فردا...... ہوش میں آؤ...... غلطی سے ٹوٹ گئی ہے۔ فضول کے وہم مت پالو......'' زرمینے نے سختی سے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''نہیں...... نہیں...... وہاں...... تیمور ضرور کسی مشکل میں ہے۔'' وہ جیسے اُسی لمحے کی قید میں تھی۔

معاً موبائل کی بیپ سنائی دی۔ اُس نے لپک کر فون اٹھایا۔

''تیمور کا فون ہے؟'' وہ بڑبڑائی۔ فون کی اسکرین پر بلنک ہونے والا نمبر پریشے کا تھا۔ زرمینے نے اُس کے ہاتھ سے فوراً موبائل لے لیا۔

''ہیلو...... پریشے! میں زرمینے بات کر رہی ہوں۔'' اُس نے لمحوں میں خود کو کمپوز کیا۔ لیکن دوسری طرف سے سننے والی خبر نے جیسے اُس پر سکتہ طاری کر دیا۔

اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے خوفزدہ ہو کر فردا کو دیکھا۔

فردا کی چھٹی حس کسی انہونی کا پتہ دے رہی تھی' اُس نے فون جیسے زرمینے سے جھپٹا۔

''پری...... تیمور کہاں ہے؟'' وہ بے صبری سے بولی۔

''گولی لگ گئی۔'' اُس کی سماعتوں نے مزید کچھ سننے سے انکار کر دیا' موبائل اُس کے ہاتھ سے گر کر قالین پر پڑا تھا۔

وہ بے جان سی جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔

(اس دلچسپ ناول کی دوسری قسط آئندہ ماہ پڑھیے)

ناقابل یقین کہانیاں

ایسی کہانیاں جو انسانی عقل اور سوچ سے ماورا ہیں

شاہ مراد

شوکت زیدی کا خیال

خوف کیا طلاطم کا ڈر کسے طوفان کا
آندھیوں کے دامن میں اپنا آشیانہ ہے

تبسم زہرا رضوی

جب سے اماں حویلی سے لوٹی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا؟ میرے پوچھنے پر بتایا کہ طبیعت

اچھی نہیں ہے۔ میں نے پیشانی چھو کر دیکھی تو گرم تھی۔

''تو کھانا کھالے حویلی سے لائی ہوں۔''

کھانا تو اماں روز ہی لاتی تھی پر اُس کا چہرہ اس طرح نہیں ہوتا تھا' صحت بھی اس کی کچھ دنوں سے خراب تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی اور بات ہے جو اماں مجھ سے چھپا رہی ہے اور وہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

میں اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

''بس......'' اُس نے کراہ کر کہا۔

''تجھ سے کہہ رہی ہوں کھانا کھالے ابھی گرم ہے۔''

''کھالیتی ہوں پر تُو تو اٹھ کھڑی ہو؟''

میری بات کے جواب میں لگا کہ بہت بری طرح ٹھنڈی سانس اس کے کلیجے سے نکلی ہو' شاید اُسے رونا بھی آ رہا تھا۔ میں نے اسے حکیم جی کی دوا پلائی اور اسی کے پاس لیٹ کر سوگئی' اس بات سے بے خبر کہ آج آخری بار یہ نرم آغوش' یہ جنت' یہ دنیا کا مضبوط ترین رشتہ' یہ چین و آرام سب کچھ ساری نعمتیں آج آخری بار مجھے مل رہی ہیں۔ آج کے بعد زندگی کے کانٹے ہوں گے اور میں...... یہ چھپر تو وہ چھاؤں ہے جب سر کتا ہے تو پتہ چلتا ہے۔

دوسرے دن ماں کام پر جانے کو حسب معمول سویرے تیار تھی۔

''اماں تجھے رات بھر بخار رہا ہے۔''

''کیا کروں؟ جاؤں گی نہیں تو کھائیں گے کہاں سے' تو اچھی طرح دروازہ بند کرلے۔'' پھر لمحہ بھر رُکی کچھ سوچ کر بولی۔

''اگر کوئی کتنا بھی کھڑکائے تو نہ کھولنا۔'' یہ کہہ کر اماں چلی گئی۔

میں اب بچی نہیں رہی تھی سترہ اٹھارہ سال کی خوبرو دوشیزہ تھی' میں نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور گاؤں میں کالج نہ ہونے کی وجہ سے آگے نہ پڑھ سکی تھی اور نہ ہی کوئی پڑھانے والا تھا۔ ورنہ تو میری سہیلی رانو کا داخلہ ساہیوال کالج میں ہوگیا تھا۔ جہاں اُس کی خالہ کا گھر تھا۔ وہ وہاں رہنے لگی تھی' میرا تو کوئی بھائی وغیرہ تھا نہیں' میرا ابا غنی کھوسہ میری پیدائش سے پہلے مرگیا تھا۔ گھر میں جب ابا کا ذکر آتا اماں بالکل خاموش ہوجاتی تھی کچھ تو ایسی بات تھی کہ مجھے لگتا کہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اور پھر ایک مرتبہ پڑوسن خالہ سے باتیں کرتے میں نے اتنا سنا تھا۔

''یہ میرے غنی سے نہیں ہوئی پر مجھے تو اپنے جسم کا حصہ لگتی ہے۔''

''ہائیں تو کیا میں اس کی بیٹی نہیں ہوں؟''

میں نے جب ماں سے پوچھنا چاہا تھا تو اس نے دو تین دھموکے جڑ دیے تھے۔ اس وقت میں چھوٹی تھی اور ماں نے میرے اوپر کبھی ہاتھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ میں ڈر گئی تھی اور یہ سمجھی تھی کہ یہ کوئی بہت بری بات ہے۔

ہمارا محلے میں میل جول کم تھا نہ کوئی ہمارے گھر آتا نہ ہم کسی کے گھر جاتے' میں اسکول کے بعد گھر میں سلائی کڑھائی کرتی' اماں چوہدری کے گھر کھانا پکاتی تھی' شام کو لوٹتی تو اچھا خاصا کھانا لے آتی' خوب مزے سے جی بھر کر کھاتے' باقی فریج میں رکھ دیتے پھر شام کے لیے کھانا آجاتا' کبھی گھر میں بھی پکا لیتے تھے' اماں کے جانے کے بعد میں صفائی کر کے گھر چمکا دیتی تھی۔

ہمارا گاؤں کافی ترقی یافتہ تھا' ہر سہولت تھی' پر ہمارا گھر لوگوں کے گھروں سے کافی پیچھے تھا۔ اُن

کے گھروں کے مرد دبئی شارجہ سے پیسہ بھیجتے تھے شہر میں نوکریاں کرتے تھے۔ ہم تو بس ماں بیٹی ہی تھیں ماں کو جو کچھ تنخواہ کے نام پر ملتا تھا وہ اُس سے میرا جہیز جوڑ رہی تھی' چیچا وطنی کے کھیس' پیڈسٹل فین 'سونے کا خوب بھاری سیٹ جو شاید اُسی کا تھا اور سونے کی ہی بھاری پازیب جسے اُس نے کمرے میں گڑھا کھود کر چھوٹی مٹکی میں رکھ کے دبا دیا تھا اور مجھے ہدایت کی تھی۔ ''خبردار کسی کو نہ بتانا۔''

ایک دن ہمارے گاؤں میں میڈیکل کیمپ لگا تو میں اور اماں بھی چلے گئے۔ میری نظریں خون گروپ پر تھیں' اماں کا اور میرا خون گروپ ایک ہی تھا ایک اور اہم بات یہ تھی کہ میں ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ بالکل اُس کی جوانی کی تصویر' جوان تو وہ اب بھی تھی۔ پر وقت اسے لے ڈوبا تھا' نہ شوہر کا راج دیکھا' نہ گھر کی خوشیاں' لگتا تھا پتہ نہیں کتنے غم کے طوفان اپنے اندر چھپائے پھرتی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ کہا بھی تھا۔

''اماں اب میں بچی نہیں ہوں' تو کم از کم اپنے دل کی بات مجھ سے تو کہہ؟'' مگر وہ ہنس کر ٹال جاتی تھی۔ خیر میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی تو اس بات سے بے خبر تھی کہ گزری رات میری اور اماں کے ساتھ آخری رات ہے' مجھے دروازہ نہ کھولنے کی ہدایت کر کے جانے والی ماں جب واپس لوٹی تو اس کی حالت بہت خراب تھی وہ بڑی مشکل سے دروازے سے اندر آئی۔ میں نے سہارا دیا وہ بالکل یخ ہو رہی تھی۔ صحن کے کونے میں جا کر اُسے خون کی دو بڑی قے ہوئیں۔ اس نے کلمہ پڑھا اور ختم......

پڑوسن خالہ میرے چیخنے پر آ گئیں تھیں پر وہ بھی سہمی ہوئی تھیں۔ رات کو جنازہ اٹھ گیا۔ اگلے دن میری سگی خالہ دوسرے گاؤں سے آ تو گئی پر اس کی بھی حالت بڑی خراب تھی۔ اُسے گردن توڑ بخار ہوا تھا۔ اس کے گھر والے کچھ ہی دیر میں اُسے واپس لے گئے۔ پھر میں اکیلی ہو گئی گزری کل تو پھر بھی پڑوسن خالہ میرے ساتھ سو گئی تھیں اب انہوں نے صاف کہہ دیا۔

''یہ تو روز کی کہانی ہے بس تو آج سے ہی اکیلی سونے کی عادت ڈال لے' ہم اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھیں گے' پر تیرے گھر میں سو نہیں سکتے۔'' یہ لوگ میرے گھر میں رہنے اور سونے سے کیوں ڈرتے تھے یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا۔

اب گھر میں طرف سناٹا تھا اور میرا ناتواں وجود' ماں کی چارپائی ایک طرف کھڑی تھی اور مجھے اس کی ایک ایک بات رُلا رہی تھی۔ پھر پتہ نہیں میں کب سو گئی تھی۔ اور وہ آ گئے تھے جی وہ...... میرے بابا شاہ مراد جی' ملے تو وہ مجھے پہلے بھی تھے اور میں نے ماں کو اُن کے بارے میں بتایا بھی تھا' مگر وہ ہنس کر ٹال گئی تھی۔

یہ بابا شاہ مراد مجھے پہلی بار تب ملے تھے' جب میرا میٹرک کا امتحان تھا' میرا اسینٹر دوسرے گاؤں میں پڑا تھا اور واپسی میں مجھے اور میری سہیلی رانو کو دیر ہو گئی تھی۔ ہم بس سے اُترے تو سب تانگے جا چکے تھے' رکشے بھی نہیں تھے' اللہ کا نام لے کر ہم پیدل چل پڑے تھے اتنے میں رانو کا بھائی موٹر سائیکل لے کر آ گیا تھا' اس کے پیچھے اس کی ماں بھی بیٹھی تھی' اور رانو تو اپنے گھر والوں کے ساتھ یہ جا وہ جا' میں خوف کی ماری گھر کی طرف تیز قدموں سے چل دی تھی' میں نے اچانک ایک طرف دیکھا تھا تو ایک سفید پوش بابا جی ساتھ چل رہے تھے اور وہ شفقت بھری آواز میں بولے تھے۔

''ہم ساتھ چل رہے ہیں۔'' اور پھر جب

مجھے اپنا گھر نظر آیا تھا تو وہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اُس رات میں نے انہیں دوبارہ دیکھا بہت نورانی صورت تھی۔

''ہم شاہ مراد ہیں' جن کا تم لوگ طاق بھرتے ہو' تم پریشان نہ ہو' اللہ نے ہمیں تمہاری حفاظت کے لیے مقرر کیا ہے۔ ہم اپنی بیٹی کو بہت چاہتے ہیں۔ بس تم ہمارا فاتحہ دلایا کرو۔'' پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔

گاؤں میں ایک چھوٹا سا حجرہ تھا' کہتے تھے کہ بابا جی نے یہاں مراقبہ کیا تھا۔ اُن کی قبر مرقد تو بہت دور کسی دوسرے شہر میں تھی۔ جہاں عرس کی تاریخوں میں لوگ بیل گاڑیاں سجا کر بڑے اہتمام سے عرس منانے جایا کرتے تھے۔ اس وقت گاؤں میں میلے کا سماں ہوتا تھا۔ گاؤں کے بڑے کہتے تھے' پہلے گاؤں والوں کو پانی کے لیے بڑی پریشانی ہوتی تھی' بابا نے چشمے کے لیے چلا کیا تو چشمہ جاری ہو گیا تھا۔

خیر جاگنے پر میرا دل ذرا بھی نہ گھبرایا' بلکہ ایسا اطمینان ایسا سکون نصیب ہوا تھا جو شاید مجھے زندگی میں کبھی بھی نہیں ملا تھا۔ اوپر والی ذاتِ پاک کے بعد جیسے کسی وجود کی ڈھارس ملی' دل میں پکا فیصلہ کر لیا کہ اب میں نماز کی مکمل پابندی کیا کروں گی۔

اب ایک بہت بڑا مسئلہ تھا کھانے کا' ابھی تک تو محلے سے کھانا آ رہا تھا' چوہدری کی حویلی سے تو اتنا آیا کہ سارے محلے نے کھایا یہ بھی کہا کہ چالیس دن تک آئے گا۔ چوہدرانی جی بھی آئی تھیں' میں نے منع کر دیا تھا کہ اب کھانا نہ بھیجیں ضائع ہوتا ہے۔ اصل میں مجھے شرم آتی تھی' اُن کا ملازم کھانا لاتا تو اس کی حریص نظریں میرے اوپر لگی رہتیں' منع کرنے پر اُس کا آنا بند ہو گیا تو سکون ہوا' لیکن اب سوال یہ تھا کہ زندگی گزاروں گی کیسے' امی جہاں پیسے رکھتی تھیں دیکھا تو اچھی خاصی رقم تقریباً ایک لاکھ روپے موجود تھے مگر کب تک ساتھ رہیں گے' پھر کیا ہوگا؟''

پھر ایک روز حویلی سے وہ ملازم آیا اور بولا۔

''چھوٹے چوہدری رب نواز جی کہہ رہے ہیں کل سے تو اماں کی جگہ کام پر آجا؟''

مجھے غصہ آیا لیکن میں نے ٹھنڈے دل سے کہا۔

''ابھی میری حالت ٹھیک نہیں' میں کچھ دن میں سنبھل جاؤں گی تب سے آیا کروں گی' جب تک کسی اور کو رکھ لیں۔'' پہلا زمانہ ہوتا تو شاید چھوٹے چوہدری رب نواز کے بندے میرا قیمہ بنا دیتے' لیکن اب اخبار ٹی وی کی وجہ سے ایسے لوگ بدل تو نہیں سکتے' ہاں ذرا سنبھل کے وار کرتے ہیں۔

چند دن گزرے تو مراد شاہ کا عرس بھی آ گیا' وہاں جانے کے لیے بیل گاڑیاں تیار ہو رہی تھیں' جانا تو چوہدری رب نواز کو بھی تھا' پر اپنی کار میں جا کر اُسے رات کو واپس آ جانا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اماں تو ہے نہیں' میں کس کے ساتھ جاؤں کہ رالو آ گئی۔

''تو بھی ہمارے ساتھ چل' میری امی تجھے اپنے ساتھ بٹھائیں گی۔'' یوں میرا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

ابھی جانے میں ایک دن تھا رات ہو گئی تھی۔ میں اماں کو یاد کرتے ہوئے سو گئی تھی کہ اچانک دھم سے ایک آواز آئی تھی جس سے نہ صرف میری آنکھ کھل گئی بلکہ میں لرز کر رہ گئی۔ یہ چھوٹا چوہدری رب نواز تھا جو میرے گھر کی دیوار

پھلانگ کے آیا تھا' میرے اوسان خطا ہو گئے۔

''کب تک بچے گی ہم سے' تجھے پتہ نہیں ہم کون ہیں؟ راجہ ہیں ہم گاؤں کے' اور آج تیرے بھی بن جائیں گے۔''

اُن دنوں سردی پڑ رہی تھی' میں کمرے میں سونا چاہتی تھی' لیکن خوف کی وجہ سے صحن میں سو جاتی تھی کہ میرے چیخنے پر شاید لوگ میری مدد کے لیے آ جائیں' میں چیخنا چاہ رہی تھی مگر میری آواز نہیں نکل رہی تھی کہ اچانک اُس وقت ایک عجیب بات ہوئی' وہ ملعون میری طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ پکی سیمنٹ بجری سے بنا ہوا زینہ لرز گیا۔ دھم دھم یوں لگا منوں وزنی وجود اُس سے نیچے آ رہا ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ بابا شاہ مراد انتہائی غیض و غضب میں نیچے اتر رہے تھے۔

''او نابکار' اپنا ناپاک وجود لے کر دفع ہو جا۔ اور اس چوہدری کی اولاد کے مددگار بھوتوں کے چیلے تو کہاں چھپ رہا ہے۔'' اور اس وقت سچ مچ ایک بھوت دیوار سے اندر آ گیا۔

''ہم سے بات کر شاہ مراد' یاد ہے ایک مرتبہ پہلے بھی ہمارا تیرا مقابلہ ہوا تھا؟''

''اور منہ کی کھائی تھی۔'' بابا جی کا جواب آیا۔

چیلے نے ''لے سنبھل......'' کہہ کر ایک روشن گولہ بابا جی کی طرف اچھال دیا تھا وہ اُن کے چہرے کی طرف چلا تھا' مگر بابا کے فوراً پھونک مارنے پر دوگنی تیزی کے ساتھ پھر اُسی بھوت کی طرف آیا تھا اور وہ ہائے ہائے کرتا بھاگا تھا اور اس کے پیچھے چوہدری رب نواز بھی بھاگ گیا تھا اور میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی' لیکن بابا جی کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''ضروری سامان لے لو اور ہمارے مزار کی طرف چلی آؤ' اب تمہارا دانہ پانی یہاں سے اٹھ گیا ہے۔''

میری ہوش کی دنیا میں واپسی ہوئی کچھ دیر بے دم پڑی رہی پھر اٹھ کر نماز کے بعد ایک چھوٹا ٹین کا بکس تھا اُس میں چند جوڑے کپڑے رکھے' کمرے کا فرش کھود کر مٹکی میں سے زیور وغیرہ نکال کر بکس میں رکھ لیا' رقم رکھی اور چھوٹا سا بستر بھی باندھ لیا' کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا۔

اپنا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا' یہ میرا گھر تھا' میری ماں کا گھر یہاں میں پیدا ہوئی تھی' یہاں میں نے گڑیوں کے بیاہ رچائے تھے' اور اب میں یہاں سے جا رہی تھی' گھر تو جانور کو بھی پیارا ہوتا ہے' اُسے چھوڑنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے' یہ اذیت وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے اپنا گھر چھوڑا ہو۔

صبح نمودار ہو رہی تھی' بیلوں کو نہلا دھلا کر گاڑیوں میں جوتا جا رہا تھا' عورتیں بچے بیٹھ رہی تھیں' اور مزے کی بات یہ تھی کہ سب نے سفید ٹوپی والا برقعہ پہنا تھا شاید اپنی نانی دادی کے زمانے کا' اِس بات کی سختی سے ہدایت تھی کہ اماں بھی ایسا ہی برقعہ اوڑھ کر جایا کرتی تھی' مرد تہمند' کُرتا پہنتے تھے' عید والا سماں ہوتا تھا' سب بہت خوش نظر آتے تھے' میں بھی برقعہ اوڑھے کاندھے پر بڑا پرس اور ہاتھ میں ٹین کا بکس لیے' رانو کے ساتھ بیٹھ گئی تھی' باقی سامان' سامان والی گاڑی میں رکھ دیا تھا' سالار نے سیٹی بجائی اور قافلہ چل پڑا تھا۔

میں بچپن سے ہر سال وہاں جاتی تھی لیکن جب ہم بابا کے مہمان بن کے جاتے تھے اب تو دل کی حالت عجیب تھی کہ پتہ نہیں تقدیر کہاں لے

جاتی ہے' صبح کے چلے شام ہونے کو آئی۔ راستے میں پھوار پڑنے لگی تھی پر گاڑی پر سائبان تھا۔ تھوڑی دیر انجوائے کیا پھر خالہ نے خالو کو آواز دی اور انہوں نے چھتری پر ترپال ڈال دی کیونکہ اب بارش تیز ہو رہی تھی' کاش ایسا ہی سائبان میری زندگی میں بھی ہوتا' انسان کتنا ناشکرا ہے سائبان اگر نہیں ہے تو بابا جیسی نعمت؟ بس یقین کی بات تھی' لیکن تھی...... اب دور شاہ مراد بابا کے دربار کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور پھر ہم دربار میں پہنچ گئے تھے وہاں قوالی ہو رہی تھی' لنگر چل رہا تھا۔ سبیلیں لگی تھیں۔ لوگ فاتحہ خوانی کر کے کھانے پینے میں مشغول ہو گئے تھے۔

ہمارے گاؤں سے بھی چادر گئی تھی' جو بہت زور و شور سے چڑھائی گئی۔ لنگر بھی بانٹا جا رہا تھا۔ پھر میں رانو کو لیے اوپر چلی آئی۔ دور ٹرین جاتی نظر آ رہی تھی پھر وہ رک گئی۔ ہمارے ساتھ گئی مقامی عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے کہا

''یہاں اسٹیشن تو ہے نہیں' پھر ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ شاید آگے سگنل نہیں ہوگا۔ اس لیے رکی ہے۔ پھر میں رانو کو لیے اُس کی ماں کے پاس چلی گئی تھی اور وہیں عورتوں میں ایک طرف پڑ کر سو گئی تھی' نیند بڑی گہری آئی تھی میں پتہ نہیں کب کی تھکی ہوئی تھی یا ذہنی سکون پایا تھا' کیونکہ جب ہم درگاہ پہنچے تو کسی نے پوچھا تھا۔

''چوہدری رب نواز نہیں آئے؟'' جواب ملا تھا۔

''اچھے بھلے تھے پتہ نہیں کب بخار ہو گیا' جب ہم آئے تو بے ہوش پڑے تھے' ورنہ سب سے پہلے وہی تو آتے تھے۔'' یہ بات سن کر میرے اندر سکون اتر آیا تھا۔

میں بے خبر سو رہی تھی بابا جی کے آستانے پر کہ اچانک میرے کانوں میں بابا جی کی آواز آئی۔

''ارے بیٹی اتنی بے خبر سو رہی ہو' ابھی تو تمہیں سفر کرنا ہے' بڑا سفر' اٹھ بیٹھو' اور بیٹی ہمارا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا' آج تم سے ہماری آخری ملاقات ہے' چلو تمہیں چھوڑ آئیں۔''

''کہاں بابا؟'' میں دہل ہی تو گئی تھی۔

''پریشان نہ ہو بیٹی' تم بہت اچھے ہاتھوں میں جانے والی ہو' اٹھو تہجد کی نماز ادا کرو اور سامان اٹھاؤ۔''

میں نے نماز ادا کی خانقاہ میں سناٹا تھا' سب لوگ پڑے سو رہے تھے' عورتیں زنانے حصے میں اور مرد مردانے میں' میں نے اپنا بکس لیا' پرس کاندھے پر ڈالا برقعہ اوڑھا اور مختصر بستر سنبھالتی چلی آئی' ایسا خوفناک اندھیرا میں نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا' چاروں طرف ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا' پگڈنڈی تھی اور میرا جوان و خوبصورت وجود برقعہ میں پوشیدہ دور کہیں سیار بولا اور میں ڈر گئی۔

''یااللہ......''

''ارے ڈرو نہیں' ہم چھوڑنے آ رہے ہیں اپنی بیٹی کو۔'' میرے آگے چلتے بابا نے کہا تھا۔

اب مجھے دور ٹرین نظر آئی تھی۔ وہ یہاں رُکتی نہیں تھی میرے لیے روکی گئی تھی۔ اب مجھے رونا آ گیا میں سردی میں پسینے پسینے ہو رہی تھی۔

''ارے بیٹا' آگے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔''

''آپ تو ہوں گے نا؟''

میں نے اللہ کے حکم سے عبداللہ بھائی کو کہہ دیا ہے وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔ میں ٹرین کے قریب آ گئی۔

''جاؤ بیٹا! اللہ تمہارا نگہبان اللہ حافظ و ناصر۔''

میرے سامنے جو دروازہ تھا' میں اُس پر چڑھ گئی' میرا سامان بھی کسی نے اوپر رکھ کے میرے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرا تھا کہ جیسے باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتا ہے۔ ریل چل پڑی تھی' یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا۔ سب مسافر تقریباً سوئے ہوئے تھے' ایک دو خواتین اونگھ رہی تھیں' پھر ایک خالی سیٹ پر میں نے بھی ٹھکانہ کرلیا' بکس پیروں میں رکھا پرس بغل میں اور اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر بے خبر سوگئی تھی آنکھ کھلی تھی تو خواتین کی باتوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ کراچی بس آ ہی گیا ہے۔

اس دوران میں دو خواتین کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُن میں سے ایک آنٹی کراچی میں کوئی NGO چلاتی ہیں۔ بے سہارا خواتین کو سہارا دیتی ہیں اُن سے کام لیتی ہیں۔

میں اُن کے پیچھے ہولی۔

''باجی مجھے لے چلیں میں آپ کے کام کردوں گی۔''

''مجھے پہلے ہی شک تھا تم گھر سے بھاگی ہو؟''

''نہیں باجی میرا اپنا گھر ہے یہ دیکھیں چابیاں۔'' میں نے اپنا پرس کھولنا چاہا۔

''رہنے دو چلو میرے ساتھ' میرا نام راحت ہے۔'' اور مجھے لے کر اسٹیشن سے باہر آکے ایک گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ وہ کلفٹن میں رہتی تھیں۔ راستے میں ایک مزار آیا۔

''سلام بابا جی ...... یہ عبداللہ شاہ غازی کا روضہ ہے' ہم نے تمہیں اللہ کے بعد عبداللہ بھائی کے حوالے کردیا ہے۔''

میرے کانوں میں آواز گونجی میں نے بھی سلام کرلیا۔ ڈرائیور راحت باجی سے پیسے لے کر بھاگتا ہوا مزار کی صندوقچی میں ڈال آیا پھر گھر آگیا تھا۔ یہ ایک بڑی سی کوٹھی تھی' لیکن وہاں صرف راحت باجی اور اُن کے میاں رہتے تھے جو کہ وہیل چیئر پر تھے۔

''آپ خیریت سے رہے؟''

''ہاں خدا کا شکر ہے۔''

''میں آپ کی وجہ سے جتنی جلدی ہوسکا آئی ہوں۔'' راحت باجی نے کہا تھا۔ وہ اپنی بہن کی بیٹی کی شادی میں لاہور میں گئی تھیں۔

''دیکھو میں آپ کی طرف سے پریشان تھی کہ نسرین کی شادی ہوگئی ہے۔ تو آپ کا خیال کون رکھے گا۔ بابا جی سے کہہ دیا تھا دیکھیے آئی تو ساتھ لائی ہوں۔'' یہ بات سن کر وہ خوب ہنسے' آنٹی راحت باجی تو پیروں فقیروں کی معتقد تھیں' پر وہ پیری مریدی والے تھے نہیں' لیکن میاں بیوی میں محبت بہت تھی۔

راحت باجی کے میاں ریٹائرڈ کمشنر تھے' وہ ایک حادثے میں معذور ہوگئے تھے۔ اُن کے چار بچے تھے' دو بیٹے دو بیٹیاں سب امریکہ میں ہوتے تھے' اُن کی' اُن کے بچوں کی تصویریں ہر طرف لگی تھیں' ہم نہا دھو کر چائے پی رہے تھے' راحت باجی نے مجھ سے بہت سے سوال کیے تھے۔ پھر وہ مطمئن ہوگئی تھیں' وہ حسن پرست بھی تھیں' اور میں حسن کا مرقع' مجھے انہوں نے اپنے برابر والا کمرہ دیا تھا۔

رات کو کھانے کے بعد میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی' پھر مجھے اپنے بکس کا خیال آیا تھا' سوچا کھول کر دیکھوں سب سامان سلامت ہے' بکس کھولا پھر زیور کی پوٹلی کھولی سب کچھ موجود تھا' لیکن اس میں تین صفحات پر مشتمل

ایک خط بھی تھا' کئی جگہ سے روشنائی مٹی ہوئی تھی جیسے لکھنے والا کئی مرتبہ رویا ہو۔ میں نے اپنی ماں کو کبھی لکھتے پڑھتے تو دیکھا نہیں تھا ہاں البتہ یہ پتہ تھا کہ وہ پانچ جماعت پاس ہے۔ رائٹنگ کچی تھی' لیکن اُس کو پڑھنے کے دوران میں کئی مرتبہ ہچکیاں لے لے کر روئی؟ خط کیا تھا ماں جو بات کبھی نہ کہہ سکی' اس کو اس طرح بیان کیا تھا کہ مجھے رُلا رُلا دیا تھا۔

بیٹی فریحہ فاطمہ! جس وقت یہ خط تجھے ملے گا' میں تجھ سے دور بہت دور جا چکی ہوں گی۔ جب تو مجھ سے اپنے بارے میں سوال کرتی تھی تو میرے پاس جواب اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ اگر میں سچے جواب دے دیتی تو گنڈاسے کلہاڑیاں چل جاتیں' سُن تو میری بیٹی تو ہے مگر اپنے ابے غنی کھوسہ کی اولاد نہیں ہے' تو بڑے چوہدری شاہنواز کی بیٹی ہے' جس کا سگا بھائی رب نواز تجھ پر نیت خراب کر رہا ہے' میں جوان تھی جب غنی کھوسہ نے مجھے دیکھا اور دل دے بیٹھا اپنے ماں باپ کو لا کر رشتہ مانگ لیا۔ اِس رشتے پر ہم بہت خوش تھے' وہ خوبرو تھا تو میں بھی بہت خوبصورت تھی' شادی کے بعد ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر زندگی میں ہمیں کچھ وقت ہی خوشی مل سکی' ورنہ تو پھر گردشیں تھیں اور میں...... میں بیاہ کر اپنے پنڈ آئی تو ایک روز میں اپنے میاں کے ساتھ چاندنی رات میں تیار ہو کر فصل دیکھنے چلی گئی' وہیں چوہدری شاہنواز بھی اپنی کار میں آیا ہوا تھا' پھر اس کے چند دن کے بعد شور ہوا کہ کسی نے غنی کو کھیتوں میں قتل کر دیا؟ اِس کے بعد تو صدمے کا لفظ تھوڑا ہے۔ تیری دادی چوہدری کے گھر کھانا پکاتی تھی' پھر اُس نے مجھے وہاں بھیجنا شروع کر دیا' تیری دادی دادا کو جو تیرے اصل میں کوئی نہیں

تھے' چوہدری نے حج پر بھیج دیا' جو پھر کبھی واپس نہیں آئے اور نہ کوئی اُن کا پتہ کرنے والا تھا۔ اب میں گھر میں اکیلی سوتی تھی' پھر ایک رات کو چوہدری شاہنواز ہمارے گھر میں رات کو کود آیا' وہ نشے میں تھا اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چل میرے گھر!''

میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''چوہدری جی' میں کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی بس آپ میرے ساتھ نکاح کر لو' پھر میں آپ کی ہو جاؤں گی۔'' چوہدری نے میرا ہاتھ پکڑا مولوی کے گھر لے گیا اور اِس کے دروازے پر دستک دے دی۔ وہ بے چارہ اپنی بیٹھک میں سو رہا تھا۔ چوہدری نے حکم دیا تھا۔

''ہمارا نکاح پڑھا دے۔''

''سائیں صبح کا انتظار کر لیں چار بندے آ جائیں۔'' چوہدری نے اُسے گالیاں بکنی شروع کر دیں' تو مولوی کے دو بھائی اٹھ کر آ گئے اور انہوں نے اپنے بھائی کو سمجھایا...... جب نکاح ہو گیا تو چوہدری نے پستول نکال کر مولوی پر چلانا چاہی۔ پر میں آڑے آ گئی اور مولوی نے بھی پاؤں پکڑ لیے تھے۔ چوہدری شاہنواز میرا ہاتھ پکڑ کر میرے گھر لے آیا تھا' پھر کوئی ہفتہ بھر بعد اُس کا لندن کا ویزہ آ گیا تھا۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ کچھ دنوں بعد الیکشن ہونے والے تھے' مگر اُن کے مخالف بھی تگڑی پارٹی تھے۔ سو معاہدہ ہو گیا اور وہ چلا گیا' اِدھر تُو میرے پیٹ میں آ گئی تھی' مگر میں دنیا کی نظر میں بیوہ تھی' اپنی پریشانی میں' لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی' میں چار ماہ تک تو اپنے گھر رہی پھر ماں کے گھر چلی گئی اِس کو صورت حال کا اندازہ ہوا تو وہ مجھے لے کر کہیں دور جانے والے کے چلی گئی تُو وہیں پیدا ہوئی

"تھوڑے عرصے بعد میں نے تجھے بوتل سے دودھ دینا شروع کیا۔ اور تجھے لے کر اپنے گھر لوٹ آئی' لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ میری بہن کے ہاں جڑواں بیٹیاں ہوئی تھیں' میں نے ایک لے لی ہے' مگر ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں' غنی کے قتل سے پڑوسی ڈر گئے تھے۔ پھر ان سب نے ہم سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ میرا جینا بڑا مشکل ہو گیا' میں پھر چوہدری کے گھر کھانا پکانے لگی تھی' تجھے پالنا آسان نہ تھا دنیا کے سامنے بن باپ کی بیٹی مگر زندہ باپ کی یتیم بیٹی' مگر یہ مصیبت گزر گئی' لیکن اب بڑی مصیبت اور قیامت یہ ہے کہ جو خبیث تجھ پر آنکھیں گاڑے بیٹھا ہے' وہ تیرا سگا چچا ہے' میرا دل چاہتا ہے زہر کھالوں' لیکن مجھے لگتا ہے اُس کی نوبت ہی نہیں آئے گی' یہ لوگ خود مجھے راستے سے ہٹا دیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں اور کیا نا کروں' تیری بدنصیب ماں صغریٰ بانو۔"

☆......☆......☆

میرے ذمے پاپا کی خدمت تھی۔ وہ بہت اچھے تھے بیٹی کہتے تھے تو بیٹی سمجھتے بھی تھے۔ مجھے یہاں آئے ہوئے سال ہو رہا تھا اب میں یہاں کے ماحول میں رچ بس گئی تھی اور بہت خوش تھی' نہ کسی سے مطلب' نہ واسطہ' نہ کھوج' نہ چھان بین بس اپنے کام سے کام' لیکن کبھی کبھی آس پاس نظر رکھنی بھی ضروری ہوتی ہے۔ جس طرح میرے ساتھ ہوا۔

ایک دن میں نے راحت باجی سے پوچھا۔

"ہمارے پڑوس میں کون رہتا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟" میرے سوال پر وہ دنگ رہ گئیں اور میں بھی شرمندہ ہو گئی' اور پھر چند دن بعد مجھے پتہ چلا کہ شرمندگی کہتے کسے ہیں۔ جب میں راحت باجی کی سیاہ شیشوں والی گاڑی سے اتر رہی تھی اور اپنے عاشق' یا اپنے سگے چچا کو پڑوس کی کوٹھی والے گیٹ میں جاتے دیکھا' ماسی کے ذریعے پتہ چلا کہ یہ اُن ہی کی کوٹھی ہے۔ اب میں تھی اور دل میں انتقام کے شعلے......

راحت باجی کے دو بیٹے تھے' اقتدار شاہ' مرتضیٰ شاہ' بیٹیاں ربیعہ شاہ مدیحہ شاہ تو بھائی اقتدار شاہ تو اپنی فیملی میں مگن تھے' پر مرتضیٰ شاہ کی بیگم جو انگریز تھیں۔ اُن سے شادی ناکام ہو گئی اب سب امریکہ سے پاکستان گھر آئے تو میں مرتضیٰ شاہ کو اور مجھے وہ بھا گئے' میرے اور مرتضیٰ کے تعلق سے خوش تو راحت باجی بھی نہیں تھیں۔ مگر پاپا نے تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا میں تو پاپا کو بالکل اپنے باپ کی طرح چاہتی تھی۔

"بے نصب' بے نام' بے نشان لوگوں سے رشتہ جوڑلوں' ناممکن' بہت مل جائیں گے میری وہیل چیئر دھکیلنے والے۔"

اِدھر مرتضیٰ مجھ پر لٹو تھے جیسے ہی تنہائی ملی صاف بات کی کہ "اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں تمہیں اپنا بناؤں گا۔"

ہم کلفٹن پر رہتے تھے یہاں ہندو جاتی کے بہت لوگ رہتے تھے' تہواروں کے دنوں میں تمام کراچی سے گاڑیاں بھر بھر کر پوجا کے لیے لوگ آتے' یہاں مندر بھی تھے' سب ہندو مسلم آپس میں سلوک و محبت سے رہتے تھے' راحت باجی کی تو کئی سہیلیاں بھی اسی برادری کی تھیں اور تو اور ایک راکھی بند بھائی بھی تھے' اتنے اچھے کہ کیا بتاؤں۔ دسہرا' دیوالی وغیرہ میں جادو ٹونے کا کاروبار بھی عروج پر ہوتا ہے' ایک جادوگر آئے ایک ننھی سی کڑھائی بھی ساتھ تھی' مجمع لگایا۔

"اڑا دوں اسے۔" پھر خدا جانے کیا پڑھ کے پھونکا وہ اڑ گئی۔ بہر حال دسہرے کے زمانے میں ہانڈی بیگم عروج پر تھیں ایک بنیئے بھائی کے گھر اُن کے دشمن نے بھیجی تو وہ اُن کے صحن میں پھٹی' سب

طرف خون کی بارش ہوئی' اور خوف سے سارا گھر بے ہوش ہوگیا۔ گھر میں پلا ہوا اعلیٰ نسل کتا مارا گیا' اگر گھر کے لوگ بھی لان میں ہوتے تو مرجاتے' یہ سن کر میرے دل میں ایک خیال جاگا تھا۔

اسکول کے زمانے میں' میں ہوشیار اسٹوڈنٹ تھی' ہینڈی کرافٹ سکھائے گئے تھے تو فوراً سیکھ گئی تھی۔ ایک روز میں کچھ سامان وغیرہ لے کر چوہدری رب نواز سے بدلہ لینے کوٹھی کی چھت پر آ گئی۔ یہ سامان تھا کالا موٹا کاغذ جسے قینچی سے الٹے توے کی شکل کا کاٹ لیا' پھر دوسرا کالا ہی کاغذ لئی کی مدد سے جوڑا تو ہانڈی بن گئی پھر اس کے گرد پتنگ لوٹنے والا مانجھا باندھا' اس کے اندر دو ننھے بلب بمع بیٹری اور دو گیس کے غبارے رکھ کر اوپر سے کالا شاپر اوڑھا دیا' اب وہ اڑنے کو تیار تھا۔ ہمارے بنگلے کی تیسری منزل پر چار دیواری تھی' اس کے اوپر جالی تھی' میں دیوار کے کونے میں بیٹھ گئی۔ ہانڈی کی وجہ سے اُس علاقے میں پہلے ہی خوف ہراس پھیلا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چوہدری رب نواز جو بدقسمتی سے میرا چچا بھی تھا اور عاشق بھی' تبھی گاڑی سے اتر کر آ رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ہوا بھی اُدھر ہی کی تھی' میں نے ہانڈی کا دھاگہ جالی سے گزار کر اپنے ہاتھ پکڑا اور بی ہانڈی سیدھی برابر کے لان میں عین رب نواز کے سر کے اوپر تک جا پہنچی۔ اُس کی توجہ کے لیے ہلکی سی کنکری بھی ماری' اس کے بعد جو اس نے چیخنا شروع کیا؟ بنگلے کا گارڈ اور گھر کا نوکر بھی ہانڈی کو دیکھ کر بھاگ نکلے اب نواز دل پر ہاتھ رکھے بچاؤ بچاؤ چلا رہا تھا' بات یہ تھی کہ رب نواز پہلے ہی دل کا مریض تو تھا ہی اب دہشت سے اُس پر اٹیک ہوا تھا' سب سمجھ رہے تھے کہ ہانڈی کا جادو چل گیا ہے' کہیں ہم بھی اس کی لپیٹ میں نہ آ جائیں۔ سو وہ بھاگ رہے تھے اب تو سب اہل محلہ جو اپنے آپ میں مست رہتے تھے' وہ بھی جمع ہوگئے تھے' جب پندرہ بیس آدمیوں نے ہانڈی کی زیارت کر لی تو میں نے اُسے کھلی چھٹی دے دی' اور وہ گیس کے غباروں کے ہمراہ آزاد فضاؤں میں اڑ گئی تھی' مجھے تو اس بات کی خوشی تھی کہ جس طرح ماں نے تڑپ تڑپ کر جان دی' اب رب نواز بھی اسی طرح تڑپ رہا تھا' لوگ اُسے اٹھا کر اسپتال لے گئے' جہاں وہ دو دن زندہ رہا تھا۔ اس طرح ابلیس وقت اپنے انجام کو پہنچا؟

رب نواز کو دنیا سے گئے تیسرا دن تھا۔ خاندان کے نام پر اُس کا بڑا بھائی چوہدری شاہ نواز اور کچھ عزیز آ چکے تھے' سوئم ہوگیا تو سب چلے گئے بس بڑے بھائی شاہنواز رہ گئے تھے۔ اس وقت وہ لان میں اُداس بیٹھے تھے' اور میرا خون جوش میں آ چکا تھا۔ میں ہمت کر کے نیچے چلی گئی سب کہتے تھے کہ یہ دونوں بھائی بے اولاد تھے' میں اُن کے مقابل جا پہنچی' وہ سمجھے پڑوس سے تعزیت کرنے آئی ہوں۔

''آپ برابر کے بنگلے والوں کی بیٹی ہیں؟''

''جی نہیں' میں اُن کی وہیل چیئر دھکیلنے والی ہوں' بیٹی تو میں آپ کی ہوں شاہنواز صاحب۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو میری تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔''

''لوگوں کے گھر کے چراغ بجھانے سے فرصت ہوتی تو آپ کے گھر چراغ جلتے؟''

''آرام سے بیٹھو اور بات کرو' تم کون ہو؟''

''میں آپ کی اور صغریٰ' جو غنی کھوسہ کی بیوی تھی کی بیٹی ہوں۔ اور شکر ہے کہ نکاح کی اولاد ہوں' کیونکہ آپ کی دنیا میں سب چلتا ہے۔'' یہ بات سن کر اُن کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

''اُن کی ایک بہن تھیں انجم' میری اُن میں بھی شباہت تھی' وہ میری سگی پھوپی بنتی تھیں میری صورت ہی میرا اعلان تھی' اپنی بیویوں سے اولاد کے لیے ان

سب نے کیا نہیں کیا تھا' لیکن اللہ کچھ سزا تو دیتا ہی ہے' پھر میں نے آنسوؤں کی چھتری میں تمام کہانی اماں کو مجھے رب نواز کے حوالے نہ کرنے کے جرم میں زہر دلوانے تک سنا ڈالی' بس بابا شاہ مراد کا ذکر گول کر گئی' انہوں نے منع جو کیا تھا۔

اب تو چوہدری شاہ نواز کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے آسمان سے کوئی بادل کا ٹکڑا ٹوٹ کر سایہ دے گیا ہو؟''

انہوں نے فوراً پڑوس سے میرا سامان منگوالیا تھا۔ میں نے زیور کی پوٹلی کھولی تھی۔ سونے کا سیٹ ماں کو دادی غنی کھوسہ کی ماں نے دیا تھا' اور پازیب چوہدری شاہ نواز نے' اس کے ساتھ نکاح نامہ بھی تھا جو مولوی صاحب نے بہت بعد میں اماں پر رحم کھا کے اُسے دے دیا تھا۔

بابا مجھے پا کر بہت خوش تھے۔ لوگ انہیں بے اولاد ہونے کا طعنہ دیتے تھے پھر مجھے بھی پتہ نہیں کیا ہوا کہ میں کرسی چھوڑ کر اُن کے قدموں میں جا بیٹھی۔

''میری بیٹی......'' انہوں نے جھک کر مجھے کلیجے سے لگالیا۔ عین اُس وقت پاپا یہ سمجھ کر کہ میں اُن سے ناراض ہو کر نوکری چھوڑ آئی ہوں۔ اپنی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے آ پہنچے اور یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

میں پاپا کی بھی عزت کرتی تھی انہیں تمام تفصیل بتائی تھی تو وہ فوراً ہی مجھ سے اپنے رویہ پر معذرت کرنے لگے تھے۔

بابا نے فوراً ہی اپنے وکیل کو طلب کیا تھا۔ اتنے میں مرتضیٰ بھی اپنے پاپا کو تلاش کرتے ہوئے وہاں آ گئے تھے اور تمام صورت حال جان کر حیران ہی نہیں پریشان بھی ہو گئے تھے۔

''وکیل صاحب وصیت نامہ تیار کرو' میری شہر اور گاؤں کی تمام جائیداد میری دھی کے نام کر دو' دھک دھک دھی ہے میری۔''

میرے دل کی عجیب حالت تھی' اللہ کا بار بار شکر ادا کرتے ہوئے دل ہی دل میں اپنی ماں کو پکار رہی تھی۔

''اماں' اماں' آ جا دیکھ لے' اماں اپنا صبر دیکھ لے۔ ابا اور چاچا کی تمام جائیداد کی تنہا وارث اب میں تھی۔ میں نے سوچا بابا مراد شاہ سچ کہتے تھے بیٹی خوشیاں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔

اگلی صبح میں راحت باجی کے ساتھ بابا عبداللہ شاہ کے مزار پر گئی۔ نذرانہ دیا۔ لنگر تقسیم کیا' بابا بھی ساتھ تھے۔ بابا نے خوب دھوم سے میری شادی مرتضیٰ سے کی تھی' اب تو سارا گاؤں دوڑا آیا تھا سب میری قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ مہینہ بھر تو شادی کا جشن رہا' ساری حویلی پر چراغاں تھا بڑی چودھرانی جی نے مجھے گلے لگا لیا تھا۔

یہاں میں آپ کو بہت ایمانداری سے' بالکل سچی بات بتا رہی ہوں کہ اپنی تمام جائیداد میں سے جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے پتہ ہے کیا ہے' وہ ہے بیل گاڑی' کاشی کے کام والی سجی سجائی' بیل گاڑی' میں سفید ٹوپی والا برقعہ اوڑھے اُس میں بیٹھی تو مرتضیٰ بھی میرے ساتھ تھے ہنس ہنس کر اُن کا برا حال تھا۔

ہم سب گاؤں والے بابا شاہ مراد کے عرس میں شریک ہونے جا رہے تھے درگاہ آ گئی' رات ہوئی تو مرتضیٰ تو مردوں میں تھے' میرے کمرے میں ایک خوشبو پھیل گئی اور کانوں میں آواز آئی۔

''خوش رہو بیٹی' خوش رہو اور پھر ایک تازہ گلاب میرے قدموں میں آ گرا تھا۔

☆☆......☆☆

ایک نہایت ہی منفرد دلچسپ پراسرار سلسلہ جسے آپ عرصہ دراز تک یاد رکھیں گے

املتاس

علامہ سید اجتبیٰ حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ' اس سر کا تصور تھا مو قلم
تمثال پہ نقطے لگا کے' تصویر بدلتی چلی گئی

(تیسری قسط)

شازلی سعید مغل

تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے ایک سفید چادر سی بن گئی۔ پھر اس کے جسم نے ایک زور دار جھٹکا کھایا اور یک لخت اورنگزیب کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے وسیع و عریض سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔ وہی سمندر' وہی شور مچاتی اونچی نیچی لہریں' اونٹ والے' گھوڑے والے ساحل پر آئی فیملیاں اور اُن کے بچے سب جوں کا توں موجود تھا۔ جب اُس نے خود پر نظر ڈالی تو وہ اسی جگہ اسی بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا' اس کی منجمد حسیات بتدریج بہتر ہوتی چلی جا رہی تھیں' اس نے اپنے سر کو جھٹکا' ایک' دو' کئی بار وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ کیوں؟ کیوں؟

وہ مسلسل ذہن پر زور ڈال رہا تھا' مگر بے سود......

اورنگزیب کا ذہن سلیٹ کی طرح صاف تھا۔ کچھ یاد نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے' اُس نے آخری کوشش کی پوری قوت کے ساتھ یاد کرنے کی' ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا اس کا دماغ سنہرا...... سنہرا نام کی گردان کرنے لگا۔

''ہاں میں اُس سے ملنے آیا تھا وہ آ گئی تھی یہاں میرے ساتھ برابر والے پتھر پر بیٹھی تھی اب اس کے ذہن میں کچھ دھندلی سی تصویریں تھرکنے سی لگیں' اس کے سامنے سنہرا کا آنا بیٹھنا' باتیں کرنا پھر اس کے ساتھ اورنگزیب کا کہیں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا' گاڑی ہاں اُس کی گاڑی' میری بائیک' بائیک کا خیال آتے ہی وہ پتھر سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز چلتا ہوا وہاں پہنچا جہاں بائیک کھڑی کی تھی۔ وہ جوں کی توں اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

اورنگزیب کا سر گھوم رہا تھا' وہ وہیں بائیک کے پاس سڑک کے کنارے بیٹھ گیا' اس کے ذہن میں تھرکتی دھندلی تصویروں میں ایک سفید گھر کا اضافہ ہوا' جس کا ہر دریچہ پھول دار بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر پھر کیا

ہوا اُس نے خود کو اس گھر میں سنہرا کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا' بس پھر اُسے کچھ یاد نہ رہا' اس کے علاوہ اس کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا' کچھ لفظ ذہن سے چپک تو ضرور رہے تھے مگر واضح ہوتے ہوتے گم ہو رہے تھے اور اورنگزیب اب تک سب یاد کرنے کی کوشش میں بے حد ہلکان ہو گیا تھا۔

وہ اپنی بائیک پکڑے پکڑے کافی دور پیدل چل پڑا تھا۔ اُسے اب جلد از جلد گھر جانا چاہیے' یہ خیال نہایت ہی شدت سے اس کے دل و دماغ میں جڑ پکڑنے لگا' چکراتے ہوئے دماغ کے ساتھ اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور پھر بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

نہ جانے کون سی قوت تھی جو اسے گھر کے راستے پر اڑائے لیے جا رہی تھی' کئی بار اُسے یوں بھی محسوس ہوا کہ اس کا بائیک پر کوئی کنٹرول نہیں رہا ہے۔ وہ از خود چل رہی ہے وہ تو بس ایک بت کی طرح اس پر بیٹھا ہوا ہے' اسی ناگفتہ بہ حالت میں بالآخر وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ ہی گیا۔ اور جو ڈور بیل پر ہاتھ رکھا تو ہٹانا ہی بھول گیا۔

''ارے رکو بھائی' کون ہے؟ آ رہے ہیں چھری تلے دم تو لو بابا۔'' اندر سے ایک پاٹ دار آواز' صحن میں مخصوص چپل گھسیٹنے کی آواز کے ساتھ ابھری' یہ جمن دادا تھے۔ انہوں نے دروازہ جو کھولا تو اورنگزیب کو دیکھ کر سارا غصہ جیسے چھو ہو گیا۔ دیکھتے ہی گلے لگ گئے۔

''ارے میرا بچہ آ گیا' صبح سے آنے کے بعد سب تیری راہ دیکھ رہا ہوں۔'' وہ جس جوش اور تیزی سے گلے ملے تھے' اُسی بدحواسی و تیزی سے پیچھے ہٹے۔ اورنگزیب کا جسم آگ میں پھنک رہا تھا بری طرح تپ رہا تھا۔

''ارے تمہیں تو اتنا تیز بخار ہوا ہے۔ چلو چلو اندر چلو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے صحن عبور کرنے لگے۔ اب اورنگزیب سے چلا تک نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے جن حالات میں گھر کا رخ کیا تھا اُن حالات میں گھر صحیح سلامت پہنچ جانا ایک معجزاتی بات تھی' گھر کے دروازے کو دیکھ کر اُس نے جیسے اپنی تمام مجتمع کی توانائی چھوڑ دی تھیں' بالکل نڈھال ہو گیا' دنیا مافیہا سے بے خبر' ارے فائزہ بہو' صولت بی بی آپ دونوں کہاں ہیں۔''

فائزہ جو کسی کام سے چھت پر گئیں تھیں' جمن دادا کی آوازوں کے ساتھ تیزی سے نیچے اتریں' صولت جہاں نماز سے فارغ ہی ہوئی تھیں' ہڑبڑا کر اپنے کمرے سے نکلیں تو جمن دادا اورنگزیب کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لاؤنج تک لے آئے تھے۔

''ارے کیا ہوا اسے؟ کیا ہوا اللہ میرے بچے کو؟'' وہ بوکھلا گئیں۔ آگے بڑھ کر اورنگزیب کو تھامنے لگیں۔

''کیا ہوا؟'' فائزہ پریشان ہو اٹھیں۔

''ارے تیز بخار ہے دیکھ نہیں رہی ہو۔'' صولت جہاں نے جواب دیا۔

''چلو پہلے اسے اس کے کمرے میں لے چلو۔'' فائزہ بولیں۔

''نہیں چھوڑو...... اِدھر میرے کمرے میں ہی لاؤ' دیکھو تو اس سے چلا تک نہیں جا رہا۔'' صولت جہاں نے اپنے کمرے کی جانب اشارہ کیا' جو سامنے ہی تھا جبکہ اورنگزیب کا کمرہ یہاں سے قدرے فاصلے پر

تھا۔
''صبح تو ٹھیک تھا بالکل...... یہ اچانک اتنا تیز بخار کیسے ہوا؟'' فائزہ کو گھبراہٹ نے گھیر لیا۔
''بخار کیوں نہ ہو بی بی...... سردی آ گئی ہے اور یہ پھرتے رہتے ہیں موٹر بائیکوں پر' یہ پتلی سی شرٹ ہے جسم پر' سنتے ہیں کسی کی یہ۔'' جمن دادا ہمیشہ کا غصہ نکال رہے تھے۔
یہ وہ ہی جمن دادا تھے جو بچپن میں املتاس اور اورنگزیب کو اکثر شام کو دریا کنارے سے اپنی بغل میں باقاعدہ چھاپہ مارانداز میں چھپا کر تب لاتے تھے جب دونوں اپنے کھیل تماشوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔
تو جمن دادا اُس وقت ایسے جذبے سے انہیں ڈھونڈنے نکلتے تھے کہ گویا پاتال سے بھی نکال لائیں گے' اور پھر ہوتا بھی یہی تھا وہ ایسے کامیاب کھوجی تھے کہ دونوں کہیں بھی ہوتے پکڑے جاتے تھے۔ اورنگزیب اور امل نے کئی دفعہ مل کر جمن دادا کو جُل بھی دینے کی کوشش کی' ایسی ایسی جگہوں پر جا کر چھپے' جہاں اُن کی نظر میں اُن کو ڈھونڈنا اتنا آسان نہ تھا' مگر جمن دادا کی عقابی نظریں تو بنی ہی اُن کو تلاش کرنے کے لیے تھیں۔
جمن دادا اِس گھر کے پرانے نمک خوار تھے وہ عمر میں صولت جہاں سے کافی بڑے تھے' قد درمیانہ' یہ لمبی سفید داڑھی کرتا پاجامے میں ملبوس سر پر اکثر ٹوپی جمائے ہوتے تھے' دونوں بچوں کو بچپن سے یہ سکھایا گیا تھا کہ اِن کو دادا بولیں بس پھر وہ اُن دونوں کے ہی نہیں بلکہ جگت دادا بن گئے تھے' خاندان بھر کے سارے بچے ہی نہیں آس پڑوس کے سب ہی بچے تو بچے بڑے بوڑھے بھی اُن کو جمن دادا ہی کہا کرتے تھے اور کبھی صرف دادا' جس کا وہ برا نہیں مانتے تھے' کیونکہ اکثر اُن کو دادا کسی اور ہی مفہوم میں کہا جاتا تھا' اُن کے دبنگ نشست و برخاست اور پاٹ دار آواز کے سبب دادا مشہور تھے۔
اس وقت وہ فائزہ اور صولت جہاں پر ناراض ہو رہے تھے کہ وہ کچھ دن اپنے گاؤں گھر سے دور کیا گئے انہوں نے گھر اور بچوں کا خیال ٹھیک طرح رکھا ہی نہیں' اور یہ حقیقت بھی تھی جمن دادا کچھ دنوں کے لیے اپنے گاؤں کیا چلے جاتے گھر بہت ڈسٹرب ہو جاتا تھا فائزہ بیگم کے ہاتھ پاؤں تو پھول ہی جاتے تھے' اور اس مرتبہ تو حد ہی ہو گئی تھی' وہ اِدھر گاؤں گئے اور اُدھر جز وقتی ملازمہ بھی بیمار ہو کر چھٹی پر چلی گئی تھی' فائزہ بیگم کو اکیلے بہت کچھ دیکھنا پڑ رہا تھا' اس پر سونے پر سہاگہ کچھ دن سے ہونے والے یہ اورنگزیب اور املتاس کے جھگڑے' اب جو یہ منظر دیکھا تو ہاتھ پیروں کی جان ہی نکل گئی تھی۔
اورنگزیب کو اب بیڈ پر لٹا دیا گیا تھا۔
''اماں میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' فائزہ یہ کہہ کر تیزی سے فون کی جانب لپکیں' جمن دادا رضائی نکال لائے' اورنگزیب اب تیز بخار میں کپکپا رہا تھا' شدید سردی کا اثر معلوم دیتا تھا' جمن دادا رضائی اورنگزیب کو اڑھاتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔ فائزہ بیگم نے اپنے فیملی فزیشن ڈاکٹر جمال نقوی کو بلایا تھا وہ اورنگزیب کو چیک کر رہے تھے۔
''فکر کی کوئی بات نہیں ہے' موسم کی تبدیلی کے اثرات ہیں۔''
ڈاکٹر اورنگزیب کو چیک کر کے' دوائیں اور ضروری ہدایات دے کر رخصت ہوئے تو فائزہ بیگم نے

اورنگزیب کے لیے یخنی بنانے کے لیے' کچن کا رخ کیا' جمن دادا جو غور سے اورنگزیب کا چہرہ تک رہے تھے' فائزہ کے جاتے ہی صولت جہاں سے مخاطب ہوئے تھے۔

''اِس کی پلکیں دیکھیے بی بی' کس خاص انداز میں جڑی ہوئی ہیں' بہت گندی نظر ہوئی ہے اورنگزیب کو۔''

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولے تھے۔

صولت جہاں نے اُن کے توجہ دلانے پر اورنگزیب کی آنکھوں کی جانب دیکھا' اورنگزیب کی آنکھیں بند تھیں' وہ غنودگی میں تھا' پلکیں ایک دوسرے سے بے حد چپکی ہوئی تھیں نظر تو اسے واقعی لگی تھی گہری نظر گہری اور پُراسرار نظر......

''ہوں......ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

پھر صولت جہاں بھی جیسے چونک پڑی تھیں۔

''مجھے تو......'' جمن دادا نے بولتے بولتے ایک دم اٹھ کر لاؤنج میں جھانکا' فائزہ کچن میں مصروف تھی' اطمینان کرنے کے بعد وہ صولت جہاں کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھے اور سرگوشیانہ انداز میں بولے۔

''تم نے جو کچھ بھی مجھے فون پر بتایا تھا' میرا اندازہ اورنگزیب کو دیکھ کر درست لگ رہا ہے' مجھے لگتا ہے کہ فائزہ بہو کو بتا دیا جائے' اب پوری بات بتانے کا موزوں وقت آچکا ہے۔ اور مجھے تو یہ بھی لگتا ہے کہ جتنی تم نے اُسے بتائی تھی' وہ اُس بات کو بھی بھول گئی ہے۔''

''اچھا ہے کہ بھولی ہوئی ہے' ورنہ کبھی کوئی بات کرتی' کبھی کوئی سوال کرتی۔'' صولت جہاں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اور اگر وہ پوری بات جاننے کے لیے ضد کرتیں تو ہم کیا کرتے' انسان ہیں' پریشانی میں یا کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر منہ سے کچھ نکل جاتا تو وعدہ خلافی الگ ہوتی اور ہماری بچی کے لیے بھی درست نہ رہتا۔ مگر اب وقت آچکا ہے ہاں مگر وہ بہت دنوں سے نہیں آئی۔''

''نہیں آئی......؟ کیوں؟'' جمن دادا پریشان ہو اٹھے۔

''مجھے لگتا تھا آپ کا رابطہ ہے۔''

''نہیں نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آجائے گی وہ' ایسا ہوتا رہا ہے' ہوتا رہتا ہے۔'' صولت جہاں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ لاؤنج میں اب فائزہ کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی' دونوں خاموش ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

یہ قصہ تو اُس وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا' جس وقت صولت جہاں کے گھرانے نے اس گھر میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔ انہیں اپنے اس من پسند طویل صحن والے گھر میں داخلے کا پہلا دن بھلائے نہیں بھول سکتا تھا' جس میں ایک خوبصورت املتاس کا درخت سر اٹھائے اُن کے استقبال کا منتظر تھا۔

صولت جہاں جب اپنے خاندان کے ساتھ اس گھر میں داخل ہوئی تھیں' اُس وقت شام کا ملگجا ہو چکا تھا۔

کچھ ضروری چیزیں اِدھر اُدھر رکھنے کے بعد طے یہ پایا کہ ترتیب آہستہ آہستہ ہوتی ہی رہے گی۔ پورے دن کی شفٹنگ کے بعد چونکہ سب بہت تھک چکے ہیں تو جلد ہی سو جائیں۔ صبح ویک اینڈ تھا کام کرلیا جائے گا۔ جمن دادا اُس رات پرانے گھر میں رُک گئے تھے۔

صبح نئے مالکوں کو چابیاں تھمانا اُن کی ہی ذمے داری تھی۔ اُن کی بہو فائزہ بھی آج بہت تھک چکی تھیں، چنانچہ وہ دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے آئیں، اورنگزیب تو دادا کے ساتھ سو گیا تھا، املتاس کو انہوں نے اپنے پاس لٹایا اور خود بھی لیٹ گئیں۔

اُس روز وہ بھی کافی تھک گئیں تھیں، سب کے لیے نہایت تھکا دینے والا دن تو تھا ہی مگر نئے من پسند گھر میں آنے کی خوشی کا نشہ بھی تھا، چنانچہ دونوں مل کر گہری نیند کا باعث بنے، دونوں بچے بھی آج کے دن کی بھاگ دوڑ کے باعث دوپہر میں اپنے اپنے وقت پر سو نہیں پائے تھے، حتیٰ کے پندرہ دن کی املتاس بھی پورے دن قلقاریاں بھرتی رہی تھی، وہ اب بے خبر سو رہی تھی۔

صولت جہاں نے ایک نظر املتاس پر ڈالی وہ گہری نیند میں تھی۔ صولت جہاں مطمئن ہو کر لیٹ گئیں اور تکیے پر سر رکھتے ہی وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئیں۔

اُس وقت نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا وہ گہری نیند میں تھیں کہ انہیں یکدم اپنے چہرے پر ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوائیں محسوس ہوئیں، ہوا کے تازہ جھونکے اُن کے چہرے کو چھو رہے تھے اور ایک ٹھنڈک کا احساس اُن کے پورے وجود میں سرایت کر رہا تھا، ساتھ ہی ایک مخصوص سی خوشبو اُن کے آس پاس چکرانے لگی، بہت انوکھی سی ملی جلی سی خوشبو تھی وہ جیسے دنیا کے سارے پھولوں سے ایک ساتھ کشید کی گئی ہو اور پھر اُس میں ایک اور خوشبو جیسے آن ملی۔

وہ خوشبو جو دور جھرنوں کے اختتام پر ٹھہرے ہوئے پانیوں میں پڑے مقدس پھولوں سے پھوٹتی کوئی اسرار بھری خوشبو ہو جیسے، کچھ بھی تھا، صولت جہاں گہرے گہرے سانس لے کر اس انوکھی سرشار کر دینے والی خوشبو کو اپنے اندر اتار رہی تھیں، خوب گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں، دور کہیں آبشاروں کا ترنم بھی اس مہک کے ساتھ اُن کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' مترنم آواز پر صولت جہاں نے آنکھیں کھولیں نظر کے سامنے تو کوئی دکھائی نہ دیا مگر ایک منظر سامنے ضرور تھا۔

خوبصورت پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں تھیں، جھاگ اڑاتا تیز رفتار چشمہ بہہ رہا تھا، دور آبشاروں کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔

وہ چشمے کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھی تھیں، وہ جہاں بیٹھی تھیں، وہاں گلابی پھولوں سے لدے بڑے حسین درخت تھے جن کے کچھ پھول ٹوٹ کر چشمے کے گزرتے پانیوں کا استقبال کر رہے تھے اور کچھ اس کے ساتھ ہی چل پڑے تھے۔ جابجا گلابی مہک دار پھول بکھرے پڑے تھے۔

صولت جہاں نے بے ساختہ اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔

''یا اللہ...... یہ میں کہاں آ گئی ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے۔'' وہ خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیات کا شکار تھیں۔

''السلام علیکم!'' کی مترنم سی آواز دوبارہ اُن کے بہت قریب ابھری تھی اور وہ پشت سے عین اُن کے سامنے آ گئی۔

صولت جہاں کی آنکھوں میں یکدم جیسے نور کی سی تراوٹ اتر گئی تھی روشنی سی بکھر گئی چار سو' ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی سفید حریری ریشمی لبادے میں ملبوس اُن کے بالکل سامنے موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کے دم بخود رہ گئیں تھیں' کائنات کے سارے جمال اس پر ٹوٹ کر برس رہے تھے' گویا وہ جھکی ہوئی نظروں سے پانی میں کچھ دیکھ رہی تھی' جیسے اپنا عکس دیکھ رہی ہو' اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں' جہاں وہ کھڑی تھی یہاں چشمے کا ایک نخریلا سا کٹاؤ تھا' اُس کے پاؤں پانی میں بھیگ رہے تھے' گلابی پھول جو پانی میں ہلکورے لے رہے تھے اس کے پیروں کو چوم جاتے اور پھر ہلکورے لینے لگتے۔

''وعلیکم السلام!'' کی ایک باریک لرزتی ہوئی سی آواز صولت جہاں کے لبوں سے خارج ہوئی' جواب پاتے ہی اُس کافر ادا نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ کیا نگاہیں تھیں وہ' اس کے تمام حسن کا خلاصہ تھیں وہ آنکھیں' صولت جہاں کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں کسی انسان کی اتنی حسین آنکھیں اپنی آج تک کی تمام عمر میں انہوں نے تو نہیں دیکھی تھیں۔

یہ آنکھیں' یہ چہرہ کسی انسان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہی تھیں۔

''شاید نہیں یقیناً صحیح سوچ رہی ہیں آپ ہمارے بارے میں۔'' اُس نے اُن کے دل کی بات اپنی زبان پر سجا دی۔

''کیا' کون ہو' کون ہو تم؟ میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے۔'' صولت جہاں خوف اور گھبراہٹ کے گہرے تال میل میں تھیں۔

''آپ' آپ بالکل بھی مت ڈریے' مت گھبرایئے' دیکھیے ہم نے آپ کو دوبارہ سلام کیا ہے۔ آپ نے جواب بھی دیا ہے۔ ایک بات تو آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔'' صولت جہاں ایک تنویمی کیفیت کا شکار تھیں۔

کانوں میں اُس کی آواز آ رہی تھی' نظریں اس کے چہرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں' اتنے دلفریب مناظر اور کائنات کا جمال سمیٹے یہ لڑکی' وہ جہاں بیٹھی تھیں وہاں کی تو فضا بھی انہیں نقرئی سی لگ رہی تھی' وہ فسوں میں کھو رہی تھیں۔

''دوسری بات جو آپ نے سوچی کہ یہ چہرہ یہ آنکھیں کسی انسان کی نہیں ہو سکتیں' وہ بھی انجانے میں سہی' مگر درست پہنچانا آپ نے۔''

حسینہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی' پُرشوق نگاہوں سے صولت جہاں کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''چلیے آپ بتایئے ہم کیا لگتے ہیں آپ کو؟''

''پری' پری ہیں آپ۔'' صولت جہاں اب بغیر پلکیں جھپکائے اُسے تک رہی تھیں' خوف جیسے کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔ اب وہ ان کے سامنے پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''آپ رکھتی ہیں پریوں پر یقین؟'' وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی تھی۔

''بولیے...... رکھتی ہیں پریوں پر یقین؟''

صولت جہاں کی گردن اثبات میں ہل کر رہ گئی تھی۔ اقرار نامے کے ساتھ اُن کے اردگرد پھیلی مسحور کن خوشبو تیز تر ہوگئی تھی۔ اور اسی تیز خوشبو کے احساس کے ساتھ اُن کی آنکھیں کھل گئی تھیں' ذرا دیر تک تو انہیں کچھ سمجھ ہی نہیں آیا تھا' وہ سیدھی لیٹی چھت کو تکتی رہیں' انہیں جلد احساس ہوگیا وہ اپنے کمرے میں ہی ہیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا' وہ اٹھ بیٹھیں' موسم بدل گیا تھا۔

نومبر کے آخری دن تھے' اچھے خاصے ٹھنڈے دن اور راتیں ہو چکی تھیں' مگر وہ اس وقت پسینے میں شرابور تھیں' اور دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا اُن پر عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن کیا تھا۔ لیمپ کی نیلگوں روشنی میں انہوں نے دیکھا ننھی املتاس بے خبر سو رہی ہے۔ ایک نظر انہوں نے شیرازی صاحب کی طرف ڈالی' وہ اور اُن کے پاس لیٹا اورنگزیب دونوں ہی رات کے اس پہر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رات سرد تھی مگر وہ پسینے میں شرابور تھیں۔

کمرے میں اکیلی ہوتیں تو پنکھا ضرور چلاتیں' مگر اب وہ اٹھیں اور آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آ گئیں اب وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں' سامنے لاؤنج کے جالی دار پارٹیشن سے پرے صحن کا منظر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا' ہوا کی سرسراہٹوں کے ساتھ املتاس کا درخت جھوم رہا تھا۔ اب اُن کی گھبراہٹ میں کچھ کمی ضرور ہوئی تھی' وہ دھیرے سے چلتی ہوئیں' پہلے بیچ صحن اور پھر املتاس کے درخت کے قریب بچھے تخت پر بیٹھ گئیں۔ اُن کے بیٹھتے ہی وہی مخصوص سی خوشبو جس کے ساتھ اُن کی آنکھیں کھلیں تھیں اُن کے گرد آ کر ٹھہر گئی اور بس چند سیکنڈ انہیں ایسا لگا جیسے خوشبو نہیں پورا ایک وجود وہاں موجود ہے' اُن کے اندر ابھی یہ حس بیدار ہی ہوئی تھی کہ خوشبو کا یہ جھونکا انہیں نرمی سے چھوتے ہوئے املتاس کے درخت کے پاس جا کر معدوم ہوگیا۔

صولت جہاں تخت سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور تیزی سے درخت کے پاس آئیں اور اُس کے آگے پیچھے یوں گھومیں جیسے خوشبو کا تعاقب کر رہی ہوں' گہرے سانس لے کر خوشبو کی سمت کو محسوس کرنا چاہا ان کا دل و دماغ بیک وقت اب اس بات کی تصدیق کر چکا تھا کہ خوشبو اسی املتاس کے درخت کے پاس آ کر گم ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ وہاں نہیں ٹھہریں واپس اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئیں اور جتنی آیت قرآنی انہیں یاد تھیں اُن کا ورد کرنے لگیں۔

نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' وہ دو گھنٹے سے زیادہ سوئی بھی نہ تھیں رات جلد سونے کے سبب ابھی صبح ہونے میں کافی دیر باقی تھی' گھر کے سارے مکین سکون بخش نیند کے زیر اثر تھے' سوائے ایک اکیلی صولت جہاں کے' آیتِ قرآنی کے ورد کے بعد اُن کا ذہن اچانک سید صاحب کی جانب مڑ گیا اور انہیں جیسے قرار آ گیا تھا۔

''یہ ٹھیک رہے گا' مجھے سید صاحب کو بتانا چاہیے۔'' یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوگئیں اور اُس کے ساتھ ہی اُن پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

فجر کی اذان کے ساتھ اُن کی آنکھ کھل گئی تھی' وہ رات بالکل بھی ٹھیک سے سو نہ پائی تھیں' یہ بات شیرازی صاحب سے لے کر بہو بیٹے سب نے محسوس کی اور پوچھا بھی مگر انہوں نے بہت خوبصورتی سے

نئے گھر اور نئی جگہ کا بہانہ بنا دیا تھا' اُن کی بہو پہلے تو یہ ہی سمجھی کہ املتاس نے تنگ کیا ہوگا' مگر اگر املتاس اٹھتی' روتی تو سب گھر والوں کی نیند خراب ہو سکتی تھی' سو یہ بات خارج از امکان ہو گئی اور سب نے مان لیا کہ صولت جہاں نئی جگہ کی وجہ سے بے آرام ہوئی تھیں۔

اگلے چند ہفتے گھر کی تزئین و ترتیب میں گزر گئے۔ اس دوران میں کئی بار سید صاحب سے بات کرنے کا خیال صولت جہاں کے ذہن میں آیا بھی تو' وہ آج کل پر ٹال گئیں' مصروفیت کی وجہ تو ایک بات تھی' دوسری بات یہ تھی کہ دوبارہ انہیں ایسی کوئی انوکھی بات' حقیقت و خواب میں نظر نہیں آئی تھی۔

اُن لوگوں کو اِس گھر میں آئے چوتھا ہفتہ شروع ہو چکا تھا' گھر کافی حد تک سیٹ کر لیا گیا تھا۔ صحن میں انہوں نے خوبصورت کیاریاں بھی بنوائی تھیں' صولت جہاں آج کل اپنا باغبانی کا بے تحاشہ شوق پورا کر رہی تھیں' املتاس صحن کے بیچوں بیچ بہار دکھلا رہا تھا' کیاریوں میں بھی موسمی اور کچھ سدا بہار قسم کے پودے لگائے جا چکے تھے' جو تیزی سے نمو پا رہے تھے' صولت جہاں کا زیادہ وقت املتاس کے نیچے بچھے اُس تخت پر ہی گزرتا تھا' دھوپ جب املتاس کے پتوں سے چھن کر نیچے بچھے تخت پر پڑتی تو' اس پر بیٹھی یا لیٹی ہوئی صولت جہاں کو بہت سکون ملتا تھا' سرما کے دنوں میں کسی درخت کے پتوں اور پھولوں سے چھن چھن کر آنے والی اجلی دھوپ کی کرنوں کا مزہ بڑا ہی بہت انوکھا اور مسرت بخش ہوتا ہے' زندگی میں پہلی بار اُن کے اِس ارمان نے حقیقت کا روپ دھارا تھا کہ بڑا سا صحن اور پھلواری ہو' درخت' پودے' اور وہ ہوں' اور سردیوں کے دن اسی طرح اپنے صحن میں نرم گرم دھوپ میں گزاریں' اب جوان کے ارمان نے حقیقت کی صورت لے لی تھی تو وہ خوب لطف اندوز ہو رہی تھیں

وہ لوگ اب صبح کا ناشتہ اکثر اسی بڑے سے تخت پر کرنے لگے تھے' جس کے اردگرد خوبصورت کین کی کرسیاں پڑی تھیں اس روز بھی وہ ناشتے کے بعد یہاں بیٹھی تھیں' محسن شیرازی اور شیرازی صاحب آفس جا چکے تھے' فائزہ اندر بچوں کے پاس تھیں اور جمن دادا گھر کا سودا سلف لانے بازار گئے ہوئے تھے' جز وقتی ملازمہ کے آنے میں ابھی وقت تھا۔

صولت جہاں نے بیٹھے بیٹھے تخت کے ایک کونے پر پڑے اپنے من پسند رسالے کو اٹھایا اور ایک ادھورا افسانہ پڑھنے لگیں جو انہوں نے کل چھوڑا تھا۔ ابھی چند سطریں ہی پڑھی ہوں گی کہ اندر سے اورنگزیب کے رونے چیخنے اور فائزہ کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں' فائزہ اورنگزیب کو ناشتہ کرا رہی تھیں' وہ جمن دادا کے قابو میں ہی آتا تھا' اور آج انہیں بازار میں دیر ہوئی تھیں' کافی سامان خریدنا تھا اُن کو' چنانچہ اورنگزیب فائزہ کو ناشتے کے لیے تنگ کر رہا تھا' صولت جہاں رسالہ واپس رکھ کر اندر آئیں' اورنگزیب کے شور کرنے سے املتاس بھی ڈر کر اٹھ گئی تھی اور رو رہی تھی' صولت جہاں نے جلدی سے املتاس کو گود میں اٹھایا تھا۔

''فائزہ اِس کو چھوڑ دو یہ ضد کر رہا ہے' یہ جمن دادا سے ہی ناشتہ کرے گا' تم زیادہ سختی کرو گی تو یہ مزید رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لے گا' اور امل کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا' دیکھو ابھی تو چپ ہو گئی ہے' کیسے میری باتیں سن رہی ہے' تم نے دیکھا نہیں' اورنگزیب چپ ہوا تو یہ بیگم صاحبہ بھی چپ ہو گئیں۔''

فائزہ ہنس پڑی۔

''واقعی امی یہ دونوں تو کمال ہیں' بتاؤ اتنا ایکا ابھی سے۔''

''ارے تم نے غور ہی نہیں کیا' ایسے جیسے میں کہہ رہی ہوں' کل تو شیرازی صاحب نے بھی یہ بات محسوس کی تھی کہ اورنگزیب کو ڈانٹو تو یہ بھی منہ بسورنے لگتی ہے' اب دیکھو وہ چپ ہوا تو یہ بھی کیسے چپ ہوئیں محترمہ۔''

دونوں ساس بہو بچوں کی اس بات پر ہنسنے لگیں۔

''اچھا میں اس کو لے کر ذرا باہر دھوپ میں بیٹھوں' تم اورنگزیب پر زور زبردستی مت کرو' جمن کو گئے کافی دیر ہوگئی ہے بس ابھی آتے ہی ہوں گے' وہی اِسے ناشتہ کروائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے صولت جہاں املتاس کو لے کر صحن میں آگئیں اور تخت پر بیٹھ گئیں۔

املتاس کو اکثر وہ اسی طرح یہاں صبح کی نرم گرم دھوپ میں لے کر بیٹھتی تھیں' اُس وقت تو املتاس سوتے ہوئے اٹھی تھی' دھوپ کی کرنوں نے جب اُس کے کومل ننھے وجود کو چھوا تو فوراً پلکیں موندلیں اور سو گئیں' صولت جہاں نے سوتی ہوئی املتاس کو تخت پر آرام سے لٹا دیا اور پھر اپنا رسالہ اٹھالیا۔

دھوپ میں اپنے وقت کے حساب سے تیزی آتی جارہی تھی' لیکن سرما کی دھوپ تھی' اس لیے اچھی لگ رہی تھی' ساتھ ہی ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ ویسے تو وہ ایک نظر املتاس پر ڈالتیں اور پھر رسالہ پر...... مگر اب وہ تھوڑا سا منہمک ہوئی جارہی تھیں' افسانہ اختتام پر تھا کہ اچانک اُن کا انہماک ٹوٹ گیا' جب املتاس کے پھول ٹوٹ کر اُس آخری صفحے پر گرے جو وہ پڑھ رہی تھیں' وہ چونک پڑیں ہوا کے ایک شریر جھونکے نے املتاس کے پھول بکھرا دیے تھے تخت پر یوں ہی پھول بکھرے ہوئے تھے ایک پھول املتاس کے چہرے کو چوم رہا تھا انہوں نے آہستہ سے اس کے چہرے سے پھول ہٹایا تھا کہ اچانک اپنے چاروں طرف ایک شناسا سی بھینی بھینی خوشبو چکرانے لگی تھی۔

صولت جہاں نے تیزی سے سوتی ہوئی املتاس کو گود میں اٹھالیا تھا۔ اسی اثناء میں صدر دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ گھنٹی کے بجتے ہی خوشبو کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ فائزہ نے دروازہ کھولا جمن دادا حسب معمول اونچا نیچا بولتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

صولت جہاں نے املتاس فائزہ کی گود میں دے دی اور کچن میں آکر جمن دادا کے ساتھ گھر کا سودا سلف دیکھنے لگیں' اُس وقت بظاہر جمن دادا کے آنے' سودا سلف دیکھنے سمیٹنے' وہ کام میں مصروف نظر آرہی تھیں' مگر اُن کا دل دماغ اسی خوشبو میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اور بار بار اُن کی نظر املتاس کے درخت کی طرف اٹھ رہی تھی۔ اب انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اس خوشبو کا منبع وہ درخت ہی ہے۔ وہاں جا کر ہی وہ خوشبو ہوتی تھی اور آج شروع بھی وہیں سے ہوئی تھی اور بھی بہت سے خیالات اُن کے دل و دماغ میں آرہے تھے جارہے تھے۔ وہ رات بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ تازہ ہوگئی تھی' اُس خواب کی باتیں ایک ایک کرکے اُن کے اندر شور مچانے لگی تھیں' اندر کا شور بڑھ گیا تھا۔

صولت جہاں باقی کام جمن پر چھوڑ کر اندر اپنے کمرے میں آگئیں۔ تنہائی میسر ہوئی تو اور شدت سے گزری ہوئی ایک ایک بات یاد آنے لگی تھی۔

اُس گھر میں آنے کے بعد اب یہ اُن کے ساتھ دوسرا واقعہ ہوا تھا اور ان کے ہی ساتھ ہوا تھا۔ گھر کے

کسی اور فرد کے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا' اُس رات کے خواب اور خوشبو کے تعاقب کے بعد چند دنوں تک انہوں نے بہت ہی خوبصورتی سے اپنی بہو بیٹے حتیٰ کہ شوہر تک سے گھر کے متعلق پوچھا تھا کہ سب ٹھیک طرح سے سوئے' گھر کیسا ہے' دل لگا؟ سب بہت مطمئن تھے' حتیٰ کہ اُن کے دوست احباب رشتے داروں' سب کو اُن کا گھر اُن کا صحن اور خصوصی طور پر املتاس کا درخت بہت پسند آیا تھا اور ایک بات جو اُن کے رشتہ داروں دوست احباب حتیٰ کہ محلے داروں نے بھی محسوس کی تھی کہ اُن کے گھر میں رونق بہت ہے۔

آتے ہیں تو جانے کا دل نہیں کرتا دل بہت لگتا ہے اُن کے گھر میں' اِن تمام باتوں کے بعد وہ مطمئن سی ہوگئی تھیں اپنے اس رات کے خواب اور خوشبو کے تعاقب سے جو انہوں نے حقیقت میں جاگ جانے کے بعد کیا تھا۔ مگر آج کا واقعہ کھلی آنکھوں کی حقیقت تھا' اب جب بیٹھ کر سوچا تو اندازہ ہوا کہ ہوا بھی اتنی تیز نہ تھی کہ اس کے جھونکوں سے املتاس کے اس قدر پھول ٹوٹ کر گر یں۔

وہ جتنا سوچتیں اتنی ہی کشمکش کا شکار ہوتی جاتیں دل پر ہلکی سی گھبراہٹ بھی طاری تھی۔ اُنہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں کہ سید صاحب دماغ میں اک نام گونجا۔

''ارے میں کیسے بھول گئی۔ سید صاحب کو مجھے اُن سے بات کرنی چاہیے' اب تک وہ آچکے ہوں گے۔''

سید صاحب اُن کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھے' اپنی جوانی کے دنوں سے ہی روحانیت کی طرف مائل تھے' اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے' اُن کے ابا ایک کامیاب کاروباری شخص تھے' روپے پیسے کی گھر میں کمی نہ تھی' سید صاحب کی طبیعت میں تنہائی پسندی شامل تھی' فطرت سے پیار تھا' پیسے کی کمی نہ تھی' چنانچہ ایک جنگل کے کنارے گھر بنالیا تھا اکثر اوقات وہیں ملتے ماں باپ کی زندگی تک تو شہر سے اُن کا تعلق رہا تھا مگر اُن کے بعد وہ جنگل کے ہو کر رہ گئے تھے۔

ماں باپ کے بہت اصرار پر شادی تو کرلی تھی مگر کوئی اولاد زندہ نہ بچ سکی' سید صاحب کسی اور ہی دنیا کے مسافر تھے' مسافت لمبی تھی مالک شاید انہیں آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ ایسی باتیں دنیا والے کہاں سمجھتے ہیں چنانچہ ماں باپ کے بعد دونوں میاں بیوی جنگل میں جاکے بس گئے تھے۔ سب چھوڑ دیا تھا مگر رشتے داروں سے خوشی اور غم کے موقع پر ملنا نہیں چھوڑا تھا۔

صولت جہاں جب اس گھر میں منتقل ہوئی تھیں تب بھی وہ کسی بھانجے بھتیجے کی شادی میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خود کو بہت چھپا کر رکھا ہوا تھا' مگر خوشبو کو جتنا قید کرو وہ پھیلتی ہے اتنی تیزی سے لوگوں نے اپنے اپنے مسائل لے کر آنا شروع کیا تو وہ بیگم کے ساتھ جنگل چھوڑ کر کہیں روپوش ہوگئے۔ ایک عرصے بعد پتہ چلا وہ واپس اپنے گھر آچکے ہیں اور اب انہیں جب اور جتنی اجازت ہوتی ہے لوگوں کے مسائل دیکھ لیتے ہیں' اُن کے بارے میں بھی کچھ باتیں مشہور تھیں کہ بچپن سے کچھ جنات اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس بات میں کتنی سچائی تھی کتنی نہیں لیکن ایک بات ضرور تھی جس میں ہزار ہا فیصد سچائی تھی کہ صولت جہاں کے مسئلے کا حل اُن کے پاس تھا۔

اس نہایت ہی منفرد' دلچسپ' پُراسرار ناول کی دوسری قسط کے لیے آئندہ ماہ نومبر کا انتظار کیجیے

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

مرتب: اشعر جواد

حکم کی عظمت

مبلغ کہتے ہیں۔"نماز قائم کرلو تو کردار خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔"

ممکن ہے' کچھ نمازیوں میں ہو جاتا ہو۔ بیشتر نمازی محروم رہتے ہیں۔ ہمارے مبلغ کہتے ہیں کہ نماز کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ہمیں برائیوں سے بچاتی ہے' حفظانِ صحت ہے۔ میری دانست میں اللہ کے حکم کو rationalise کرنا' اس میں مصلحتیں تلاش کرنا' حکم کے لفظ کی توہین کے مترادف ہے۔ نماز قائم کرو اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے۔ بس اس کے بعد بات کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔

قدرت اللہ شہاب کی بیگم ڈاکٹر عفت لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھی تھیں۔ اسی ٹیبل پر ایک فوجی افسر وردی پہنے بیٹھا تھا۔ فوجی افسر نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا۔

"لیڈی! آپ مسلمان ہیں؟"

'الحمدللہ!" ڈاکٹر عفت نے کہا۔

فوجی بولا۔"کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"پوچھیے۔" ڈاکٹر عفت نے کہا۔

فوجی بولا۔"آپ سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟"

عفت نے کہا۔"میرے اللہ کا حکم ہے کہ مت کھاؤ' اس لیے نہیں کھاتے۔"

فوجی بولا۔"اس حکم کے پیچھے کیا دلیل ہے؟"

عفت نے کہا۔"آپ فوجی ہو کر حکم کے مفہوم کو نہیں جانتے؟ حکم کی عظمت کو نہیں جانتے؟ حکم' دلیل اور مصلحت سے بے نیاز ہوتا ہے۔"

مولانا ظفر احمد کی تصنیف 'جواہر پارے' سے اقتباس۔ انتخاب۔ آصف زیدی۔ کراچی

دل چار قسم کے ہیں

سند احمد میں ہے" رسول اللہؐ نے فرمایا کہ دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔"

(1) ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو۔

(2) دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہیں۔

(3) تیسرے وہ دل جو الٹے ہیں۔

(4) چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں۔

پہلا دل تو مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے۔

دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

تیسرا منافق کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے۔

چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں۔

تفسیر ابن کثیر سے اقتباس۔

انتخاب: مولانا شہید السلام المصری۔ کراچی

گزشتہ کی راکھ

ماضی کو کون سمجھائے کہ بچپن تو ہوتا ہی یاد کرنے کے لیے ہے۔ سہمی سہمی، گونگی دوپہریں، بہری شامیں اور اندھی راتیں کتنی کہانیوں تو بنتے بنتے راکھ ہوگئیں۔ اور ان کہانیوں کا کوئی ایک ریزہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔

سنگلاخ تنہائی کے اس بنجر پن میں دہکتے دہکتے جذبوں کے گلاب اُگانا اور انہیں بے ربط آنسوؤں سے شاداب رکھنا میرا منصب بھی ہے اور میرا فن بھی، بس اسی دھن میں سکوت کے ہولناک صحرا میں لمحہ لمحہ سوچوں کی بستیاں بسا کر اُن میں لفظوں کے رنگ رنگ چراغ روشن کرتا ہوں۔ جانے کب سے جانے کب تک؟

ہوا مجھ سے برہم، سناٹا میرے تعاقب میں، حوادث مجھ سے دست و گریباں، محبتیں مجھ سے گریزاں اور شامیں میری آنکھوں پر اندھیرا 'باندھنے' کے لیے مضطرب، مگر میں مسافت نصیب، سفر مزاج 'گزشتہ' کی راکھ پر آئندہ کی دیوار اُٹھا کر اُس کی منڈیر پر اپنی آنکھیں جلا رہا ہوں، تاکہ میرے بعد آنے والوں کی تھکن لمحہ بھر کو ستا سکے!!

محسن نقوی کی کتاب 'طلوع اشک' سے اقتباس

انتخاب: اشعر جواد۔ کراچی

آنکھیں

اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کی ہیڈ لائٹس، جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ بہت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ہرگز نہیں، میں خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کرسکتا ہوں۔

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں جو حنیفہ کے چہرے پر تھیں، بے حد پُرکشش تھیں۔ معلوم نہیں ان میں کیا چیز تھی جو کشش کا باعث تھی۔ میں اس سے پیشتر عرض کرچکا ہوں کہ وہ قطعاً خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں کُھب رہی تھیں۔

حنیفہ نے مڑ کر میری طرف اپنی عجیب و غریب آنکھوں سے دیکھا۔

''بدرو کہاں ہے؟ میں نے اس سے پوچھا۔

''کون بدرو؟''

''وہ لڑکا جو میرے ساتھ تھا۔'' میں نے لڑکے کی طرف دیکھا جو تانگے کے پاس ہی تھا۔

''یہ کھڑا تو ہے۔''

''اچھا......!'' یہ کہہ کر اس نے بدرو سے کہا۔

''بدرو! مجھے اُتار تو دو۔'' بدرو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکل سے تانگے سے نیچے اتارا۔ میں سخت متحیر تھا۔ پچھلی نشست پر جاتے ہوئے میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

''کیا بات ہے یہ خود نہیں اتر سکیں؟'' بدرو نے جواب دیا۔

''جی نہیں، ان کی آنکھیں خراب ہیں...... دکھائی نہیں دیتا۔''

سعادت حسن منٹو کے افسانے 'آنکھیں' سے اقتباس

انتخاب: فیضان عثمانی۔ حیدر آباد

گناہ

ادب کی دنیا میں اگر مصنف ایسی کتاب تحریر کرے جس کے قاری میں گناہ کی رغبت پیدا

میلان پیدا ہو جائے تو ایسی تخلیق گناہ ہی کہلائے گی ایسے گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔ مصنف کا عمل تصنیف ہے اور یہ عمل خیر یا شر کے باب میں اپنا انجام ضرور دیکھے گا' گناہوں پر اکسانے والے کا انجام گنہگار کے انجام سے زیادہ خطرناک ہے۔ نیکی پر گامزن کرنے والا عمل نیک اعمال میں سب سے زیادہ مستحسن عمل ہے ادیب مرجاتا ہے ادب زندہ رہتا ہے اور ادب اپنی تاثیر پیدا کرتا رہتا ہے۔

واصف علی واصف کی کتاب 'قطرہ قطرہ قلزم' سے اقتباس
انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

محبت

چار لفظوں کو مجموعی طور پر جوڑنے کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر یہ انسانی خمیر میں شامل' خیر سے گندھا ہوا وہ انمول جذبہ ہے جو دل کی دھڑکن اور سانس کی ڈور سے کسی اٹوٹ اور دائمی رشتے کی مانند جڑا ہوا ہے۔ کہکشاں کے سبھی ستارے قوس قزاح کے سارے رنگ اور قدرت کے سبھی مناظر' اس کے مقابل ہیچ نظر آتے ہیں۔ اس کی خوشبو سے روح معطر' چاشنی سے دل و دماغ سرشار جبکہ اس پر ایقان بندے کو رب کے بہت قریب لے جاتا ہے۔

محبت ایک بے موسمی پھل ہے جو پت جھڑ' ساون' بسنت اور بہار کے سبھی ذائقے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ تو وہم و گمان' زبان و بیاں اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد خلائے بسیط کی وسعتوں تک میں پھیلی ایک لامحدود نعمت ہے۔ جو ازل سے ابد' شروع سے آخر اور زمین سے آسمان تک ہمیشہ موجود رہنے کے لیے بچھادی گئی ہے۔

محبت کہیں بھی کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ یہ مال دولت' جاہ و حشمت' رنگ و نسل' مذہب اور قوم ہرگز نہیں دیکھتی۔ دل تو کسی دوشیزہ کے مہندی والے ہاتھوں سے بنے پراٹھے' گرما گرم چائے یا ٹکسی سپاری کے ایک پیکٹ پر بھی ہار سکتا ہے۔

اکثر لوگ محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ یہ کس طرح دل پر وار کرتی ہے اور کتنے رنگ و انداز بدلتی ہے۔ محبت وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرنے' غمگین نغمے سننے' المیہ شاعری' ناول اور افسانے پڑھنے کا نام ہی نہیں۔ نا ہی یہ کوئی بازاری کھلونا ہے کہ پسند آنے پر دل بچوں کی طرح مچل اٹھے۔

محبت ہونا بھی ہر کسی کے نصیب میں نہیں یہ تو ایک عطا ہے گوہر نایاب ہے جو صرف نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ محبت تو سید وارث شاہ' سچل سرمست' میاں محمد بخش' کے صوفیانہ کلام' خواجہ غلام فرید' بابا بھلے شاہ اور شاہ حسین کی کافیوں میں ملتی ہے جنہیں سن کر ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ وجد میں آجائیں۔

یہ تو شاید ہما نامی پرندے جیسی ہے جس کے سر پر سوار ہوجائے اسے بادشاہ بنادے' یا پھر پارس پتھر کی طرح جو لوہے کو چھو کر بھی اکسیر بنادے۔

یہ بات بیٹے کے روپ میں نمودار ہوئی تو سر چڑھ کر بولی۔ کہیں آگ گل و گلزار ہوئی تو کہیں پتھر بھی سربسجود ہوگئے اور پھر جب حضرت امام حسین کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تو کفر مٹا کر رہتی دنیا تک اسلام کا نام روشن و منور کرگئی اور سچ تو یہ ہے کہ خداوند کریم نے اپنی محبت ہی کے صدقے پوری کائنات کی تخلیق کی اور اپنے نام کے ساتھ اپنے پیارے کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منسوب کرتے ہوئے محبت کو امر کردیا۔

مرسلہ: ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

عورت

باکرم کردار تاریخ روشن عظیم المرتبت پیکر بصیرت و بصارت تخلیق سرمایہ فکر' صنف نازک اسلامی معاشرے میں اس منصب پر فائز ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ تاریخ کے اوراق میں آج بھی سنہری لفظوں میں خواتین کی داستانیں موجود ہیں جن کو کسی بھی حال میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مقام افسوس عہد ساز خواتین شاذ و نادر نہیں ہیں بس آج تک دنیا حرف اور حرف بری عورتوں کا ہی سراغ زیادہ لگاسکی ہے۔ جبکہ یہ امر اپنی جگہ بجا ہے کہ جو مرد دنیا تعمیر کرتا ہے اس کو ایک عورت ہی پیدا کرتی ہے۔ یہ بات منطق سے بالاتر ہے کہ آج تک یہ باوقار عورت اپنے مساوی حقوق سے محروم ہے اور آج کے دور جدید میں بھی حوصلہ شکنی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور بہت جگہ پر انسانیت سوز سزائیں عورت کو سہنا پڑتی ہیں' قدرت نے عورت کو نازک بنایا ہے شاید اس لیے عورت دنیا کے جس کونے میں بھی موجود ہو اس کو مساوی حقوق فراہم نہیں ہیں یہ بات اور ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے میں خواتین کی تذلیل کے طریقے قدرے مختلف ہیں شاہرہ حیات پر عفت حیا کا یہ مجسم اپنے اندر جاہ وجلال کا سمندر رکھنے کے باوجود مسلسل زوال پذیر ہیں اور اس سے بڑھ کر قسمت کی کیا ستم ظریفی ہوگی کہ ذہن کے گوشوں میں ظلم و نفرت کے آتش فشاں لاوا ابل رہے ہیں' اس کے باوجود کہ اسلامی معاشرے میں عورت کو بلند مقام حاصل ہے زندگی کی گاڑی ہو یا کوئی آفت حاوی ہو خواتین نے ہر حال میں مردوں کا شانہ بشانہ ساتھ دیا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے لیکن اس سب کے باوجود مساوی حقوق سے ہر دور میں محروم ہی رہی ہے عورت نے اپنی آزادی کے لیے بہت سی تحریکیں چلائیں اور افسوس کہ عورت آزادی حاصل کر کے مزید ذمہ داریوں کے بوجھ تلے آ گئی افسوس کہ عورت آج بھی غیرتوں کے نام پر قتل ہو رہی ہے تنگ ذہن معاشرے میں عورت کا جینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور ناممکن کے باوجود عورت نے ممکن بنایا ہوا ہے پچھلی صدیوں میں جو لوگ مریخ پر گئے تھے اب وہ واپس آ رہے ہیں زمانے کی جدیدیت مزید بڑھ رہی ہے اور اس کے باوجود عورت گھٹ گھٹ کر مر رہی ہے عورت اچھی ہو یا بری ہو دونوں صورتوں میں اپنے مرد کی عکاسی کرتی ہے۔

مرسلہ: حسین خواجہ۔ مچن آباد

اولاد کی اخلاقی تربیت

اولاد کی تربیت میں آج کل ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اخلاقی تربیت پر قطعاً دھیان نہیں دیا جاتا یعنی اولاد کی رفتار و گفتار کیسی ہے اور اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسے دوستوں کے ساتھ ہے؟ اس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ معاشرہ اور سوسائٹی اور مجلسی ساتھیوں کے اثرات ضرور ایک دوسرے پر پڑتے ہیں۔ اگر اولاد کا اٹھنا بیٹھنا اچھے اخلاق والے دوستوں کے ساتھ ہوگا تو اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ برے دوستوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے برے اخلاق پیدا ہوتے ہیں مثلاً ایک لڑکا نمازی ہے' اس کی رفتار و گفتار میں سکون و وقار ہے' بڑوں سے ادب و احترام سے ملتا ہے' ساتھیوں سے سلام و دُعا کے ساتھ پیش آتا ہے تو اگر اس کے ساتھ کوئی دوسرا لڑکا اٹھے بیٹھے گا تو اس کے دل میں بھی نماز کی رغبت پیدا ہوگی۔ بڑوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنے اور ساتھیوں سے سلام و دُعا سے پیش آنے کے اثرات پیدا ہوں گے۔

اسی طرح اگر ایک لڑکا کھیل کا عادی ہے تو جو لڑکا اس کے ساتھ اٹھے بیٹھے گا' وہ بھی کھیل کا عادی بنے گا۔

مولانا مفتی عاصم عبداللہ صاحب کی کتاب ''شاہراہِ جنت'' سے انتخاب

حسنِ انتخاب: مور شاہد حسین۔ قمر

انمول خزانہ

اہلِ دانش کی باتیں

☆ غافل کی دنیا طلبی جاہل کے ترک دنیا سے بہتر ہے۔ (یحییٰ بن معاذ رازیؒ)

☆ توبہ کے بعد ایک گناہ بدتر ہے بہ نسبت ستر گناہوں کے جو توبہ سے پہلے کیے گئے ہوں۔ (رازیؒ)

☆ عالم جہل کو جہالت سمجھتا ہے اور جاہل علم کو۔ (حضرت امام شافعیؒ)

☆ تم غلام ہو اس شخص کے سامنے جس سے تم محبت کرتے ہو اس لیے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ (خلیل جبران)

☆ خاموشی اظہار نفرت کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ (برنارڈ شا)

☆ تمہاری شادمانی دراصل تمہارا غم ہے جسے بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ (برنارڈ شا)

☆ پڑھا لکھا بے وقوف اپنی حماقت کو خوش نما الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے لیکن پھر بھی وہ بے وقوف ہی رہتا ہے۔ (فرینکلن)

☆ ہر مذہب اچھائی کی تعلیم دیتا ہے۔ خرابی تو ہمارے اپنے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ (فرینکلن)

مرسلہ: آیت سلیم' حیدر آباد۔

اقوالِ زریں

☆ جو عمل آج ناگوار گزرتا ہو وہ آخرت میں میزان پر زیادہ وزن ہوگا۔

☆ دنیا کی حسین شئے صرف ماں ہے۔

☆ آزادی کا ایک لمحہ غلامی کے ہزار سال سے بہتر ہے۔

☆ اللہ پرندے کو رزق دیتا ہے مگر اس کے گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔

☆ ناکامی کا خوف ہی ناکامی کی بنیاد ہے۔

☆ مایوسی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

☆ عزت جھوٹے کے لیے نہیں ہے۔

☆ اپنے دوست سے خالی محبت کرو لیکن اسے راز نہ دو۔

☆ جو دوسروں کے غم سے بے نیاز ہے' وہ انسان کہلانے کے لائق نہیں۔

☆ آغاز کا خیال رکھو' انجام خود بخود بہتر ہوگا۔

☆ اچھی کتابوں کا مطالعہ دل کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

☆ قطرہ دریا میں حل ہو جائے تو پھر قطرہ نہیں رہتا۔

☆ اصولوں کی خاطر لڑنا آسان ہیں لیکن ان پر کاربند رہنا مشکل ہے۔

مرسلہ: حسین خواجہ' منچن آباد۔

علم

☆ علم ایک لازوال دولت ہے۔

☆ علم حاصل کرو' چاہے اس کے لیے چین کیوں نہ جانا پڑے۔

☆ علم دل کی روشنی ہے۔

☆ علم اگر اچھا ہو تو دل کا چین' برا ہو تو دل کا روگ ہے۔

☆ علم سفر کا ساتھی ہے۔

☆ علم کے بغیر انسان ادھورا ہوتا ہے۔

☆ علم ایک خوبی ہے۔

☆علم کے سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔

مرسلہ: عالیہ نثار۔کوئٹہ

سنہری باتیں

☆تسلیم کے بعد تحقیق گمراہ کر دیتی ہے۔

☆بدی کی تلاش ہو تو اپنے اندر جھانکو۔ نیکی کی تلاش ہو تو دوسروں میں ڈھونڈو۔

☆انسان کا ذوقِ سفر اس کا آدھا رہنما ہے یا یوں کہ ذوقِ سفر نہ ہو تو کوئی رہنما نہیں۔

☆موت، زندگی کی محافظ ہے اور زندگی، موت کا عمل ہے۔

☆بے اعتدالی کی اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے کہ انسان کو خوراک کی بجائے دوا کھانی پڑے۔

☆جب تک آنکھ میں آنسو ہیں، انسان، خدا کا تصور ترک نہیں کر سکتا۔

☆انبیاء کا آغاز اولیاء کا انجام ہے اور انبیاء کے انجام کی کوئی حد نہیں۔

☆دولت مندوں کے ساتھ محبت، عزت و وقار رکھو اور غربا و فقرا کے ساتھ انکساری کے ساتھ رہو۔

☆طاقت ور وہ ہے جو غصہ پی جائے۔

مرسلہ۔ مسز نگہت غفار، کراچی۔

ذرا مسکرائیے

منافع

ایک تاجر کو توقع سے بڑھ کر منافع ہوا، اس نفع میں اس کے پرانے اور وفادار ملازم کا بہت ہاتھ تھا۔ تاجر نے اپنے ملازم کو بلایا اور پانچ سو روپے کا چیک دے کر کہا۔

”یہ تمہارا انعام ہے۔“

ملازم کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس نے چیک پر نظر ڈالے بغیر مالک کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ تاجر نے اس کو روکا اور کہا۔

”ذرا سننا تو، چیک کو سنبھال کر رکھنا۔ اگر آئندہ سال بھی اتنا ہی منافع ہوا تو اس چیک کو میرے پاس لے آنا، میں دستخط کر دوں گا۔“

مرسلہ: اقبال حسین۔ کراچی

سمجھوتہ

ایک منیجر نے اپنے سیکریٹری سے کہا۔ ”اب شادی تو ہم نے کر ہی لی ہے اس لیے یہ بات میری بیوی سے پوشیدہ رکھنا اور ہوشیار رہنا، اگر اسے ہماری شادی کا علم ہو گیا تو وہ ہمارا جینا دوبھر کر دے گی۔“

سیکریٹری نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ کو بھی میرے پہلے شوہر سے خبردار رہنا ہوگا کیونکہ وہ بڑا ظالم آدمی ہے، بات بات پر پستول نکال لیتا ہے۔“

مرسلہ: محمد علی۔ لاہور

گانا

”ساری محفل دیوانہ وار اس کا گانا سن رہی ہے مگر تم ہو کہ مسلسل اسے گھورے جا رہی ہو؟“

”میرے گھورنے کا نتیجہ ہے کہ وہ اتنا اچھا گا رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”گانے والا میرا شوہر ہے۔“

مرسلہ: رابیل شاہ۔ دادو

ثبوت

”ہمیں تم ہی جیسے قوی آدمی کی ضرورت تھی جو ہماری کمپنی میں چوکیداری کے فرائض انجام دے سکے۔“

”جی ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی صلاحیت کا عملی ثبوت دے کر آیا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”دروازے پر کھڑے گیارہ آدمی جو ملازم کے امیدوار تھے، ان سب کو مار بھگایا۔“

مرسلہ: عثمان خان۔ کوئٹہ

بزم آرائی

غزل

کل چودھویں کی رات تھی' شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے' کچھ نے کہا چہرہ ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے' ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیئے' ہم چپ رہے' منظور تھا پردہ ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے' پربت ترے' بستی تری' صحرا ترا
ہم اور رسم بندگی آشفتگی؟ افتادگی
احسان ہے کیا کیا ترا' اے حسن بے پروہ' ترا
دو اشک جانے کس لیے پلکوں پہ آ کے ٹک گئے
الطاف کی بارش تری' اکرام کا دریا ترا
اے بے دریغ و بے اماں' ہم نے بھی کی ہے کب فغاں؟
ہم کو تری وحشت سہی' ہم کو سہی سودا ترا
دوستی ہو تو چل' کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا' رسوا ترا' شاعر ترا' انشا ترا

ابن انشا

حسن انتخاب: نوید۔ لاہور

غزل

کم ستاروں کی لڑی ہے
رات ویران پڑی ہے
آگ جب دن کو دکھائی
راکھ سورج سے جھڑی ہے
غیب ہے دل سے زیادہ
دید آنکھوں سے بڑی ہے
گر نہ جائے کہیں آواز
خامشی ساتھ کھڑی ہے
لفظ گونگوں نے بنایا
آنکھ اندھوں نے گھڑی ہے
رائی کا دانہ یہ دنیا
کوہ ساری پہ اڑی ہے
وقت کے پاؤں میں کب سے
پھانس کی طرح گڑی ہے

احمد جاوید

حسن انتخاب: فہیم صدیقی۔ اسلام آباد

غزل

پہلے تو کسی کو رلایا نہیں کرتے
ہاں' خود سے خفا ہو تو منایا نہیں کرتے
اک بار گرا دیں جسے ہم اپنی نظر سے
اس شخص کو پھر دل میں بٹھایا نہیں کرتے
بولے جو محبت سے تو سوچیں گے کبھی نا
نفرت سے مگر ہاتھ ملایا نہیں کرتے
اس شخص سے مل کر مجھے احساس ہوا ہے
جو پیڑ بڑے ہوتے ہیں' سایہ نہیں کرتے
رکھتے ہیں انہیں ہم سدا سینے سے لگا کر
دکھ اپنا کسی کو بھی سنایا نہیں کرتے
یہ کھیل محبت کا ہے پھر سوچ لو ارشد
کھو دیتے ہیں سب کچھ یہاں' پایا نہیں کرتے

ارشد ملک

حسن انتخاب: مدیحہ شاہ۔ حیدرآباد

غزل

جب تیرا درد میرے ساتھ وفا کرتا ہے
ایک سمندر میری آنکھوں میں بہا کرتا ہے
اس کی باتیں مجھے خوشبو کی طرح لگتی ہیں
پھول جیسے کوئی صحرا میں کھلا کرتا ہے
میرے دوست کی پہچان یہ ہی کافی ہے
وہ ہر اک شخص کو دانستہ خفا کرتا ہے
اور تو کوئی سبب اس کی محبت کا نہیں
بات اتنی ہے کہ وہ مجھ سے جفا کرتا ہے

جب خزاں آئے تو لوٹ آئے گا وہ بھی فراز
وہ بہاروں میں ذرا کم ہی ملا کرتا ہے

احمد فراز

حسن انتخاب: تحسین جو ،یونیورسٹی شریف

کان کا بالا

شام ڈھلے نمناک سڑک پر
برف سی رنگت والی لڑکی
کس کا رستہ دیکھ رہی ہے؟
کھڑکی کھول کے میں کیا پوچھوں؟
کہہ دے گی وہ نین چرا کر
دنیا کتنا شک کرتی ہے
کان کا بالا ڈھونڈ رہی ہوں

پروین شاکر

حسن انتخاب: صدف۔ کراچی

واہمہ

تمہارا کہنا ہے
تم مجھے بے پناہ شدت سے چاہتے ہو
تمہاری چاہت
وصال کی آخری حدوں تک
مرے فقط میرے نام ہوگی
مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے
مگر قسم کھانے والے لڑکے......
تمہاری آنکھوں میں ایک تل ہے

پروین شاکر

حسن انتخاب: ڈاکٹر روبینہ، بھکر

سندیسہ

اسے کہنا
کبھی ملنے چلا آئے
ہمارے پاؤں میں جو راستہ تھا،
راستے میں پیڑ تھے
پیڑوں پہ جتنی طائروں کی ٹولیاں
ہم سے ملا کرتی تھیں
وہ اب اڑتے اڑتے تھک گئی ہیں

امجد اسلام امجد

حسن انتخاب: صفیہ ذاکر، کراچی

یہی دکھ ہے

میرا یہ المیہ ہے
میں نے
ان لوگوں کو
اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے
جنہیں میری محبت
میری چاہت
میرے جذبوں
اور مرے احساس کی سچائی کی
وقعت کا اندازہ نہیں ہرگز
جنہیں میری محبت
بس برائے نام لگتی ہے
یہی دکھ ہے
کہ جس کے دکھ میں
مجھ کو زندگی ناکام لگتی ہے
غموں کا جام لگتی ہے

سید واثق

حسن انتخاب۔ عارفہ صدیقی۔ لاہور

"المیہ"

وصل کی
سفید دیواروں پر
ہجر کے سیاہ جالے
آ لٹے پڑے ہیں

مریم شاہ بخاری/حسن انتخاب: ایم کاشف

☆☆......☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

سرکار کی ولادت کا مہینہ تمام مسلمانوں کو مبارک ہو اللہ ہم سب کو ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ پچھلے دنوں میری طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے جوابات میں کچھ تاخیر ہوئی۔ میں ایک بار پھر اُن تمام لوگوں سے گزارش کروں گا جو سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے مجھے میسج بھجواتے ہیں براہ کرم خط کے ذریعے رابطہ کریں اس طرح غلطی کا احتمال نہیں ہوتا۔

ایک بار پھر نماز کی پابندی کی تاکید کروں گا کہ اس میں بھلائی ہے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھو ساتھ دو بس یہی عمل آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔

☐ رضوانہ۔ لاہور۔

○ بیٹی رضوانہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! پہلے بھی کہا تھا کہ تعویذ منگوالو اَب پھر کہہ رہا ہوں۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ لغو چیزوں پر خرچ کرتے ہوئے ہم بالکل سوچتے نہیں ہیں، نہ ہی مشورہ کرتے ہیں مگر جہاں کلامِ الٰہی کی بات ہو، وہاں ہر شخص سے مشورہ کیا جاتا ہے جو نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ بہرحال اگر تعویذ منگوانا چاہو تو جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

☐ سجاد۔ کراچی۔

○ محترم و مکرم بابا جی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! میں نے کچھ عرصہ پہلے آپ سے پڑھائی کے متعلق وظیفہ لیا تھا اور مکمل طور پر نہیں کر پایا تھا پھر آپ کو خط لکھا تھا کہ کوئی ایسا وظیفہ دے دیں جو کہ نماز کے بغیر ہو تو آپ نے مجھے بتایا تھا کہ ایسا کوئی وظیفہ نہیں جو کہ نماز کے بغیر کیا جا سکے۔ بابا جی! میں بہت شرمندہ ہوا تھا اور پھر آپ کو خط لکھنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی۔ اَب کافی عرصے کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے اندر خود اعتمادی نہیں ہے۔ دوسروں کی باتوں سے میں پزل ہو جاتا ہوں۔ صبح پڑھائی کرتا ہوں، شام کو کچھ وقت میں کرکٹ کھیل لیتا ہوں تاکہ ذہن فریش ہو جائے اور تھوڑی سی تفریح بھی ہو جائے۔ بابا جی! میں باؤلنگ کراتا ہوں اور اچھی خاصی کرا لیتا ہوں لیکن بابا جی! بعض اوقات پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ اگر میں تھوڑی سی بھی غلطی کروں تو لوگ مجھ پر طنز کرنے لگتے ہیں، مجھ پر باتیں کرتے ہیں جس سے میں اور پزل ہوتا ہوں اور زیادہ خراب

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے' چھائیاں ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوا سچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

باؤلنگ ہوتی ہے۔ لوگوں کی شکلیں دیکھ کر اور اُن کی باتیں سن کر مجھے اور زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور تفریح کی بجائے الٹا طبیعت خراب ہو جاتی ہے اس لیے کوئی ایسا وظیفہ دے دیں جو کہ میری پڑھائی اور کرکٹ' ہر فیلڈ میں میرے کام آئے' ہر مشکل میں میرے کام آئے اور ایسے وقت وظیفہ کرنے کو دیجیے گا جس وقت میں اِسے آسانی سے کروں یعنی کوئی کام کاج وغیرہ اُس وقت نہ ہوتے ہوں۔ ایک خط میں' میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرا جسم بہت دبلا پتلا ہے۔ لوگ کافی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ نے اِس کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔

☆ بیٹے سجاد......! اللہ کو یاد کرو۔ اسی سے مدد مانگو اور بس جو بندوں سے امید رکھتا ہے' وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ ہاں' اپنی جانب سے بھی کوئی کسر مت چھوڑو۔ باقی معاملات اللہ کے سپرد کردو۔

□ نور۔ مقام نامعلوم۔

☆ بیٹی نور! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 11 بار سورۃ الفاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ بہت مختصر مگر بہت جلالی وظیفہ ہے۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ عابدہ۔ پشاور

o بیٹی! یاد رکھو' جو اپنے والدین کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں' وہ کبھی خوش نہیں رہتے۔ دنیا تو چند روزہ ہے مگر وہ یہیں عبرت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ تم صبر سے کام لو۔ اللہ کو یاد کرو اور اپنے معاملات اللہ کے سپرد کردو۔ بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔

□ عالیہ۔ کراچی۔

o بیٹی عالیہ! تمہاری بیٹی کا استخارہ حق میں ہے۔ تم بیٹی سے کہو کہ وہ بعد نمازِ فجر سورۃ طٰہٰ پڑھے اور دُعا کرے۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ شارق۔ کینیڈا۔

o بیٹے شارق......! جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو اور خط رجسٹرڈ بھیجو۔ تمہارا مسئلہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ گھر والوں کو حقائق سے مطلع کرو۔

□ غفران۔ کراچی۔

o بابا جان! السلام علیکم! بابا جان! اللہ آپ کی عمر لمبی کرے اور اسی طرح آپ لوگوں کے کام آئیں۔ بڑی امید لے کر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بہن کینیڈا (Canada) میں رہتی ہے۔ وہ مجھے وہاں بلا کر میری شادی کرانا چاہتی ہے اور میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ گزشتہ ایک سال میں بہن نے جہاں جہاں میرا رشتہ ڈالا' وہاں سے انکار ہو جاتا ہے اس لیے آپ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کے ذریعے میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ اِس سے پہلے بھی میں نے کئی عاملوں سے رابطہ کیا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ آپ جو وظیفہ دیں' وہ نمازِ عشاء یا فجر کے بعد کا ہو۔ میں آپ کو بہت دُعائیں دوں گا۔

☆ بیٹے غفران......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مناسب ہوگا' تم مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے ہمراہ مختصر سا وِرد بھی دوں گا۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ خط کے ساتھ جوابی لفافہ ضرور اِرسال کرو جس پر واضح اپنا پتا تحریر کرو۔

□ امینہ۔ لاہور۔

☆ بیٹی امینہ......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ نمل' آیت 300-30' بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ نائمہ۔ حیدرآباد۔

o باباجی! السلام علیکم! باباجی! میری منگنی ہوچکی ہے اور میں اِس منگنی سے بہت خوش بھی ہوں' لیکن ایک مسئلہ یہ ہوگیا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ بابا جی! میں اپنے منگیتر کو بہت چاہتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُسے نماز روزے کا پابند بنائے کیونکہ اس کا مذہب کی طرف رجحان بہت کم ہے۔ وہ فقط جمعے کی نماز پڑھتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ قرآن اور سنت پر عمل کرکے زندگی گزارے تاکہ ہم اِس جہاں میں بھی کامیاب ہوں' اُس جہاں میں بھی۔ پلیز باباجی! کوئی ایسا وظیفہ بتایئے' عشاء کی نماز کے بعد ہو تو بہترین ہے کیونکہ اِسے توجہ سے پڑھ سکتی ہوں۔

☆ بیٹی نائمہ......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی کیا کرو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ قرآن شریف کی تلاوت روزانہ کیا کرو۔ جب تمہارا اپنا عمل اچھا ہوگا تو خود بہ خود تمہارے ہونے والے شوہر کو بھی ترغیب ہوگی۔ تم بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ مزمل ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ احمد خان۔ پشاور۔

o باباجی! عرصہ 15 سال سے آپ کا کالم پڑھ رہا ہوں۔ بہت سے مسائل کا حل بھی آپ ہی کی بدولت ملا۔ باباجی! اَب جو مسئلہ ہے' وہ کافی

بالوں کا گرنا' خشکی' بے جان بال ان سب کے لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو سال پرانا نسخہ...... اب آپ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ رابطہ
35893121-3589312

سنگین ہے۔ میری دو بیٹیاں ہیں' دونوں خوش شکل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑی بیٹی کی میں نے اپنے بہت اچھے جاننے والوں میں شادی کی جو صرف 15 دن چلی۔ بیٹی گھر واپس آگئی اور پھر بچی کی ضد کی وجہ سے ہم نے خلع لے لی۔ لڑکے والے طلاق کے لیے تیار نہیں تھے۔ بیٹی نے کیوں ایسا کیا' ہمیں سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت پوچھنے پر بھی اس نے کبھی کوئی بات نہیں بتائی۔ اِس بات کو اَب 3 سال ہوگئے۔ وہ اَب شادی کے لیے بالکل تیار نہیں۔ اکیلے ہی بہت خوش رہتی ہے۔ اَب میں دوسرے مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ چھوٹی بیٹی کی شادی اس سے پوچھ کر کی لیکن وہ بھی واپس آگئی اور کسی طرح واپس جانے کو تیار نہیں۔ باباجی! ہم میاں بیوی بہت پریشان ہیں۔ چھوٹی بیٹی کے سُسرال والے بھی مسئلہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اُس کا شوہر کئی بار گھر بات کرنے آچکا ہے مگر وہ بہت ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کررہی ہے۔ باباجی! آپ کو اللہ رسولؐ کا واسطہ' میری مدد کریں۔ آخر ہماری بچیوں کے ساتھ ایسا کیوں ہورہا ہے؟

☆ عزیزم! بعض اوقات انسان کا بڑا بول اُس کے سامنے آجاتا ہے۔ سوچو' کہیں تم نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنی ہو؟ نماز کی پابندی رکھو۔ دُرود شریف بہت پڑھو اور بچیوں سے کچھ مت کہو۔ خوب صدقہ خیرات کرو۔ ابھی کوئی انتہائی قدم مت اٹھاؤ۔

اندرونی اور بیرونی زخموں، آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچا رہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔
جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی، دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

مناسب ہوگا، مجھ سے دونوں بچیوں کے لیے تعویذ منگوالو۔ تمہاری دونوں بچیاں بدنظر کا شکار ہیں لہٰذا وہ تمہیں کوئی بھی جواب دینے سے قاصر ہیں۔ بہتر بھی یہی ہے کہ اُن سے سوال جواب مت کرو۔ یہ آزمائش ہے۔ اللہ سے مدد کے طلب گار رہو۔ وہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ جب جب یاد آئے، آیت الکرسی پڑھ کر بچیوں پر ضرور دَم کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ شاہد۔ U.K۔

○ بابا جی! میں اور میرے گھر والے بہت عرصے سے آپ کے کالم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بابا جی! میں آپ سے پہلی دفعہ مخاطب ہوں۔ بابا جی! میں نے یہاں اپنی پسند سے ایک یہودی لڑکی سے شادی کی۔ اُس نے اسلام قبول کیا۔ پہلے تو میرے گھر والے اس کے بہت خلاف تھے مگر رفتہ رفتہ اس نے ان سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ میرے ماں باپ کی بہت خدمت کرتی تھی اور بہن بھائیوں سے بالکل دوستوں جیسا رویہ رکھتی تھی۔ ہم سب خوش تھے مگر جب میرا بیٹا پیدا ہوا تو اس نے اس کا مسلمان نام رکھنے سے انکار کر دیا۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد تو وہ بالکل ہی بدل گئی اور بچوں کی تربیت اپنے مذہب پر کرنے لگی۔ بابا جی! جب میں نے سختی کی تو اس نے پولیس کو بلا لیا۔ ہماری علیحدگی ہوگئی مگر میں بچوں سے ملتا رہا لیکن اب جو بچوں سے ملنے گیا تو پتا چلا کہ وہ بچوں کو لے کر اپنے والدین کے گھر اسرائیل چلی گئی ہے۔ بس بابا جی! جب سے مجھے چین نہیں، جب آنکھیں بند کرتا ہوں، بچوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔ بابا جی! میری مدد کریں۔ اللہ اس عورت کے دل میں رحم ڈالے اور وہ مجھے میرے بچے واپس کر دے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میرے بچے مجھ سے ہزاروں میل دور غیر مذہب پر پرورش پا رہے ہیں تو میرا دل غم سے پھٹنے لگتا ہے۔ میری مدد کریں۔

☆ بیٹے شاہد! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ تمہارا بہت بڑا نقصان ہو چکا ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں۔ اللہ سے دُعا کرو کہ وہ تمہیں صبر عطا فرمائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری اس تکلیف کی وجہ تمہاری مذہب سے دوری ہے۔ بہرحال بہت نقصان ہو چکا ہے۔ اَب اللہ سے معافی مانگو۔ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلو اور خوب صدقہ خیرات کرو۔ شاید اللہ کو تمہاری یہ اَدا بھا جائے اور وہ تمہیں تمہاری اولاد سے ملا دے۔ بکثرت یَاجَبَّارُ کا وِرد کیا کرو۔

□ انعم قادر۔ کراچی۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں ''مسئلہ یہ ہے'' بڑی پابندی اور شوق سے پڑھتی ہوں اور پسند بھی کرتی ہوں۔ جس طرح آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی اور لمبی زندگی عطا فرمائے اور آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ (آمین!) میں آپ کی خدمت میں اپنی دوست کا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ اُس کی شادی کو 5 سال ہوگئے ہیں

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکثیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ دو مرتبہ امید بندھی تھی لیکن...... اگر آپ اُس کے لیے کوئی وظیفہ اور تعویذ تجویز کر دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وظیفہ وہ خود پڑھے گی۔ آپ اُس کے لیے دُعا کروا دیجیے گا۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہاری دوست کی حاجت قبول فرمائے۔ اولاد کے لیے میں تعویذ دیتا ہوں' اِس کے لیے مجھ سے جوابی لفافے کے ہمراہ براہِ راست رابطہ کرو۔

□ احمد سلیم۔ چکوال۔

o باباجی! میں بڑا پریشان انسان ہوں' گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ بوڑھے والدین' 5 بہنیں اور بیوہ پھوپھی کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ آج کل مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے۔ محنت مزدوری کرتا ہوں۔ اکثر گھر میں فاقہ ہوتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟ دل نہیں مانتا کہ بہنوں کو کام پر لگاؤں۔ باباجی! ابو جب تک صحت مند رہے' بہنوں نے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالا مگر اَب حالات بہت خراب ہیں۔ میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہا۔ اکثر سوچتا ہوں کہ کسی اور شہر میں جا کر قسمت آزمائی جائے۔ آپ بتائیں' کیا یہ فیصلہ درست ہے؟

☆ بیٹے احمد سلیم! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کی' عادت ڈالو۔ کام کرنے میں کوئی قباحت نہیں' تمہارے والد کے زمانے میں حالات کچھ اور ہوں گے' اَب بہت مختلف ہیں۔ بے تحاشا مہنگائی کی وجہ سے ایک شخص پورے کنبے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ بہرحال تم بہنوں سے کہو' بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ واقعہ ضرور پڑھیں اور رزق میں برکت کی دُعا کریں۔ بیٹے! تم بھی یَامَالِکُ الْمُلْکُ کا بہت ورد کیا کرو۔ یاد رکھو' اللہ سے مدد مانگنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ رزق اپنے شہر میں رہ کر ہی کوشش کرو۔

□ تحسین۔ شکارپور۔

☆ بیٹی تحسین! اپنی غلطیوں کا بوجھ کسی اور پر ڈالنا بہت غلط ہے۔ تم سمجھ دار ہو' اپنا اچھا برا سمجھتی ہو لہٰذا جو غلطی تم سے ہوئی ہے' وہ ناسمجھی میں نہیں ہوئی ہے۔ حل صرف یہ ہے کہ خوب گڑگڑا کر اللہ سے معافی مانگو۔ چلتے پھرتے ہر لمحے توبہ استغفار پڑھو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات کرو۔ اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرو۔ وہ معاف کر دے گا تو تمہاری سختی بھی ختم ہو جائے گی۔

□ نجمہ کھوسو۔ دادو۔

o باباجی! اللہ آپ کو اِسی طرح لوگوں کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں بہت مجبور ہوں' دو دفعہ خودکشی کی کوشش بھی کر چکی ہوں۔ باباجی! مجھے میری خالہ نے پالا۔ پیدا ہوتے ہی انہوں نے مجھے گود لے لیا۔ میری عمر اس وقت 20 سال ہے اور یہ سارا وقت میں نے کراچی میں گزارا۔ میرے خالو بینک میں اچھی جاب پر تھے۔ دو سال قبل خالو اور خالہ میں علیحدگی ہوگئی۔ اَب میں اور خالہ رہتے ہیں۔ خالہ اسکول میں

جاب کرتی ہیں اور میں ایک پرائیویٹ ادارے میں۔ ہمارا گزارہ بہت اچھی طرح ہو رہا ہے۔ اَب اچانک میرے والدین کو میرا خیال آ گیا۔ وہ مجھے واپس بلانا چاہتے ہیں۔ دراصل انہوں نے گاؤں میں میری بات طے کر دی ہے۔ وہ شخص بالکل گنوار ہے لیکن کیونکہ میرا بھائی اُس کی بہن سے شادی کر رہا ہے اس لیے یہ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔ بابا جی! اس رشتے سے اچھا ہے کہ میں مر جاؤں۔ شادی سے انکار کیا تو گھر والے قتل کی دھمکی دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ایسا ہوتا بھی ہے۔ اللہ مجھ پر رحم فرمائے۔ آپ میری مدد کریں۔

☆☆بیٹی نجمہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! بے شک حالات بہت خراب ہیں مگر سچا مسلمان وہی ہے جو اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان رکھتا ہو۔ بعض اوقات ہمیں لگتا ہے کہ ہر جانب اندھیرا چھا گیا ہے مگر یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے۔ مکمل اعتقاد کے ساتھ اللہ کے حضور گڑگڑا کر دُعا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ میں بھی تمہارے لیے خاص دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ انشاء اللہ سب خیر ہوگی۔

□ بلقیس بھٹی۔ ملتان۔

○ بابا جی! میں بڑی پریشان ہوں۔ شادی کو 7 سال ہوئے ہیں۔ 3 بچے ہیں۔ شوہر بہت اچھے ہیں مگر میری ساس سفلی عمل بہت کرواتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں بے سکونی رہتی ہے۔ جب تک میرے سُسر زندہ رہے، حالات قابو میں تھے مگر اَب بہت پریشانی ہے۔ میرے شوہر روزی کمائیں یا ان چکروں میں پڑے رہیں؟ میں انہیں پہلے تو بتاتی تھی، اَب بتاتی بھی نہیں۔ وہ مانتے ہی نہیں۔ بابا جی! اس گندے عمل سے چھٹکارے کے لیے کوئی وظیفہ دیں جس کی عام اجازت بھی دیں کیونکہ مذہب سے دوری کی وجہ سے یہ چیز بہت بڑھ گئی ہے۔

☆☆بیٹی بلقیس……! اللہ تمہاری ساس پر رحم فرمائے۔ ایسی حرکتیں کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور پھر معافی بھی قبول نہیں ہوتی۔ تم ہر نماز کے بعد الحمد شریف، چاروں قُل اور سورۃ البقرہ کا پہلا رُکوع اور آخری رُکوع پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی گھر کے تمام افراد کو پلاؤ۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں کہ کس وقت پلانا ہے۔ اِس عمل کی تمام پڑھنے والوں کو اجازت ہے۔ اِس کو اپنی عادت میں شامل کرنا بہت مناسب ہے۔ دافعِ بَلیّات کے لیے یہ عمل نہایت موزوں ہے۔

□ رعنا شاہ۔ دادو۔

○ بابا جی! یہاں میری ایک بہت اچھی دوست ہیں، وہ آپ کو بڑی پابندی سے خط لکھتی ہیں۔ اُن کے ذریعے آپ کا پتا چلا۔ بابا جی! میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ شادی کو 13 سال ہو چکے ہیں۔ اَب تو خود بھی کبھی کبھی امید جواب دے جاتی ہے مگر پھر ایک آس سی بندھ جاتی ہے۔ بابا جی! آپ کو اپنے رَب کا واسطہ، میری مدد کریں اور مجھے ایسا جلالی تعویذ دیں جس کی بدولت میں اولاد کی نعمت پالوں اور لوگوں کی طنز اور ترحم بھری نظروں سے بچ سکوں۔ اصل میں میرے میاں بھی اکلوتے ہیں اور میں بھی ایک ہی اولاد ہوں۔ بابا جی! پلیز، مجھے تعویذ بھجوا دیں، یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

☆☆بیٹی رعنا! اللہ تمہاری دُعا قبول فرمائے۔ بیٹی! میں کلامِ الٰہی دیتا ہوں مگر کامیابی صرف اُنہی

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

لوگوں کو ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا رکھتے ہیں اور خوشی اور غم دونوں میں اس کے شکرگزار رہتے ہیں۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو اور تھوڑی سی تفصیل بھی اِرسال کرو۔ اپنی عمر‘ اپنے شوہر کی عمر‘ مکمل نام اور والدین کے مکمل نام۔ اللہ پر مکمل اعتقاد رکھو‘ وہ ضرور کرم کرے گا۔

□ شاہد پاشا۔ کراچی۔

☆ بیٹے شاہد...... ! نہ تو ملتا ہوں اور نہ ہی کوئی آستانہ رکھتا ہوں۔ عام سا انسان ہوں بس قرآن مجید سے کتنا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے‘ لوگ بھول گئے ہیں۔ میں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میری خدمت کی بجائے اپنے والدین اور گھر والوں کی خدمت کرو اور اُن کی ذمے داریاں پوری کرو‘ یہ بھی جہاد ہے۔

□ بیٹی۔ جڑانوالہ۔

ο محترم باباجی! السلامُ علیکم! میں اِس بات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں کہ آپ بہت اچھے وظیفے بتاتے ہیں۔ میں بھی آپ کی توجہ کی منتظر ہوں۔ مجھے اپنے مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور اَب میں بہت مجبور ہوں کہ آپ کی خدمت میں اپنا مسئلہ پیش کرنے لگی ہوں۔ شاید اِس کے حل کا کوئی سبب بن جائے اور میری قسمت سنور جائے۔ باباجی! میں ایک لڑکے سے بہت پیار کرتی ہوں‘ وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ مجھے بہت اہمیت دیتا تھا لیکن اَب وہ کچھ بدل گیا ہے یا شاید صرف میں ایسا محسوس کر رہی ہوں اور وہ کیوں بدل رہا ہے؟ اِس کی وجہ صرف میرا موٹاپا ہے۔ میرے اور اُس کے رشتے کے درمیان صرف یہی دیوار ہے کہ میں موٹی ہوں۔ میری ذات بھی اُس سے ملتی ہے۔ امیر لڑکا ہے وہ اُس کے گھر والے میرے بارے میں جانتے ہیں لیکن انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہے اور وہ لڑکا بھی اِسی ڈر سے رشتہ نہیں بھیجتا کہ مجھے دیکھ کر وہ کہیں انکار نہ کردیں کہ لڑکی بہت موٹی ہے اور باباجی...... ! میں یہ بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔ میں اُس سے بہت پیار کرتی ہوں اور اُس نے مجھ سے بہت دفعہ کہا ہے کہ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا‘ بس جلدی سے اسمارٹ ہوجاؤ اور میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی اسمارٹ نہیں ہوسکی۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ میں اپنے موٹاپے کی وجہ سے اُسے کھو نہ دوں۔ مشکل یہ ہے کہ اُس کی ماں بھی بہت سخت ہے اور اُس کی ماں کو موٹی لڑکیاں بھی پسند نہیں اور انہوں نے مجھے دیکھے بِنا ہی کہہ دیا ہے کہ اگر وہ موٹی ہے تو میں انکار کردوں گی۔ میں اُس کے پیچھے بہت روتی ہوں۔ بعض اوقات تو میرا بس نہیں چلتا کہ میں مرجاؤں۔ میں اُسے ہر حال میں پانا چاہتی ہوں اور مجھے اپنے خدا سے بہت امید ہے لیکن میری قسمت اچھی نہیں ہے اور میں اپنی قسمت سے بہت ڈرتی ہوں کہ اگر میں دبلی نہ ہوئی تو وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ باباجی...... ! خدا کے واسطے‘ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں اسمارٹ ہوجاؤں۔ اُس کی ماں کا دل موم ہوجائے اور وہ مجھے ہر حال میں اپنالے۔ میں آپ کو زندگی بھر دُعائیں دیتی رہوں گی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تمہارا مسئلہ اتنی شدید نوعیت کا نہیں۔ اِس کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

□ سلمہ عزیز۔ پنڈی۔

ο باباجی! آپ کے بارے میں ’’سچی کہانیاں‘‘ میں پڑھا‘ دل چاہا‘ اپنا مسئلہ آپ کو بیان کروں۔ والد کچھ کرتے نہیں‘ میں نے

DSC کیا ہے اور مزید آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ ہم پر قرضہ بھی بہت ہے۔ بھائی کوئی ہے نہیں لہٰذا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے۔ آپ مدد کریں، اللہ کے نیک بندے ہیں، اللہ آپ کی ضرور سنے گا۔

☆بیٹی سلمہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ کیا جن کے بھائی نہیں ہوتے، اُن کا مستقبل نہیں ہوتا؟ بیٹی...... اللہ نے عورت کو بہت طاقت ور بنایا ہے۔ وہ بیک وقت گھر بھی سنبھالتی ہے اور باہر کے معاملات بھی دیکھتی ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7 تسبیح یَا خُجَسْتَہُ القَائِمُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ بہتر اَسباب پیدا کرے گا۔

□ اسد علی۔ اسلام آباد۔

o بابا جان! بہت پریشان ہوں۔ مجھے جھوٹے کیس میں پھنسا دیا ہے۔ غریب آدمی ہوں، پولیس اٹھا کر لے گئی اور ابھی تک عدالت میں بھی پیش نہیں کیا۔ خدا کے لیے، مجھ پر رحم کریں۔ یہ لوگ مجھ سے پیسا مانگتے ہیں، کہاں سے لاؤں؟ بیوی کو بھی تھانے آنے سے منع کر دیا ہے۔ بابا جان! دُعا کریں کہ میری پریشانیاں ختم ہوں۔

☆بیٹے اسد! تم بھی جانتے ہو کہ تم اپنی غلطی کی وجہ سے مشکل میں ہو۔ کسی پر اتنا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ آج کل کا دور ایسا نہیں۔ لوگ مدد کرنے والے کو ہی زیادہ دکھ دیتے ہیں۔ بہرحال میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کروں گا۔ انشاء اللہ، ضرور کرم ہوگا۔ بس نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔ (آمین!)

☆☆......☆☆

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆اگر آپ دانتوں کی گوناگوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

C-88-II فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

اس ٹریول گائیڈ میں مختلف ممالک کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی جائیں گی

سفرِ حجاز

ایک ایسے سفر کی داستان جس نے میری زندگی بدل دی

دیس دیس گھومیے......ا

زین شمسی

تمام پڑھنے والوں کو میرا محبت بھرا سلام۔ آپ لوگوں کی پذیرائی نے مجھے بہت ہمت دی اور اسی لیے اس بار میں کسی سیاحتی مقام کے بجائے حجازِ مقدس کے سفر کے بارے میں کچھ تحریر کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔ کیونکہ اس سفر نے میری زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا یہ میری زندگی کا سب سے پہلا اور سب سے خوبصورت سفر تھا۔

14 اکتوبر 2010ء کو میں اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ سعودی عرب روانہ ہوا۔ میں کیونکہ حج کے لیے جارہا تھا اس لیے احرام میں یہ سفر کٹا۔ میں نے 15 سال کی عمر میں حج کیا اور اس کے لیے میں اپنی والدہ کا مشکور و ممنون ہوں جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا کہ سب سے پہلے تم لوگ حج کرنا پھر دنیا دیکھنا مگر مجھے مکہ اور مدینہ جا کر اندازہ ہوا کہ اصل دنیا تو یہ ہی ہے۔ بذریعہ جہاز کراچی سے روانگی PIA کے ذریعے ہوئی ہماری پہلی منزل جدہ تھی۔ 4 گھنٹے طویل سفر کے بعد جب میرے قدم جدہ ایئرپورٹ پر اترے تو دل کی عجیب کیفیت تھی۔ کم عمر تھا اس لیے اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہا تھا۔ بس ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہی وہ جگہ ہے جہاں مجھے آنا تھا' سب کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ جدہ سے روانگی بذریعہ بس مکہ کے لیے ہوئی ہم اپنے مکتب کے ساتھ تھے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا مکہ کے گلی کوچے آنکھوں کے سامنے تھے' مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے بچپن سے آج دن تک اسلامیات کی کتابوں میں جو پڑھا تھا وہ حقیقت بن کر سامنے آگیا ہو۔ ہمارے ساتھ جو لوگ تھے ان میں سے اکثر پہلے بھی مکہ آچکے تھے مگر میرا اور میری فیملی کا یہ پہلا اتفاق تھا' میری والدہ کی آنکھیں تمام وقت آنسوؤں سے ہی لبریز رہیں۔ پہلی بار خانہ کعبہ کو دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا ہمیشہ تصویر ہی دیکھی تھی اور اب اللہ کا گھر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ یہ پہلا خیال دماغ میں آیا۔ ہم لوگ کیونکہ دوسری فلائٹ سے سعودی عرب پہنچے

تھے اس لیے خانہ کعبہ کے پاس رش کم تھا' حج کے ابتدائی دن تھے میں نے خانہ کعبہ کی دیواروں کو والدہ کی دیکھا دیکھی خوب چوما۔ حجرہ اسود کو بھی چومنے کا بار بار موقع ملا۔ نماز کے دوران بھی نظر بار بار خانہ کعبہ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ ہمارا ہوٹل حرم سے بہت قریب تھا اس لیے ہر نماز کے لیے

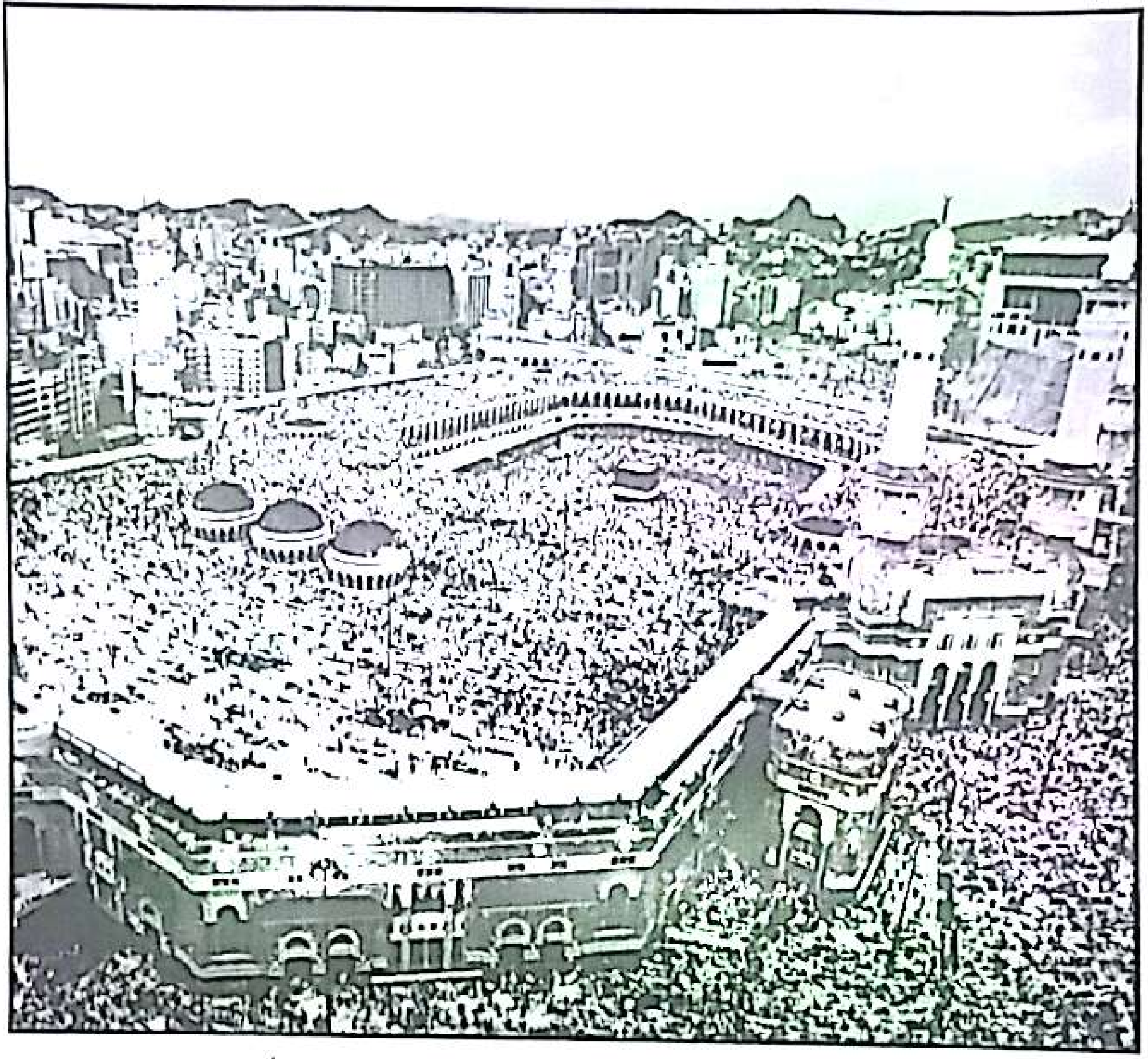

ہم باآسانی آجاتے تھے۔ حرم کے بہت قریب بن داود اور مکہ ٹاورز جیسے بڑے شاپنگ سینٹرز ہیں۔ نماز سے فارغ ہوکر ہم لوگ کھانے کے لیے وہاں سے مزیدار چیزیں خریدتے یا فورڈ کورٹ میں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ والدہ کو رشتے داروں اور دوست احباب کے لیے جائے نمازیں اور تسبیحات بھی لینی تھیں اس لیے ہم لوگ خوب گھومتے پھرتے' مکہ بہت خوبصورت شہر ہے' موسم کراچی جیسا ہی ہے مگر بہت سکون اور ٹھہراؤ ہے فضا میں ظاہر ہے اللہ کا گھر ہے وہاں' مجھے مکہ میں داخل ہوتے ہوئے سب سے زبردست بات وہ بورڈ لگا جس پر لکھا تھا غیر مسلموں کے داخلے پر پابندی ہے۔ اچانک اپنی ہی نظروں میں بہت معتبر ہوگیا کیونکہ میں مسلمان ہوں اس لیے آزادی سے اس خوبصورت شہر میں داخل ہوسکتا ہوں' گھوم پھر سکتا ہوں۔ پہلی بار عمرہ اور پھر سعی کرنا کچھ دشوار لگا مگر بعد میں سب بہت سہل لگنے لگا۔

دنیا بھر سے مسلمان مکہ آتے ہیں اتنے مختلف لوگ اور اتنے سارے لوگ ایک جگہ میں نے پہلی بار دیکھے تھے۔ سوڈان سے آنے والے بڑے بڑے جبّے پہنے تھے ترکی کے لوگ بہت ملنسار

محسوس ہوئے۔ بھارت' افغانستان' چین' عرب ممالک' انڈونیشیا' ملائیشیا' ساؤتھ افریقہ' امریکہ' لندن' روس' آسٹریلیا' ایران غرض کے ہر جگہ کے لوگ لیکن احرام میں سب ایک سے لگتے تھے کئی دفعہ لوگوں نے مجھے عربی میں مخاطب کیا۔ وہ

20 دن کیسے گزرے' پتہ ہی نہ چلا اور ہماری مدینہ روانگی کا دن آ گیا۔

مدینہ میں 10 دن کا قیام تھا۔ بذریعہ بس ہم لوگ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مدینہ بہت خوبصورت شہر ہے اور ہر وقت ایک ٹھنڈک کا

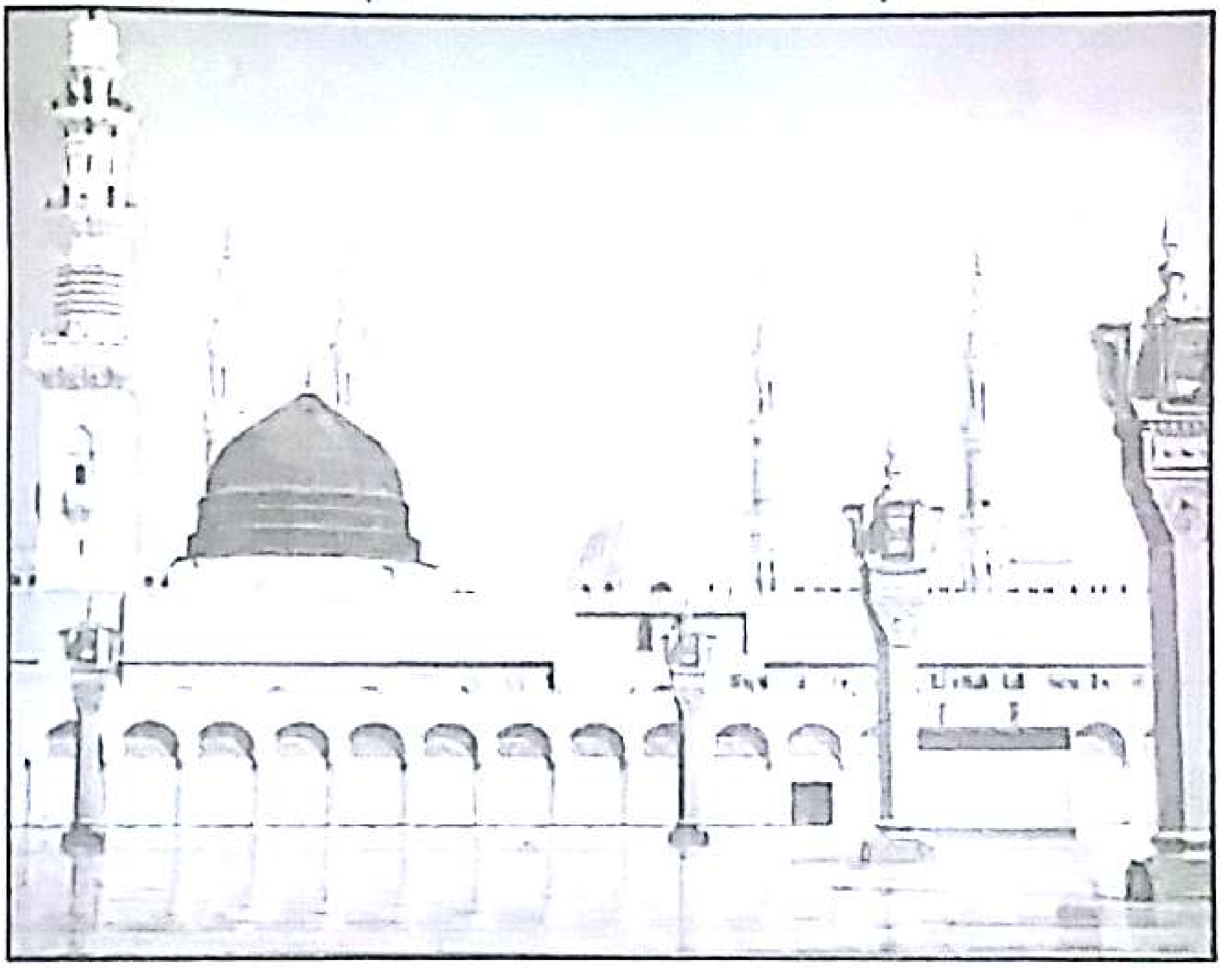

سمجھے شاید میرا تعلق کسی عرب ملک سے ہے۔ اصل میں ہمیں ہمارا لباس اور بول چال ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے سب انسان ایک سے بنائے ہیں۔ مجھے مکہ مکرمہ بہت اچھا لگا عبادت کے بعد میں مکہ کی گلیوں میں ضرور گھومتا تھا۔ حضورؐ کا گھر بھی دیکھا' غار حرا اور غار ثور بھی دیکھا۔ جنت المعلیٰ بھی دیکھا' مجھے وہاں پیدل چل کر احساس ہوتا تھا کہ میرے پیارے نبیؐ بھی اس شہر میں چلتے ہوں گے۔ انہی راستوں سے گزرتے ہوں گے یقیناً میں بہت خوش نصیب ہوں جو یہاں موجود ہوں۔ مکہ کے

احساس ہوتا ہے۔ میں نے مدینہ پہنچتے ہی حضورؐ کے حضور سلام پیش کیا۔ اللہ نے مجھے اپنے محبوب کے در کو دیکھنا نصیب کیا۔ مسجد نبویؐ کے ساتھ ہی جنت البقیع کا قبرستان ہے۔ مدینہ چھوٹا سا شہر ہے ۔نماز سے فراغت کے بعد مدینہ بھی خوب گھوما وہ کنواں بھی دیکھا جو حضرت عثمان غنیؓ نے مسلمانوں کے لیے وقف کیا تھا گو کہ وہ اب بند کر دیا گیا ہے۔ حضرت سلمان فارسی کا باغ بھی دیکھا۔ مقام جمعہ بھی کیا۔ کوشش کی کہ اس حسین ترین شہر کا چپہ چپہ دیکھوں 5 دن بعد جب واپسی کا دن آیا تو دل بہت اداس ہوا۔ مدینہ سے تو واپس

آنے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن جانا تو تھا حضور ﷺ کو خدا حافظ کہا اور دوبارہ آنے کی فرمائش بھی کر دی (جو 2012ء میں پوری بھی ہوئی) جاتے وقت سب کے دل اُداس تھے بس

جائیں گے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ زندگی ہی میں میدانِ عرفات کا نظارہ مل گیا۔ مغرب کی اذانوں سے قبل عرفات کا میدان چھوڑنا تھا اور اگلا پڑاؤ مزدلفہ کا میدان تھا 7 گھنٹے پیدل چلنے

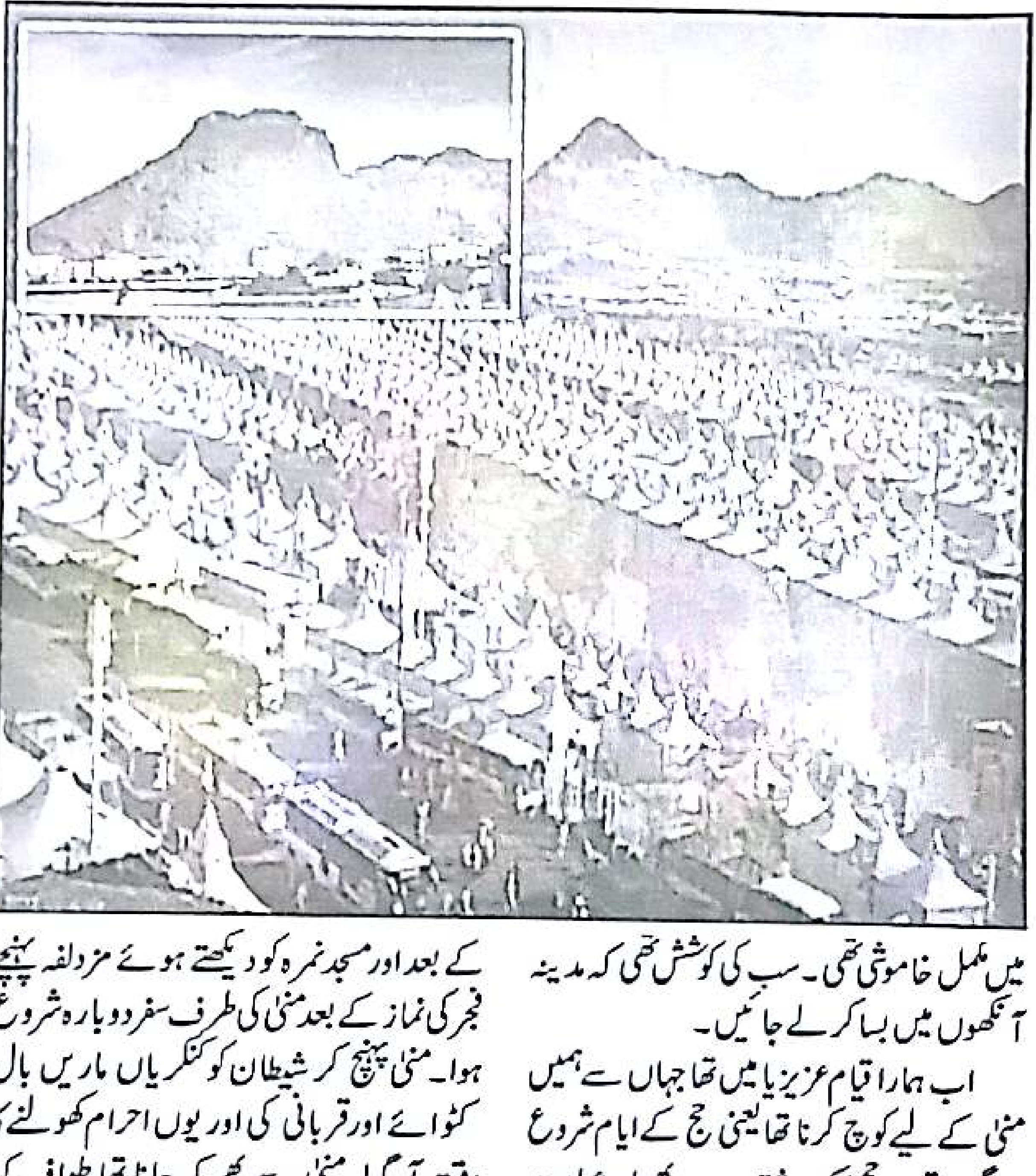

میں مکمل خاموشی تھی۔ سب کی کوشش تھی کہ مدینہ آنکھوں میں بسا کر لے جائیں۔

اب ہمارا قیام عزیزیا میں تھا جہاں سے ہمیں منیٰ کے لیے کوچ کرنا تھا یعنی حج کے ایام شروع ہوگئے تھے۔ حج ایک مشقت سے بھرپور عبادت ہے۔ اس لیے جتنی جلد ممکن ہو کر لینا چاہیے۔ فجر کی نمازوں سے قبل منیٰ کے لیے روانہ ہوئے وہاں خیمے میں قیام تھا۔ حج کے روز عرفات کا میدان آنکھوں کے سامنے تھا' یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ ہم یہاں روزِ حشر اکٹھے کیے

کے بعد اور مسجد نمرہ کو دیکھتے ہوئے مزدلفہ پہنچے فجر کی نماز کے بعد منیٰ کی طرف سفر دوبارہ شروع ہوا۔ منیٰ پہنچ کر شیطان کو کنکریاں ماریں بال کٹوائے اور قربانی کی اور یوں احرام کھولنے کا وقت آ گیا۔ منیٰ سے پھر مکہ جانا تھا طواف کیا پھر واپس منیٰ' طواف وداع کے بعد حج مکمل ہوگیا۔ میں دنیا میں کہیں بھی جاؤں کتنی بھی حسین جگہیں دیکھ لوں مگر جو بات اللہ کے گھر میں ہے وہ کہیں نہیں۔

☆☆......☆☆☆

معروف شعراء کے مجموعہ کلام پر سیر حاصل تبصرے

فراق

زہرا نگاہ کا تیسرا مجموعہ کلام

شبیر ناقد

جب کوئی تخلیق کار طویل المعیاد تخلیقی ریاضت کے عمل سے گزرتا ہے تو فکری و فنی طور پر اُس میں نکھار پیدا ہوتا ہے افکار و خیالات میں ندرت وجدت کے مظاہر نمو پاش ہوتے ہیں فنی اسقام بھی رفتہ رفتہ روپوش ہوجاتے ہیں عروضی اعتبار سے بحور کا ادارک ہوجاتا ہے' گویا فکری و فنی معیار دیرینہ مشاقیٔ سخن کا ثمر ہوتا ہے۔ ہم نے جب زہرا نگاہ کے تیسرے مجموعۂ کلام 'فراق' کا عمیق نظری سے مطالعہ و مشاہدہ کیا تو ہمیں اُن کے ہاں ایک بلند معیار نظر آیا' مجموعہ ہذا 2009ء میں منصۂ شہود پر آیا۔

زہرا نگاہ کا تعلق کراچی سے اور ان کا شمار سینئر شاعرات میں ہوتا ہے آج ہم مذکورہ شعری مجموعہ سے منتخب اشعار مختصر تجزیے کے ساتھ پیش کریں گے کتاب کا سُدس اول شاملِ تجزیہ ہے۔

ان کا طرز اظہار جداگانہ نوعیت کا حامل ہے وہ عام ڈگر سے ہٹ کر شعر کہتی ہیں اُن کے ہاں تنقیدی رویے بھی کروفر سے ملتے ہیں' ان کے اسلوب اور افکار میں ندرت کا پہلو نمایاں ہے وہ سماج کے اعلیٰ طبقے یعنی حکمرانوں کو بھی ہدف تنقید بناتی ہیں اُن کی غزل کے مطلع میں یہی رنگ کارفرما ہے

ہر حکمراں آگے بصد ناز و افتخار
بچی زمیں یہ کھینچتا ہے جھوٹ کا حصار

شاعرہ تخلیقی زندگی میں خود رفتگی کے عمل سے گزر رہی ہے' اُس کی شخصیت افکار کی صورت تحلیل ہورہی ہے جتنا بڑا قلمکار ہوگا اس کی خود رفتگی کا عمل اتنا ہی سرعت سے ہوگا سوچ کے اس سفر میں بے شمار کٹھنائیاں ہوتی ہیں کہیں پر راستے کھوجاتے ہیں تو پھر منزل بعید از بصارت و امید لگتی ہے بہت سی وحشتیں ذات کے گرد ایک حصار بنالیتی ہیں تو پھر اندھیرا گھر کی دیواروں سے اونچا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے

سفر خود رفتگی کا بھی عجب انداز کا تھا
کہیں پر رہ بھولے تھے نہ رُک کر دم لیا تھا
زمیں پر گر رہے تھے چاند تارے جلدی جلدی

اندھیرا گھر کی دیواروں سے اونچا ہو رہا تھا

انسان تا حیات حسن کا متلاشی رہتا ہے جستجوئے جمال اُسے آشنائے راز کرتی ہے جس سے زندہ رہنے کی خواہش فزوں سے فزوں تر ہوتی رہتی ہے زیست کے مصائب و آلام بھی جیون کا حسن ہوا کرتے تھے اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر دیدنی ہے

صورتِ دل کشی رہی خواہشِ زندگی رہی
داغِ دل خراب سے رات میں روشنی رہی

اگرچہ علم و عقل کی سرفرازی ساتویں آسمان تک محیط ہے مگر اہلِ دل کی دنیا ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتی ہے جہاں نخلِ امید کبھی نہیں مرجھاتا اسی فکر کی ترجمانی زہرا نگاہ کی زبانی دیکھتے ہیں۔

ساتویں آسمان تک شعلۂ علم و عقل تھا
پھر بھی زمینِ اہل دل کیسی ہری بھری رہی؟

نابغہ روزگار ہستیاں ہر عہد میں یاد رکھی جاتی ہیں اور ہر دور میں اُن کی کمی محسوس کی جاتی ہے کیونکہ یہی لوگ تاریخ کے سنہری ابواب ہوتے ہیں زمانہ انہیں یاد کرتا ہے اور اُن کی عظمت کے گُن گاتا ہے' اسی فکر کو زہرا نگاہ نے انتہائی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

کہاں گئے مرے دلدار و غمگسار سے لوگ
وہ دلبرانِ زمیں وہ فلک شعار سے لوگ

اُن کے ہاں ذاتی حوالوں کی نسبت اجتماعی حوالے بکثرت ملتے ہیں۔

اجتماعیت کا عمیق احساس ملتا ہے وہ مجموعی طور پر سماج کی بے حسی کا رونا روتی ہیں اُن کا کلام روایت سے جڑا ہوا ہے وہ گویا ہیں کہ ایسا سکوت ہے کہ خاک تک نہیں اڑتی اور یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہوائیں راستے سے اتنی غافل ہوسکتی ہیں' نہ دھوپ میں وہ شدت وحدت رہی اور نہ سائے میں دلکشی رہی وہ اس صورتِ حال کو کسی فقیر کی بد دعا سے تعبیر کرتی ہیں

سکوت ایسا کہ اب خاک تک نہیں اُڑتی
ہوائیں بھول بھی سکتی ہیں راستہ ایسے
نہ دھوپ میں وہ تڑپ رہی نہ سائے میں وہ کشش
کسی فقیر نے کیا دی ہے بد دعا ایسے؟

مندرجہ بالا اشعار عصرِ حاضر کی بے حسی کا نوحہ ہیں جن میں دعوتِ غور وخوض اور فکر وعمل ہے ایک آگہی ہے' صوتی قافیے کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے' اگر عروضی اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے مرکب ومفرد ہر طرح کی بحور میں سخن سنجی کی ہے اُس کا اسلوب حدِ کمال کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔

مذکورہ استشہادات شاہد ہیں کہ زہرا نگاہ کا کلام جدت و ندرت آمیزہ ہے' اُن کا پیرائیہ اظہار غیر روایتی اہمیت رکھتا ہے جو انہیں دیگر ہم عصر شاعرات سے ممتاز ومنفرد کرتا ہے۔

☆☆......☆☆

شائستگئ غم نے عجب کام دکھایا
اک حرفِ تسلی مرے نام نہ آیا
ہر دورِ بلا خیز میں ہنگامِ تمازت
آنکھوں پہ دعاؤں کا لرزتا رہا سایہ
تعظیم اُسی کے لیے مخصوص رکھی تھی
وہ جس کو مرے قد کا نکلنا نہیں بھایا
جتنی کہ گزار آئے ہیں اتنی نہیں باقی
جی بھر کے جئیں اس کا سلیقہ نہیں آیا
بچپن کے کھلونوں کو کوئی توڑ گیا ہے
اور ایسے کہ ٹکڑا کوئی بچنے نہیں پایا
حیراں بڑے گھر میں کھڑی سوچ رہی ہوں
اس پار یہ چھوٹا سا مکاں کس نے بنایا؟

☆☆......☆☆

ایک حسین وادی کی قدیم روایات

وادیٔ بگروٹ

دلچسپ رسم ورواج کی کہانی

شبینہ فراز

اگرچہ عالمی برادری کو 11 دسمبر پہاڑں کے عالمی دن کے طور پر صرف ایک دہائی 2003 اور 22 مارچ کو پانی کے دن کے طور سے مناتے ہوئے صرف دو دہائیاں 1993ء گزری ہیں' لیکن دلچسپ بات یہ کہ بگروٹ کے لوگ صدیوں سے یہ دن مناتے چلے آرہے ہیں۔ بائیس مارچ کو بگروٹ کے لوگ پانی سے متعلق قدیم دستوری معاملات طے کرتے ہیں۔ اس وقت وادی میں نوروز کی تیاریاں عروج پر ہوتی ہیں اور اسی دن وادی کے ہر گاؤں میں آب پاشی کے انتظام' پانی کی تقسیم اور وارہ بندی کا اعلان کیا جاتا ہے' جب کہ پہاڑوں کے عالمی دن 11 دسمبر کو اچائی کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن بالائی چراگاہوں سے مویشی کو واپس گاؤں لایا جاتا ہے۔

لیکن اب بدلتے موسموں نے ان تمام روایات' مقامی ثقافت اور خوراک کے وسائل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

وادی بگروٹ گلگت شہر سے 45 کلومیٹر شمال مشرق میں واقع ہے۔ مشہور دوہانی لیک وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے 16 گاؤں آباد ہیں۔ وادی کو چاروں طرف سے دوہائی' گرگو' یونے' بوئی پھرائی' ہنرچی اور راکاپوشی گلیشیئر نے گھیر رکھا ہے۔ ان ہی گلیشیئرز کے اندر واقع جھیلوں سے چھلکنے والا سیلابی پانی (GLOF) اور سیلاب ہر سال وادی کو بھاری نقصان پہنچاتے ہیں۔ وادی میں گلیشیئرز کے پگھلنے اور دیگر نقصانات کو دیکھتے ہوئے یہاں گلوف پروجیکٹ کے نمائشی منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ پاکستان گلوف پروجیکٹ کلائمٹ چینج ڈیویژن حکومت پاکستان UNDP اور ایڈاپٹیشن فنڈ کا ایک مشترکہ پروجیکٹ ہے جس کا دورانیہ 2011ء سے 2015ء پر مشتمل تھا۔ منصوبے کا مقصد پاکستان کے شمالی علاقوں (گلگت بلتستان' چترال) میں موسمیاتی تغیرات سے پیدا ہونے والی تباہ کاریوں سے مقامی

آبادی کو محفوظ رکھنا ہے۔ گلگت بلتستان میں اس پروجیکٹ کے لیے گلگت کے نزدیک ایک وادی بگروٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ پاکستان گلوف پروجیکٹ کو ٹیکنیکل سپورٹ محکمہ موسمیات دیتا ہے۔ محکمہ موسمیات پاکستان نے پاکستان گلوف پروجیکٹ کی مالی مدد سے یہاں مختلف اہم مقامات میں Weather Automatic Guage، Snow / Rainstation اور River Guage تنصیب کیے ہیں جو وادی میں بدلتے موسموں کے رویے اور زرعی مشاورت کے علاوہ کسی ممکنہ خطرے سے پیشگی آگاہ کرنے میں نہایت اہم ثابت ہوتے ہیں۔

بگروٹ کی جنت نظیر وادی کو سر وئیر جنرل آف انڈیا نے ایشیا کا شنگریلا کہا تھا۔ عالمی موسمیاتی تبدیلیوں اور وادی کے اوپر موجود گلیشیئرز کے تیزی سے پگھلنے اور ان پر بننے والی جھیلوں سے پیدا ہونے والے طوفانی سیلابوں نے وادی کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس پروجیکٹ کے لیے گلگت بلتستان کی وادی بگروٹ موزوں جگہ ہے' کیونکہ وادی کے بالائی حصوں میں 11 گلیشیئرز موجود ہیں جن میں سے 9 کا رخ وادی کی جانب ہے۔ ان میں سے 6 ہینگنگ گلیشیئر ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وادی کے لوگ چاروں جانب سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔

یہاں گلیشیائی جھیلوں' ندی نالوں کے سیلاب اور ایوالانچ سے لوگوں کی جانب براہ راست خطرے کی زد میں ہیں۔ اس پروجیکٹ کا مقصد کلائمٹ چینج کے حوالے سے ہم آہنگی اور تدراک دونوں ہیں۔

مقامی ماہرین کے مطابق ان علاقوں میں موسموں کی تبدیلی بہت نمایاں ہے۔ برف باری کا دورانیہ بہت کم ہوگیا ہے۔ موسموں کی تبدیلی خوراک کے وسائل پر براہ راست اثرات مرتب کررہی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے بچپن کے دنوں میں برف باری نومبر سے شروع ہوتی تھی اور فروری تک جاری رہتی تھی۔ وادی برف سے سفید ہوجاتی تھی۔ بالائی پہاڑوں پر پڑنے والی برف کے بوجھ سے شاخیں بھی ٹوٹ جاتی تھیں اور ایوالانچ میں یہ لکڑیاں گاؤں تک آجاتی ہیں۔ اس موسم کے لیے لوگ مال مویشی کے لیے چارا جمع کرکے رکھتے تھے۔

نسالو فیسٹیول جو 21 دسمبر کو شروع ہوتا تھا۔ اس دن بیل اور بکروں کو ذبح کرکے گوشت خشک کرلیا کرتے تھے۔ پہلے یہاں صرف ایک فصل ہوتی تھی۔ گندم لیکن برف باری کم ہوگئی ہے۔ گرمی بڑھ گئی ہے تو لوگوں نے مکئی لگانا شروع کردیا ہے۔

لیکن اب کیش کروپ کے طور پر زیادہ تر آلو کاشت کیے جاتے ہیں جس سے اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔ ایک فصل کے پچاس سے ساٹھ ہزار مل جاتے ہیں ان پیسوں سے گندم خرید لیتے ہیں' اس ایک فصل سے غذائی قلت کا اندیشہ ہے' اگر کبھی لینڈ سلائیڈنگ ہوجائے راستے بند ہوجائیں تو کب تک آلو کھائے جائیں گے۔

گلگت بلتستان کی اس خوبصورت وادی کے تہوار بھی بہت انوکھے ہیں اور حیرت انگیز طور پر تمام تہواروں کا تعلق موسموں سے ہے اور وادی میں بدلتے موسم یہاں کی روایات اور ثقافت کو بھی متاثر کررہے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہاں کے لوگ سرتوڑ کوشش کررہے ہیں کہ ان کی قدیم روایات اور ثقافت محفوظ رہے۔ ذیل میں ہم اس وادی کی کچھ دلچسپ روایات اور تہواروں

کا مختصراً تذکرہ کر رہے ہیں۔

وادی بگروٹ کی قدیم روایات

قدیم شینا کلینڈر میں نیا سال 21 دسمبر سے شروع ہو جاتا ہے۔ جب سورج اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے 21 دسمبر کو نسالو یعنی نئے سال کا دن مناتے ہیں۔ سال کی ابتدا سرد ترین دن اور مہینے سے ہوتی ہے۔ جب برف وادی کو ڈھانپ لیتی ہے۔

یہاں کی آبادی ساری سرگرمیاں خاندان بھر کے لیے سرمائی خوراک اور دیگر ضرورتوں کے حصول میں کوشاں رہتی ہے۔ 21 دسمبر تک ہر گھرانا حسب حیثیت اپنے اسٹور میں سردیوں کے لیے خوراک کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی دوران گاؤں کے بزرگ، غریب، بیوہ اور یتیم گھرانوں کا دورہ کر کے وہاں بھی خوراک کی فراہمی یقینی بناتے ہیں۔

اشار

یہاں لوگ گرمیوں میں خوبانی، گری، بادام اور اخروٹ اور دیگر تمام پھل جو ذخیرہ کیے جا سکتے ہوں زیادہ سے زیادہ مقدار میں جمع کر لیتے ہیں، جو سردیوں میں مہمانوں کے تواضع اور گھر کے افراد کے لیے متوازن خوراک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

دیشکی

چوں کہ آگے سخت برف پڑے گی اور چکیاں بند ہوں گی اس لیے ہر گھر اپنے عیال کے خرچے کے حساب سے اپنی تون (لکڑی کا بڑا صندوق) میں آٹے کی موجودگی کو یقینی بناتا ہے۔ بجلی کی سہولت کے بعد یہ رسم وادی میں ختم ہو چکی ہے۔ البتہ بالائی بگروٹ میں آج بھی قائم ہے۔

لوئی

ہر گھر سردیوں کے لیے لکڑی کا ذخیرہ کر لیتا ہے۔ جلانے کی لکڑی کا بوجھ مقامی قدرتی جنگل پر ہونے کی وجہ سے صنوبر اور دیگر جنگلی درخت معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

نسالو

ہر گھر حسب استطاعت مویشی ذبح کر کے سردیوں کے لیے گوشت کا انتظام کرتا ہے۔ ان ایام میں ذبح کیے گئے موشی کا گوشت سڑتا نہیں بلکہ سوکھ کر نہایت مزے دار ہو جاتا ہے۔

وادی بگروٹ کے قدیم تہوار

سردیوں کے لیے خوراک سے متعلق ضروری امور سے فراغت کے بعد ثقافتی تہواروں کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دستوری دعائیہ تقریبات میں اجتماعی خیر و برکت اور سلامتی کے لیے فطری انداز میں رب سے رجوع کیا جاتا ہے۔ دسمبر وادی بگروٹ میں کئی اہم ثقافتی تہوار اور مواقع لے کر آتا ہے۔

ان ایام میں گاؤں کی آبادی جمع ہو چکی ہوتی ہے۔ گرمائی چراگاہوں سے چرواہے ریوڑ، مویشی لے کر اور بالائی آبادیوں سے لوگ گاؤں میں اتر چکے ہوتے ہیں۔ گہما گہمی بڑھ جاتی ہے۔ اس سے قبل کہ چرواہے سرمائی چراگاہوں کی طرف کوچ کریں، گاؤں کی آبادی اپنے قدیم ثقافتی دستور کے مطابق رسومات اور تہوار مناتی ہے۔ ان ہی ایام میں شادیوں کے دن مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک بڑی معاشی سہولت ہے جو ضرورت مند گھرانوں کو یہاں کا سماجی دستور مہیا کرتا ہے۔

موال

مقررہ دن ہر گھر سے خشک میوہ، گھی اور روٹی

کی تھال لے کر لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہ سال کی تقریبات اور رسومات کی ابتدا ہے' جس میں گاؤں کے لوگ اپنے مرحومین کی یاد میں تحفے لاتے ہیں اور اجتماعی دعا کے علاوہ آگے کی تقریبات کے انتظامی امور طے کرتے ہیں۔

ڈھم ڈھم پر دچو

مخصوص دن گاؤں کے بچے اپنی اپنی پرو (گلی) سے ٹولیوں میں نکل کر جمع ہوتے ہیں۔ یہ بچے کئی دنوں سے اس دن کے لیے تیاری کرتے ہیں' ان کے لیے نئے لباس خصوصاً پٹو کی سفید ٹوپی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

مائیں خصوصاً خشک میوہ سنبھال کر رکھتی ہیں جو اس دن بچوں کو دیا جاتا ہے۔ وقت مقررہ پر قریبی پہاڑ میں صنوبر کے درختوں تک پہنچنے کے لیے دوڑ لگاتے اور وہاں کھیل کود کے بعد واپسی میں صنوبر کی چھوٹی چھوٹی تازہ ٹہنیاں لے کر آتے ہیں جن کو گھر گھر میں نیک بختی کے سندیسے کے طور پر پہنچایا جاتا ہے۔

دھمہ کھہ

مقررہ دن سارے گاؤں کے گھروں کو صنوبر اور لوبان کی دھونی دے کر نحوستوں سے پاک کیا جاتا ہے اور مخصوص پکوان درم پکایا جاتا ہے۔ جس کی تیاری کے لیے سردیوں سے پہلے ہی گندم یا جو کو مخصوص مدت تک بھگویا جاتا ہے اور پھر سکھا کر اخروٹ یا خوبانی کے تیل میں پکایا جاتا ہے۔ یہ سردیوں کی مخصوص سوغات ہے۔

راٹھو

مقررہ دن تماشے سے ابتدا ہوتی ہے۔ لوگ ناچتے گاتے ہیں اور خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ کوئی ایک آدمی ہاتھ میں تلوار لے کر ناچتے ناچتے مخصوص جگہ تک جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس کے پیچھے ناچتے گاتے چلتے ہیں اور کچھ فاصلے پر جا کر رک جاتے ہیں۔ ایک مخصوص آدمی خاص جگہ تک اکیلا جاتا ہے اور کچھ دیر بعد ہی آ کر لوگوں کو ان کی خواہشات کی پوری ہونے کی بشارتیں دیتا ہے۔ اسی جگہ بکرے کی قربانی کی جاتی ہے' جس کو اسی جگہ ہی پکا کر کھایا جاتا ہے۔ اس کھانے میں سے کوئی چیز گھر لے کر جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

شاپ

غیر شادی شدہ نوجوانوں کا گروہ مقررہ رات ہر گھر کے دروازے پر جا کر گھر اور اس کے مکینوں اور مہمانوں (اگر اس رات کوئی ہے) تو فرداً فرداً صحت اور سلامتی اور مال و دولت کے لیے دعائیہ گیت گاتا ہے۔

گھر کا بزرگ خشک میوہ نسالو کا گوشت یا نقد رقم انعام میں دیتا ہے...... گاؤں بھر میں دعا میں تقسیم کرنے کے بعد حاصل شدہ انعام سے بڑے کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں گاؤں کے بزرگ عمائدین اور علمائے کرام کو دعوت دی جاتی ہے۔

ان تقریبات میں اجتماعی دعا کے علاوہ نوجوانوں کے ناچ گانے اور مزاحیہ خاکوں کے ذریعے سماجی ناانصافیوں کے ذریعے معاشرتی برائیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

قدرتی ماحول کی اس محفل میں کاہن صنوبر کی سحر انگیز دھونی اور مخصوص دھن میں جھومتا جاتا ہے اور مقامی عقائد کے مطابق راکاپوشی' دیران اور دوہانی کی بلندیوں سے اتر کر ماورائی مخلوق لوگوں کو بشارتیں پہنچاتی ہیں۔

☆☆......☆☆

ان خاص لوگوں کی کہانیاں اور باتیں جن کے کام نے زمانے پر اپنے اثرات مرتب کیے

مردِ آہن، محمد ایوب فضل الٰہی

انہوں نے خدا کا پسندیدہ راستہ چن لیا ہے

شمیم احمد

مولانا رومی کی ایک حکایت ہے کہ ''خدا تک پہنچنے کے لیے بہت سے راستے ہیں لیکن میں نے خدا کا پسندیدہ راستہ اس کی مخلوق کی خدمت اور محبت کو چنا ہے۔''

بسیار تلاش کے بعد بھی کوئی شخصیت ڈھونڈے نہ ملی، جس نے خلق خدا کی بے لوث خدمت، تن من دھن سے کی ہو اور کسی طور بھی اپنا نام نہ چاہا ہو، ویسے حکم خداوندی بھی یہی ہے کہ 'ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو علم نہ ہو۔' آج کل تو سوشل میڈیا سے کسی بھی سوشل ورکر کی مکمل معلومات حاصل کرلیں، لٹریچر پڑھ لیں، کتنی بھی کتابیں چھان ماریں، خود آپ سوچیں تو ذہن میں 'اول مدر ٹریسا' اور آخر میں 'عبدالستار ایدھی' کا نام ہی گونجے گا۔ یہ بات اور ہے کہ نام نہ مدر ٹریسا نے چاہا ہوگا کہ اس کے نام سے تاریخ مرتب ہو اور نہ ایدھی صاحب نے، ان شخصیات نے تو بس اپنے آپ کو خدمت انسانی کے لیے وقف کردیا تھا۔

تلاش ہم کو بھی ایک شخصیت کی تھی جس نے اپنی زندگی راہِ اللہ میں تمام کردی ہو، بغیر کسی لالچ کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدمت خلق میں لگ گیا ہو، سوچ سوچ کر تھک گئے۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ ایسی شخصیت جس کی ہمیں تلاش ہے وہ خود ہم میں موجود ہے۔ میں

ذکر کروں گا اپنے بہت ہی محترم بڑے بھائی محمد ایوب کا۔ خدمت خلق کا خاصہ تو اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو خوب بخشا ہے لیکن میں اپنے بڑے بھائی کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ میری اور ان کی عمر میں بچپن اور لڑکپن کا فرق ہے۔ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ 'گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔' وہی دہلی میں نیا محلّہ 'گلی قاسم جان' (غالب کا محلّہ) حکیم اجمل خان اور مجاہد آزادی کالے صاحب کا محلّہ' نواب لوہارو کی حویلی (جمیل الدین عالی کے جد امجد) اس ہی محلے کی میری پیدائش بھی ہے اور میرے بڑے بھائی کی بھی جن پر یہ مضمون تحریر کر رہا ہوں۔ کیونکہ ہم اپنے خاندان کے سب سے چھوٹے تھے اس لیے سب کے لاڈلے تھے۔

آنکھیں موند کر ایک ایک لمحہ اپنے بڑے بھائی کے لڑکپن کا تصور کرتا ہوں تو یقین آ جاتا ہے کہ لڑکپن سے ہی اُن کی طبیعت میں ایک 'تعمیری ضد تھی۔' مجھے فخر ہے تعلیم کے سلسلے میں' میں نے انہیں مانند استاد مانا' سبق یاد نہ ہونے پر تھپڑ بھی کھائے۔

بھائی خوبرو' صحت مند' کسرتی جسم کے مالک' انگ انگ میں کچھ بننے کی لگن' انہیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تیرتھ رام فیروز پوری' ندیم صبائی' ابن صفی کا ناول لائبریری میں آنے سے پہلے ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ مجھے تو یاد نہیں لیکن سنا ہے کہ مجاہد کے طور پر 1947ء میں اپنے محلے کی حفاظت کے لیے جو نوجوانوں کا دستہ رات بھر اپنے محلے میں پہرہ دیتا تھا اس دستہ میں یہ بھی شامل تھے۔ اماں سے پیسے مانگے نہیں ملے کوئی ملال نہیں' اپنی جمع کی ہوئی رقم لی اور بتاشے والی گلی پہنچ گئے۔ انڈے بسکٹ (چاکلیٹ' ٹافیاں) ہول سیل سے خریدیں' چوکیاں گھر سے اٹھائیں اور احاطہ کالے صاحب کے پھاٹک پر دکان سجالی۔ محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھائی' یہ سب تھا ان کا تعلیمی رجحان' اینگلو عربک ہائیر سکینڈری اسکول سے ہائیر سکینڈری کر کے فارغ ہوئے تو کلکتہ سے بڑے بھائی کا بلاوا آ گیا کہ محمد ایوب کو کلکتہ بھیج دو۔ کلکتے میں سوت گولہ کی دکان اور فیکٹری دھرم تلہ میں (چاندنی چوک) پر وہ پوری ذمہ داری اور لگن سے اپنی خدمات انجام دینے لگے۔ کچھ عرصے بعد ہی بڑے بھائی کو جب یقین ہو گیا کہ یہ بچہ کاروبار سنبھال سکتا ہے تو انہوں نے اپنا کاروبار ڈھاکہ منتقل کرنے کی ٹھانی لہٰذا کلکتہ کا تمام کاروبار بھائی ایوب پر چھوڑ دیا۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ڈھاکہ میں بڑے بھائی کا دل نہیں لگا تو واپس کلکتہ آ گئے۔ اب بھائی ایوب نے کلکتہ کا کاروبار واپس بڑے بھائی کو سرخرو ہو کر سونپا اور خود ڈھاکہ کا رخ کیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

ڈھاکہ میں ایک اسٹیل فیکٹری میں نوکری کی۔ مختصر سے عرصے میں اس ہی فیکٹری میں منیجر مقرر ہو گئے۔ محنت' لگن اور ان کے اندر چھپے ہوئے جنون نے ان کو شعار بخشا کہ 'خود کچھ کر کے دکھاؤ۔' اسی دوران والدین نے دہلی واپس بلا کر ان کی شادی کر دی۔ بھابھی کو دہلی میں چھوڑ کر واپس ڈھاکہ آ ئے۔ ڈھاکہ میں 'اسٹیل مین' کے نام سے اسٹیل فرنیچر کے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ کلکتہ میں بڑے بھائی کے ساتھ کاروباری رموز سیکھے۔

ماشاء اللہ پہلے صاحبزادے طاہر ایوب تولد ہوئے' اب انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بھابھی کو بھی ڈھاکہ بلا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیل مین

ڈھاکہ کا سب سے مشہور اسٹیل فرنیچر کا نام ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک گارمنٹ کا شوروم بھی کھول لیا۔ بہرحال 'مشرقی پاکستان' کے حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے۔ اُردو اسپیکنگ کاروباری طبقہ مغربی پاکستان نقل مکانی کا سوچ

کمیونٹی کے این جی او کی سرپرستی میں' حاجی فضل الٰہی فخرِ قوم' فری ڈسپنسری 10 سال سے تو چل ہی رہی تھی جس کے تمام تر اخراجات بھائی ایوب کے ہی ذمہ تھے۔ اس سے قبل یہ ڈسپنسری اسی این جی او کی زیرِ نگرانی دارالعلوم مفتی رفیع عثمانی

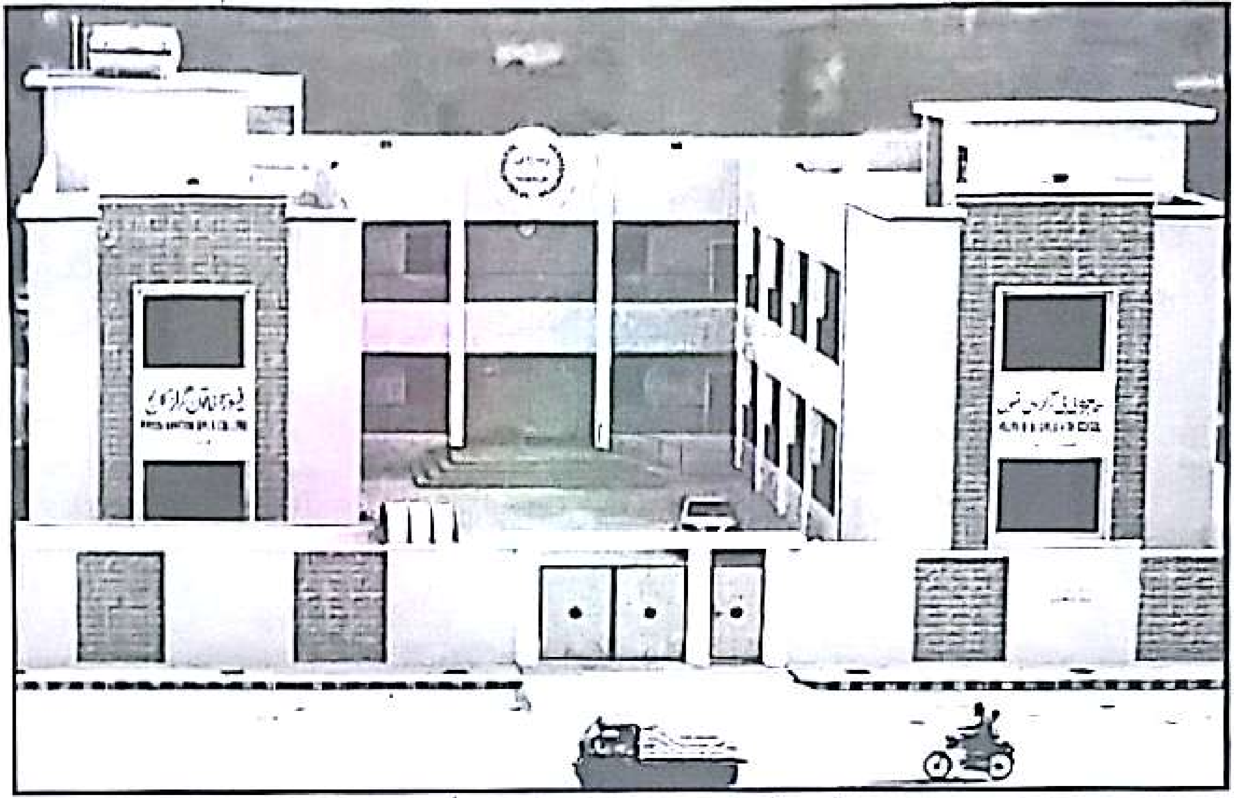

حاجرہ بی بی گرلز ہائی اسکول/ فیروزہ خاتون گرلز کالج کا بیرونی منظر

رہتا تھا۔ وہ بھی اللہ کا نام لے کر خاندان کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئے۔ اتنا بڑا کاروبار' شوروم' فیکٹری اپنے بنگالی منیجر کو سونپ کر کراچی آگئے اور پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اب کراچی آکر پھر وہی نئی زندگی اور تگ و دو' وہیں جہاں مشرقی پاکستان کاروبار کی ابتدا کی تھی اسی ہمت' جذبہ اور جواں مردی سے کراچی میں بھی آئرلینڈ روڈ پر دکان قائم کی اور وہی لوہے کا کاروبار یہاں بھی شروع کیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کشتیاں جلا کر آئے ہیں۔ 'اب نہ ہجرت ہوگی ہم سے' اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے بہت سے راستے ہیں لیکن میں نے خدا کا پسندیدہ راستہ اُس کی مخلوق کی خدمت کو چن لیا۔' کورنگی کراسنگ اللہ والا ٹاؤن میں ایک

صاحب کورنگی میں چار کمروں پر مشتمل تھی۔ اللہ والا ٹاؤن آباد ہونا شروع ہوا تو کورنگی سے منتقل کروا کر یہی ڈسپنسری اللہ والا ٹاؤن میں قائم کردی گئی لیکن بڑے بھائی کا تو خواب ایک بڑا اسپتال قائم کرنے کا تھا' وہ بھی کارڈیو ویسکولر اسپتال' لہٰذا انہوں نے عبدالخالق اللہ والا سے درخواست کی کہ مجھے اللہ والا ٹاؤن میں ہی ایک ایمنٹی پلاٹ الاٹ کروادیں' جہاں میں اسپتال قائم کرسکوں' اللہ والا صاحب نے وہیں تقریباً 1680 گز کا ایمنٹی پلاٹ الاٹ کروادیا' جس کی پیمنٹ اور تمام کارروائی انہی کے کہنے پر کے ڈی اے کو کردی گئی لیکن آج تک وہ پلاٹ یوں ہی پڑا ہوا ہے کیونکہ اب تک الاٹمنٹ آرڈرز ہی نہیں مل سکے۔

اب ذکر کروں گا 2003ء کا' جب اللہ والا ٹاؤن میں ہی اس ہی این جی او کی سرپرستی میں ایک اسپتال جو'لال اسپتال' کے نام سے مشہور تھا' غیر توجہی کے باعث تقریباً بند پڑا ہوا تھا۔ میری معیت میں بھائی ایوب نے اس وقت اس این جی

حاجی فضل الٰہی فخر قوم کارڈیو ویسکولر اسپتال کا بیرونی منظر

او کی جنرل سیکریٹری سے ملاقات کی اور وہ اسپتال ان کے نام منتقل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس بند اسپتال کو از سر نو تعمیر کرا کر اسے اپنے والد حاجی فضل الٰہی فخر قوم کارڈیو ویسکولر اسپتال کا نام دے دیا گیا۔ 2 مئی 2008ء کا وہ تاریخی دن ہے جس میں یہ شخصیت یکسر بدل جاتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہدایت کا پیغام تھا کہ چھوڑ دو سب کچھ اور لگ جاؤ اللہ کی راہ میں اور خدمت کرو انسانیت کی۔ وہ دن ہے کہ اس کے بعد یہ اللہ کا بندہ اپنی ٹوتھ برش کی فیکٹری میں جا کر آج تک کھڑا بھی نہیں ہوا اور انسانیت کی خدمت کی دھن میں اپنا تن' من' دھن سب کچھ لگا دیا۔ حالانکہ اسی این جی او کے تحت چار پانچ اسپتال چل رہے ہیں لیکن یہ مردِ آہن کی لگن تھی کہ'حاجی فضل الٰہی فخر قوم' سب سے زیادہ چلنے والے اسپتالوں میں ایک بن گیا۔ تقریباً روزانہ آٹھ سو سے نو سو مریضوں کو بلاتشخیص انتہائی کم معاوضہ پر طبی سہولتیں فراہم کر رہا ہے اور یہ بھی بڑے اچنبھے کی بات ہوگی کہ محمد ایوب صاحب نے آج تک اس این جی او سے ایک پیسہ بھی تعاون کا نہیں لیا' نہ ہی زکوٰۃ لیتے ہیں اور اسپتال کا معیار بھی دوسرے اسپتالوں سے بہتر ہے۔

ان کو لکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اسپتال کے ساتھ جتنا بھی وقت ملتا مختلف موضوعات پر کالم بھی تحریر کرنا شروع کر دیے۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی مشہور اخبار ہو جس میں ان کے مضامین شائع نہ ہوئے ہوں' کم از کم 150 کالم مختلف موضوعات پر ملک کے مشہور جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے والد یعنی فضل الٰہی کا نام لگا کر اپنا قلمی نام 'محمد ایوب فضل الٰہی' کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی ختم ہوا

قلم رک گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ان سے ایک اور بڑا کام لینا تھا۔ اس علاقے میں اسکول تو بہت ہیں لیکن ایسی پسماندہ آبادی کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ اسکول کے بعد خصوصاً بچیوں کو کالج میں اعلیٰ تعلیم دلوا سکیں۔ اس ہی سوچ کو ایوب صاحب نے عملی جامہ پہنانے کے لیے اسپتال سے ملحق جو پلاٹ ان کے پاس تھا اس پر دیکھتے ہی دیکھتے ایک عالی شان گرلز کالج تعمیر کرا دیا۔ نام اس کالج کا ان کے ذہن میں پہلے سے ہی تھا یعنی میری بھابھی صاحبہ جنہوں نے پوری زندگی ان کی خدمت کی' کالج کا نام 'فیروزہ خاتون گرلز کالج' رکھا گیا۔ بھائی ایوب نے اپنی ماں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی کالج کے ایک حصے میں 'بی بی حاجرہ' کے نام سے اسکول قائم کر کے اپنا یہ خواب بھی پورا کر دیا۔ اس ہی کمیونٹی این جی او کے ذمہ دونوں اداروں کا انتظام و انصرام بھی ہے۔ یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ اسپتال کے لیے آج تک اس این جی او نے مالی طور پر کوئی مالی مدد نہیں کی ہے اور نہ ہی اسکول اور کالج برائے خواتین کے لیے کوئی مالی امداد دی ہے اور اللہ کے کرم سے اس خاندان کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

الحمدللہ 2 جنوری 2008ء کا وہ تاریخی دن ہے جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی خلق کی خدمت پر مامور کیا۔ اب 2017ء تک ماشاءاللہ محمد ایوب صاحب کے چار پوتے اور ایک پوتی حافظ قرآن ہو گئے ہیں جبکہ ایک پوتی ماشاءاللہ 'عالمہ' کے درجے پر فائز ہے۔ اس سے قبل یہ خاندان مائل مذہب ضرور تھا لیکن اب اس خاندان کا دینی ماحول دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ حالات اور نیت کے ساتھ ساتھ ماحول بھی کیسے بدل دیتا ہے۔

☆☆......☆☆

غزل

نیا سورج اُگانا چاہتی ہوں
کوئی روشن زمانہ چاہتی ہوں

مٹا کر درمیاں کے فاصلے سب
اُسی کے پاس جانا چاہتی ہوں

اُجالوں سے محبت ہے اُسے بھی
دیا میں بھی جلانا چاہتی ہوں

تھکن سے کیا تعلق ہے بدن کا
یہی اِک راز پانا چاہتی ہوں

ہتھیلی پر تمہارا نام لکھ کر
میں دنیا کو دکھانا چاہتی ہوں

بدل کر قافیہ اپنی غزل کا
نئے کچھ شعر کہنا چاہتی ہوں

مجھے پھر سے دلاسے دے رہا ہے
دلاسوں سے بہلنا چاہتی ہوں

حنائی انگلیوں سے نام اُس کا
میں اپنے دل پہ لکھنا چاہتی ہوں

یہ آنکھیں دید کی پیاسی ہیں روشا
اُسے آنکھوں میں بھرنا چاہتی ہوں

روشانے سبعین مہاروی۔ لاہور

تاریخ کی لائبریری سے

ریڈیو سے جڑی ماضی کی یادیں اور باتیں

آواز کی دنیا

جون ایلیا کی پرواز فکر

جہاں فروز تھا یادش بخیر اپنا جنوں
پھر اُس کے بعد کسی شے میں دل کشی نہ رہی

محمد سلیم اختر

سائنسی ایجادوں میں ریڈیو کی ایجاد بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھی ریڈیو کے موجد مارکونی نے اس ایجاد کو جنم دے کر سینکڑوں میل دور کی مسافت رکھنے ہیں۔ مارکونی نے 1895ء میں بغیر تار کے اپنا پہلا پیغام فاصلے پر بھیجتے ہیں کامیابی حاصل کی تھی اس کے دو سال بعد مارکونی نے ایک کمپنی تشکیل دی جو ریڈیو

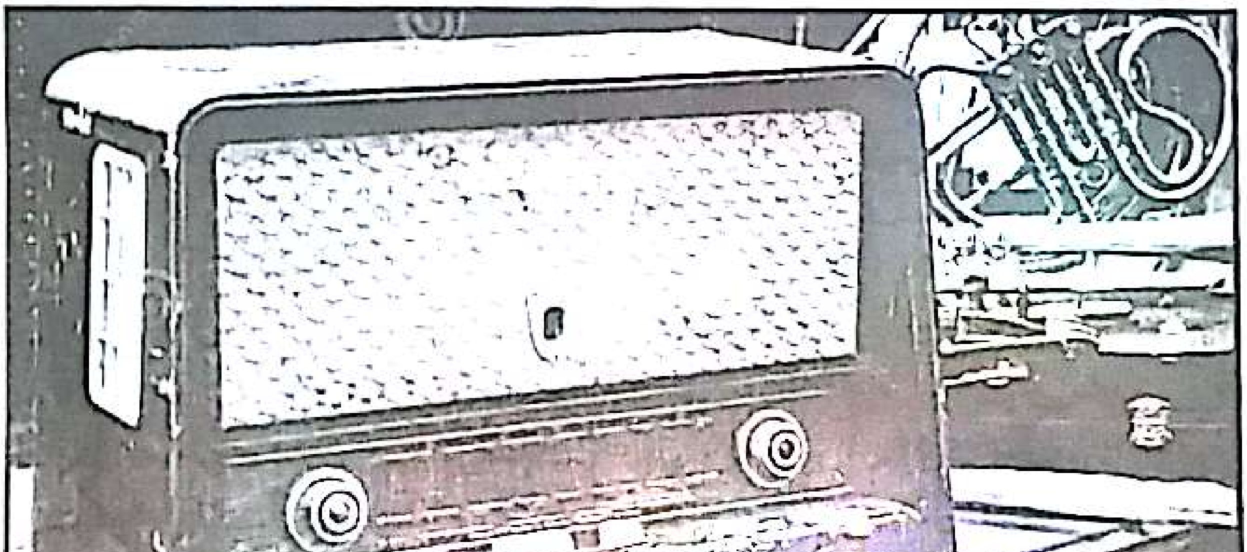

والے ملکوں کو ایک دوسرے کے بہت ہی قریب کر دیا تھا' ہزاروں اور لاکھوں میل کے فاصلے سے نشر ہونے والے نغمے بڑی آسانی سے ریڈیو پر پہنچ جاتے کے ذریعے جہازوں سے ساحل پر رابطہ کرنے میں مدد فراہم کرتی تھی' یہ ریڈیو کی ابتداء تھی اس کے بعد ریڈیو نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کر لی' ریڈیو کی

ایجاد نے آگے چل کر ٹیلی ویژن کی ایجاد میں رہنمائی کی موجودہ دور ابلاغ میں اگرچہ ٹیلی ویژن نے بڑی ترقی کرلی ہے اور ریڈیو کی جگہ بھی لے لی ہے لیکن رسائی کے لحاظ سے اب بھی ریڈیو ہی سب سے بڑا ذریعہ ابلاغ ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں اب بھی ریڈیو بطور خاص اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر اُن علاقوں میں بھی سنی جاتی ہیں جہاں ابھی تک بجلی بھی نہیں پہنچی' چین اور جاپان کے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں آج بھی غیر ملکیوں کی سہولت کے لیے انگریزی میں خبریں ریڈیو ہی سے نشر کی جاتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب ریڈیو ہی تفریح کا واحد ذریعہ تھا' اکثر لوگ گھروں میں بیٹھ کر ریڈیو پروگرام بڑے شوق سے سنا کرتے تھے' ابتدائی دور کے ریڈیو عام طور پر بڑے سائز کے ہوتے تھے اور بجلی ہی سے چلا کرتے تھے' بعض ریڈیو تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ دو تین آدمی مل کر بھی بہ مشکل ہی اٹھا پاتے تھے اُن کے اسپیکر' لانگ پلے' ٹیپ ریکارڈر بھی ساتھ ہی ہوتے تھے' اسپیکر کو ریڈیو سے منسلک کر کے ایک پلگ لگا دیا جاتا تھا اور ناب گھما کر مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کے پروگرام سنے جاتے تھے' جونہی اسپیکر کو ریکارڈ پلیئر کے ساتھ فٹ کر کے آن کیا جاتا ریکارڈ بجنے شروع ہو جاتے۔ ریڈیو اُس زمانے میں ایک انوکھی اور قیمتی چیز تھی اس لیے ہر کوئی ریڈیو نہیں خرید سکتا تھا' جن لوگوں کے گھروں میں ریڈیو ہوتے تھے اُن کا شمار بھی صاحب حیثیت لوگوں ہی میں ہوتا تھا۔ مارکیٹ میں انگلینڈ اور جرمنی کے ریڈیو آتے تھے اُس کے علاوہ جنرل الیکٹرک کمپنی کے 'بش' پائی' مرفی' اور فلپس جیسے نام بھی لوگوں میں مشہور تھے' خاص طور پر جرمنی کے ریڈیو تو اپنی خوبصورتی اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ اُس زمانے میں ریڈیو کے ساتھ ایریل' انٹینا لگانا بھی ضروری ہوتا تھا تاکہ ریڈیو کی آواز صاف سنائی دے یہ انٹینا دو عدد لمبے لمبے بانسوں پر مشتمل ہوتا تھا جس کے درمیان انٹینا کی تار باندھی جاتی تھی' بجلی سے چلنے والے ریڈیو کے بعد بیٹری سے چلنے والے ریڈیو یعنی ٹرانسسٹر کا دور بھی آیا' جب لوگ ایک بینڈ کا ریڈیو سیٹ ہاتھوں میں پکڑ کر چلنے میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔

آج کل ہماری تفریح کے لیے کئی چیزیں آگئی ہیں' جن میں ٹیلی ویژن' کیبل' انٹرنیٹ' ڈی سی آر اور ڈی وی ڈی وغیرہ شامل ہیں۔ موجودہ میڈیا نے لوگوں کے ذہن میں سستی قسم کی تفریح کے تصور کو اجاگر کیا ہے لیکن ہمارے ذہن میں تو ماضی کے ریڈیو کی یادیں محفوظ ہیں جن کو ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے' ریڈیو کی انہی بھولی بسری یادوں نے ہمیں اپنا گرویدہ بنایا ہوا ہے' عام طور پر وہی یادیں حافظہ میں محفوظ رہتی ہیں جن کا طبیعت پر کوئی اچھا اثر پڑا ہو' ریڈیو پروگراموں کی ایک ایک یاد ہمارے دل و دماغ میں اس طرح نقش ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو' اب تو ریڈیو کے گزرے دنوں کی باتیں ایک خواب معلوم ہوتی ہیں' اب تو سب کچھ بدل گیا ہے' نہ وہ ریڈیو رہا نہ ریڈیو کا زمانہ' ریڈیو پر نشر ہونے والے فلمی گیتوں کی لاجواب اور صدابہار دُھنیں بھلا کون بھول سکتا ہے' اُس زمانے کی دھنوں میں کلاسیکل رنگ ہوا کرتا تھا' گیتوں کی موسیقی اس قدر مسحور کن ہوتی تھی کہ سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھی۔ اُس زمانے میں ریڈیو کے علاوہ کوئی اور سہولت تو موجود نہیں تھی البتہ گراموفون موجود تھا چونکہ یہ بھی ایک قیمتی چیز تھی اس کو بھی ہر کوئی نہیں خرید سکتا تھا۔

ریڈیو کے زمانے میں ہر نئی فلم کے گیت سب سے پہلے ریڈیو ہی سے نشر کئے جاتے تھے اسی طرح فلموں کے گراموفون ریکارڈ بھی فلموں کی

نمائش سے پہلے ہی جاری کر دیے جاتے تھے اور وہ ریکارڈ بہت جلد عوام میں مقبول بھی ہو جاتے تھے' آج بھی شاید بہت سے گھروں میں وہ ریکارڈ موجود ہوں گے اب تو اُس زمانے کے ریکارڈ بھی نوادرات کا حصہ بن چکے ہیں۔ گراموفون پر چلنے والا ہنر ماسٹر وائس کا ریکارڈ بھی کمال کی چیز تھی۔ ہر ریکارڈ پر رنگین کتے کی تصویر بنی ہوئی تھی جو ریکارڈ سنتا ہوا دکھائی دیتا تھا یہی اس کا امتیازی نشان تھا' گراموفون کا کسی گھر میں ہونا اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ بہت برس پہلے ریڈیو اور اب ٹیلی ویژن' گراموفون ریکارڈ کی جگہ آج کل سی ڈیز آ گئی ہیں۔ یہ بھی ریکارڈ ہی کی جدید شکل ہے' گراموفون بجانے کے لیے مشین میں ہاتھ سے چابی بھر دی جاتی تھی جس سے ٹرن ٹیبل گھومنا شروع ہو جاتی اور اُس کے اوپر رکھا ہوا ریکارڈ بھی گھومنے لگتا جونہی ساؤنڈ بکس کی سوئی کو ریکارڈ پر رکھ دیا جاتا وہ بجنا شروع ہو جاتا اس مشین کا ایک بڑا سا بھونپو بھی ہوتا تھا جس سے آواز دور دور تک پہنچ جاتی تھی' بعد میں آنے والے گراموفون میں لاؤڈ اسپیکر لگائے جاتے تھے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گراموفون بہت خوبصورت اور نفیس ہو گئے تھے جو چابی اور بجلی دونوں ہی سے چلتے تھے قیمتی گراموفون کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اُن پر ایک ہی بار پانچ چھ ریکارڈ لگا دیے جاتے تھے اور وہ انہیں باری باری بجاتی تھی گراموفون ایڈیسن کی ایجاد تھی جس نے انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

اُس زمانے میں یہ ریکارڈ ہنر ماسٹر وائس کی کمپنی تیار کرتی تھی اور ہنر ماسٹر وائس کے ریکارڈ ہوٹلوں' بسوں اور شادی بیاہ کے موقع پر مشین پر ہی سنے جاتے تھے' یہ مشین مکمل مکینکل ہوتی تھی۔ کیونکہ ابھی الیکٹرونکس کا دور شروع نہیں ہوا تھا

گراموفون کے حوالے سے ہندوستان کے نامور اداکار دلیپ کمار کے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو دلیپ کمار پر لکھی گئی کتاب 'دلیپ کمار کی بچپن کی یادیں' میں درج ہے۔

دلیپ کمار کو بچپن ہی سے ریکارڈ سننے کا بہت شوق تھا وہ اسکول سے واپس آ کر چپکے سے دادی کے پلنگ کے نیچے گھس جاتا اور ہلکی آواز میں اپنے پسندیدہ ریکارڈ سنتا رہتا دلیپ کمار کی دادی بہت سخت مزاج اور عبادت گزار خاتون تھیں جب وہ دلیپ کمار کے ہاں آتی تھیں تو بچوں کو گراموفون بجانے سے منع کر دیا جاتا تھا تا کہ اُن کی عبادت میں خلل نہ پڑے اور گراموفون کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھنے کے لیے دادی کے پلنگ کے نیچے رکھوا دیا جاتا تھا' دلیپ کمار کی دادی پلنگ کے اوپر بیٹھ کر بلند آواز میں عبادت کرتی رہتی تھیں اور دلیپ کمار پلنگ کے نیچے بیٹھا ریکارڈ سنتا رہتا تھا' وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میرے کمرے سے عجیب وغریب آوازیں آتی رہتی ہیں مگر اُن کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی ہیں دلیپ کمار ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے ایک عظیم اداکار ہیں اُن کی فلموں کے ریکارڈ عام طور پر فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی مارکیٹ میں آ جاتے تھے۔ 'مغلِ اعظم' واحد فلم تھی جس کے ریکارڈ فلم ریلیز ہونے کے ساتھ ہی مارکیٹ میں آئے تھے اور قطار میں لگ کر فروخت ہوا کرتے تھے۔ 'مغلِ اعظم' کے گیتوں کو بھی ریڈیو ہی کی وجہ سے شہرت ملی تھی۔

ہمارے گھر میں سب سے پہلے ٹیپ ریکارڈر میرے بھائی محمد نسیم اختر لائے تھے اُن کا تعلق انجینئرنگ کے شعبہ سے ہے وہ لاہور کے ترقیاتی ادارے میں الیکٹریکل انجینئر ہیں اُن کا شمار ملک

کے تجربہ کار انجینئروں میں ہوتا ہے' وہ جو ٹیپ ریکارڈر لائے تھے وہ جدید ٹیپ ریکارڈر تھا جس کے ساتھ تین بینڈ کا ریڈیو بھی تھا جو بجلی اور بیٹری دونوں ہی سے چلتا تھا' ریکارڈ پلیئر کے ساتھ ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے کافی ریکارڈ تھے جو سب کے سب ایرانی کمپنی 'کراؤن' کے بنے ہوئے تھے۔ اُن ریکارڈوں میں فریدہ خانم کی غزلوں کے دو نایاب ریکارڈ بھی تھے جو انہوں نے 1950ء کی دہائی میں گائی تھیں ایک غزل مرزا غالب کی تھی' مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے' دوسری غزل صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی فلم 'شام ڈھلے' کی تھی۔ غزل کے بول تھے' سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی' یہ دونوں غزلیں ریڈیو کے مشہور موسیقار نیاز حسین شامی نے کمپوز کی تھیں۔ اِن ریکارڈوں میں ایک غزل اختر شیرانی کی بھی تھی غزل کے بول تھے' آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو' تو جانِ آرزو ہے کہ ایمان آرزو' یہ غزل بھائی محمد نسیم اختر کو ذاتی طور پر بڑی پسند تھی جو اُس زمانے میں اکثر ریڈیو پر بھی لگا کرتی تھی۔ انہیں نادر و نایاب چیزوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی ایک دفعہ وہ سرکاری دورے پر چین گئے نادر و نایاب اشیاء کی ایک مارکیٹ میں انہیں فلپس کمپنی کا ایک ابتدائی ماڈل کا ریڈیو نظر آیا جس کی قیمت تو کافی زیادہ تھی یعنی پاکستانی کرنسی کے لحاظ سے پانچ ہزار لیکن وہ ریڈیو انہیں اتنا پسند آیا کہ فوراً خرید لیا تھا۔

1960ء میں جب ہمارے گھر میں ریڈیو آیا تو سارے محلے میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی' کیا بڑے کیا بچے سب ہی ہمارے گھر ریڈیو سننے کے لیے چلے آ رہے ہیں' ہمیں تو اتنی خوشی ہوئی کہ سونے کی بجائے ساری رات ریڈیو پروگرام ہی سنتے رہے وہ فلپس کمپنی کا تین بینڈ کا ریڈیو تھا' ہم صبح کے وقت ریڈیو سیلون اور رات کے وقت آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام اور فرمائشی گیت سنتے' بی بی سی اور ریڈیو پاکستان کی خبریں اور تبصرے ہم بڑی دلچسپی سے سنا کرتے تھے گھر کا ہر فرد ریڈیو کی سوئی گھما گھما کر اپنی اپنی پسند کے پروگرام تلاش کرتا کیونکہ اُس زمانے میں ریڈیو ہی معلومات کا ذریعہ اور ہماری واحد تفریح تھی' اُس دور میں بجلی سے چلنے والے ریڈیو میں ٹیوبیں ہوتی تھیں جو خراب ہونے پر تبدیل کروانی پڑتی تھیں' ویسے بھی جب کبھی ریڈیو خراب ہو جاتا تو ہمارے بیس پچیس روپے صرف ہو جاتے' لیکن ریڈیو کی درستگی ضروری ہوا کرتی تھی' مجھے ایک تجسس تھا کہ ریڈیو کھول کر اس کی مشینری دیکھی جائے ایک بار جب ریڈیو خراب ہوا تو میں نے والد صاحب کی عدم موجودگی میں خود ہی اسے کھول کر ٹھیک کرنے کی کوشش کی' ریڈیو کی مشینری دیکھی ایک ایک کر کے تمام ٹیوبیں تبدیل کیں لیکن ریڈیو پھر بھی ٹھیک نہ ہوا کیونکہ ریڈیو کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں۔ لہٰذا اُسی طرح بند کر دیا' یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ہم گوجرانوالہ کے محلے بختے والا میں رہتے تھے۔

میرے والد شمس الدین تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے اس لیے انہوں نے بچوں کو بھی تعلیمی ماحول دیا' میں گھر میں بڑا تھا مجھ سے چھوٹا بھائی محمد نسیم اختر اور اس سے چھوٹی دو بہنیں سلمیٰ اور ثریا تھیں' ہمارا گھر بیروں کھیائی دروازہ مین روڈ کے قریب تھا' تانگوں کا رواج عام تھا لیکن آج کل کی طرح شور شرابہ اور افراتفری کا عالم نہیں تھا' ہمارا گھر کافی بڑا تھا پیچھے دو کمرے آگے دلان صحن کشادہ جس کے بائیں جانب باورچی خانہ تھا۔

مین گیٹ کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا جو زیادہ تر والد صاحب کے استعمال میں رہتا تھا‘ ہم پڑھنے لکھنے کے بعد وہاں بیٹھ کر ہی ریڈیو پروگرام سنا کرتے تھے‘ عام طور پر رات کی خبروں کے بعد ریڈیو بند کر دیا جاتا تھا‘ مجھے بچپن ہی سے شعر و ادب اور مطالعہ سے دلچسپی رہی ہے‘ اور میرا واحد مشغلہ ریڈیو سننا ہی تھا‘ آج میری شناخت ایک استاد‘ شاعر اور ادیب کے حوالے سے بھی ہے‘ شاید یہ بھی ریڈیو ہی کی دین ہے مجھے بچپن کے زمانے کا وہ ہیڈفون ریڈیو ابھی تک یاد ہے جو میں اور میرا بھائی محمد نسیم اختر بنایا کرتے تھے‘ اُس وقت میں نویں جماعت میں تھا‘ میں نے کسی کتاب میں ہیڈفون ریڈیو بنانے کی ترکیب کے بارے میں پڑھا تھا اِس چھوٹے سے سرکٹ کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی‘ ریسور‘ ٹرانسٹر‘ کرسٹل اور چند تانبے کی تاریں جن سے ہم کوائل بنالیا کرتے تھے‘ اس طرح ریڈیو سیٹ تیار ہو جاتا آواز بڑھانے کے لیے ہیڈفون کی جگہ چھوٹا سا اسپیکر لگا لیا کرتے تھے لیکن اُس ریڈیو سیٹ میں ایک خرابی تھی کہ رات کے وقت کئی ریڈیو اسٹیشن ایک ساتھ بولنے لگتے اگرچہ قریب ترین ریڈیو اسٹیشن کی آواز نمایاں سنائی دیتی لیکن دوسرے اسٹیشنوں کے پروگرام آپس میں گڈمڈ ہو جاتے لیکن ہم نے کوشش کر کے ریڈیو اسٹیشنوں کو کنٹرول کرنے کا حل بھی تلاش کر لیا جو کہ صرف ایک بٹن کا اضافہ تھا۔

ابتدائی دور میں ریڈیو کی نشریات صبح‘ دوپہر اور شام کے مخصوص اوقات میں ہوا کرتی تھیں رات ساڑھے دس بجے ریڈیو کے پروگرام ختم ہو جاتے تھے‘ آخری پروگرام کلاسیقی موسیقی کا ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے نامور موسیقار اور سازندے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے‘ یہ کلاسیقی موسیقی کے وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف اپنا نام پیدا کیا بلکہ پاکستان کا نام بھی روشن کیا‘ اُن میں استاد بڑے غلام علی خاں‘ استاد سلامت علی خاں‘ استاد امانت علی خاں‘ استاد امراؤ بندو خاں‘ استاد امید علی خاں اور ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں‘ اُس زمانے میں ریڈیو پروگراموں پر مشتمل ایک رسالے ’پندرہ روزہ آہنگ‘ کا بھی آغاز ہوا تھا جس کے مدیر غلام عباس تھے۔ (جو آج بھی شائع ہوتا ہے) اس رسالے میں ریڈیو پر نشر ہونے والے پروگراموں کی مکمل تفصیل ہوتی تھی‘ یہ رسالہ باقاعدگی سے ہمارے گھر بھی آتا تھا۔

ابتدائی دور میں ریڈیو پاکستان سے انگریزی خبریں ایک انگریز ایرک وائر سنایا کرتے تھے‘ اردو خبریں شکیل احمد اور انور بہزاد سنایا کرتے تھے‘ شکیل احمد کی آواز میں بڑی گھن گرج ہوتی تھی‘ انور بہزاد مشہور شاعر بہزاد لکھنوی کے صاحبزادے تھے‘ ان دونوں نیوز کاسٹروں کی آوازیں ایسے لگتی تھیں جیسے اِن آوازوں کے ساتھ ہماری صدیوں کی شناسائی ہو‘ اِن دونوں کو کبھی کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا‘ لیکن خبریں سننے والے انہیں اپنے تصور میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے محسوس کرتے تھے‘ کیونکہ وہ ریڈیو کا زمانہ تھا اُس زمانے میں خبریں رات آٹھ بجے سنائی جاتی تھیں‘ اور صرف پندرہ منٹ کی ہوا کرتی تھیں۔ خبروں کے دوران کسی قسم کے کمرشل کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا کیونکہ ریڈیو پر مکمل حکومت کا کنٹرول تھا۔ خبروں کے بعد خبروں پر تبصرہ بھی ہوا کرتا تھا تاکہ ریڈیو کے سامعین اہم خبروں کے مختلف پہلوؤں سے بھی واقف ہو سکیں‘ خبروں

کے بعد آپا شمیم روزانہ بچوں کو کہانی سنایا کرتی تھیں' اُن کی کہانی سنانے کا انداز بے حد خوبصورت ہوتا تھا' آپا شمیم کو اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ پر مکمل عبور حاصل تھا' کہانی کے بعد بچوں کا گیت ہوتا' علامہ اقبال کی دعا لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری' جو آج بھی اسکولوں میں بچوں سے پڑھوائی جاتی ہے' ماضی کی مشہور گلوکارہ منور سلطانہ کی آواز میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ 'اے قائد اعظم تیرا احسان ہے'...... 'ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے'...... 'آؤ بچوں سیر کرائیں تم کو پاکستان کی'...... 'میں چھوٹا سا ایک لڑکا ہوں' یہ تینوں ملی نغمے منور سلطانہ اور سلیم رضا نے فلم 'بیداری' کے لیے گائے تھے۔ بیداری کی موسیقی فتح علی خان نے ترتیب دی تھی۔ یہ وہ ملی گیت ہیں جنہیں کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔

موسیقی کے پروگراموں میں ریڈیو سیلون کا نام بہت مشہور تھا' ریڈیو سیلون اُس زمانے میں ہندوستان اور پاکستان کے مقبول گیتوں پر مشتمل ایک پروگرام 'گیت مالا' نشر کیا جاتا تھا جس کو لوگ بڑے شوق سے سنا کرتے تھے' ملکہ پکھراج کی آواز میں گایا ہوا نغمہ 'ابھی تو میں جوان ہوں' جس کے شاعر حفیظ جالندھری تھے اور شمشاد بیگم کا گایا ہوا نغمہ 'ایک بار پھر کہو ذرا کہ میری ساری کائنات تیری ایک نگاہ پر نثار ہے' اس نغمے کے شاعر سرور نیازی تھے' یہ دونوں نغمے اکثر ریڈیو سیلون سے نشر کیے جاتے تھے جو آج بھی سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتے ہیں' ہندوستان کی فلموں کے مشہور گیت بھی اس پروگرام میں شامل کیے جاتے تھے' ریڈیو کے ابتدائی گلوکاروں میں فضل حسین' عنایت حسین بھٹی' علی بخش ظہور اور عالم لوہار شامل تھے۔ اِن گلوکاروں کی آوازوں میں سوز و گداز اور درد ہوتا تھا' عالم لوہار ایک لوک فنکار تھے لوگ نہ صرف اُن کے گانے ہز ماسٹر وائس کے ریکارڈ پر سنتے تھے بلکہ محفلوں میں بھی اُنہیں بڑے شوق سے سنا جاتا تھا کیونکہ وہ ایک اسٹیج فنکار تھے لوگ عالم لوہار کو سننے کے لیے ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتے۔

ریڈیو کا ایک پروگرام 'بھولے بسرے گیت' کے عنوان سے پیش کیا جاتا تھا جس میں وہ نغمے جو بہت ہی کم سننے میں آتے تھے لیکن اپنے وقت کے مشہور گیت تھے نشر کیے جاتے اُن نغموں میں ایک نغمہ شرافت علی خان کا پہلا اور آخری گیت تھا جس کے بول تھے 'جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں' شاید انہوں نے کوئی اور گیت بھی گایا ہو جو میرے علم میں نہیں' ایک اور گلوکار ایس بی جون بھی صرف ایک ہی نغمہ گا کر گلوکاروں کی صف میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے ایک ہی نغمے سے ایسی لازوال شہرت حاصل کی جو کچھ لوگوں کو عمر بھر کی تگ و دو کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی' اُن کا تعلق کراچی سے ہے' انہیں اس گیت پر پرائیڈ آف پرفارمنس بھی مل چکا ہے' اور یہ پاکستان کا ماسٹر پیس گیت ہے گیت کے بول تھے 'تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے' یہ گانا فلم 'سویرا' سے تھا اسی طرح ثریا ملتانیکر کی آواز میں گایا ہوا فلم 'بدنام' کا گیت بھی اس پروگرام میں نشر ہوا کرتا تھا جس کے بول تھے 'بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے' کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا' ثریا ملتانیکر کا نام پورے برصغیر میں کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے معروف ہے انہوں نے فلم کے لیے بھی گایا' لیکن اُن کا یہی گیت جو فلم 'بدنام' کے لیے گایا تھا اُن کی ملکی اور بین الاقوامی شہرت کا باعث بنا۔ انہوں نے چند اور بھی فلمی گیت گائے لیکن اُن کی شہرت اسی فلمی

گیت کے محور کے گرد گھومتی ہے بھولے بسرے نغموں میں ایک نام فضل حسین فاروقی کا بھی تھا وہ بھی ابتدائی گائے والوں میں سے تھے۔ اُن کے گائے ہوئے گیت کے بول تھے' تجھ کو مبارک خوشی میرے لیے غم سہی' میری محبت میری وفا کا شاید خلاصہ یہی'

اِس پروگرام میں فلم عشق لیلیٰ سے بھی ایک گیت شامل کیا جاتا تھا جو اقبال بانو کی آواز میں تھا جس کے بول تھے' اک ہلکی ہلکی آہٹ ہے' اک مہکا مہکا سایہ ہے' مہدی حسن کی آواز میں فلم 'سرال' کا مشہور گیت' جس نے میرے دل کو درد دیا' اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں' اس گیت کے شاعر منیر نیازی تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی پرانی فلموں کی کامیابی میں بھی ریڈیو کا بڑا حصہ رہا ہے جن فلموں کے گیت ریڈیو پر مقبول ہوجاتے تھے وہی فلمیں لوگ سینما گھروں میں جاکر دیکھتے تھے' یہی وجہ ہے کہ پاکستانی پرانی فلموں کے گیت آج بھی پہلے کی طرح تروتازہ ہیں اور اُن کی موسیقی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے' برصغیر کی مشہور گلوکارہ شمشاد بیگم بھی ابتدائی دور میں ریڈیو ہی کی گلوکارہ تھیں' اُن کی آواز میں گائی ہوئی ایک نعت اتنی مشہور ہوئی کہ گھر گھر سنائی دینے لگی اس نعت کو ہم بچپن ہی سے ریڈیو پر سنا کرتے تھے آج بھی یہ نعت سننے والوں کو بے خود کردیتی ہے نعت کے بول ہیں۔' پیغام صبا لائی ہے گلزار نبی سے' آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے' ماضی کی ایک مشہور فلمی نعت جس کی دھن خواجہ خورشید مرحوم نے بنائی تھی اکثر ریڈیو پر لگا کرتی تھی جو آج بھی سننے والوں پر رقت کا ماحول طاری کردیتی ہے جس کے بول تھے' جو نہ ہوتا تیرا جمال ہی' تو جہاں تھا خواب و خیال ہی صلو علیہ والہٖ'

ریڈیو کی نعتوں کے لیے خاص طور پر جمعہ کا دن مقرر تھا ایک بجے سے لے کر دو ڈھائی بجے تک نعتیہ پروگرام ہوتا تھا' یہاں میں ایک بہت ہی مشہور نعت کا بھی ذکر کروں گا جس کے بول ہیں' شاہِ مدینہ یثرب کے والی' سارے نبی تیرے در کے سوالی' یہ نعت اداکار نعیم ہاشمی نے فلم 'نور اسلام' کے لیے لکھی تھی نعیم ہاشمی اپنے وقت کے بہترین اسٹیج اور فلم ایکٹر تھے۔ اس کے علاوہ شاعر' رائٹر' اور ڈائریکٹر بھی تھے۔ انہوں نے نعتیں بھی لکھیں اور بہت شہرت حاصل کی تاہم وہ اُس وقت عروج پر پہنچ گئے جب انہوں نے مشہور زمانہ نعت' شاہ مدینہ یثرب کے والی لکھی جو 1957ء میں فلم 'نورِ اسلام' میں شامل کی گئی' پہلے یہ نعت سلیم رضا بعد میں زبیدہ خانم اور پھر میڈم نور جہاں نے پڑھی' اب تو شاید اور بھی کئی گلوکاروں نے اپنی اپنی آوازوں میں اس نعت کو ریکارڈ کروایا ہے۔ ریڈیو کے اس پروگرام میں نعتوں کے ساتھ ساتھ قوالیاں بھی پیش کی جاتی تھیں جس کو سامعین بڑے شوق اور عقیدت سے سنا کرتے تھے۔

1965ء کی پاک بھارت کو ایک مدت گزر چکی ہے' اِس جنگ کے دوران ریڈیو پاکستان کے مجاہدانہ کردار اور اس کی خدمات کو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا اس جنگ کی ناقابل فراموش یادیں ابھی تک ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ جنگ فوج' عوام اور ریڈیو پاکستان نے لڑی تھی تو غلط نہیں ہوگا' جب بھارت نے بلا اطلاع 6 ستمبر 1965ء کو پاکستان پر حملہ کردیا تھا سارے پاکستان میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی' ایک دفعہ پھر وہی جذبہ جہاد تازہ ہوگیا تھا جو تقسیم ملک سے قبل تھا' صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے اپنے خطاب میں ایک زبردست

جملہ استعمال کیا تھا۔ ''جنگ چھیڑنے والو! تم نہیں جانتے کہ تم نے کس قوم کو للکارا ہے'' یہ جملہ ہر ریڈیو اسٹیشن سے گونج رہا تھا' اس کے ساتھ ساتھ اُس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر بھی ہر ریڈیو اسٹیشن نشر کر رہا تھا' سیالکوٹ کے محاذ پر بھارت کے ساتھ ٹینکوں کی شدید ترین جنگ ہوئی تھی جو دوسری عالمی جنگ کے بعد سب سے بڑی جنگ تھی' ہماری مسلح افواج کے جوانوں نے اپنی جانیں قربان کر کے دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ اِس جنگ میں پاکستان ایئر فورس کا کردار سب سے نمایاں تھا۔

جنگ کے دوران لوگ پل پل کی خبر سننے کے لیے بے چین رہتے' جنگی ترانوں کا ایک سلسلہ تھا جو ریڈیو پر چھایا ہوا تھا ایک طرف تو فضاؤں میں گولیوں اور توپوں کی خوفناک آوازیں تھیں تو دوسری طرف ملی ترانوں اور نغموں کی آوازیں بھی اِن میں شامل ہو گئیں' اِن ملی ترانوں اور نغموں نے فوجی جوانوں کو خراج عقیدت پیش کر کے اُن کے جذبوں اور حوصلوں کو ایک نئی زندگی دی فلم 'مجاہد کا ترانہ 'ساتھیوں مجاہدو' جاگ اٹھا ہے سارا وطن' اتنا مشہور ہوا کہ گلی کوچوں میں بھی گایا جانے لگا۔ نور جہاں کی آواز پوری قوم کی ترجمان تھی۔ 'اے وطن کے سجیلے جوانوں' میرے نغمے تمہارے لیے ہیں' 'میرے ڈھول سپاہیا' 'ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے' 'رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو' میرا سوہنا شہر قصور نیں' سمیت بے شمار ملی نغمے گا کر قوم اور فوج کے جوش و ولولہ میں اضافہ کیا' یہی ترانے ملکہ ترنم نور جہاں محاذ جنگ پر جا کر بھی سنایا کرتی تھیں' یہ ترانے ریڈیو پاکستان نے ہی ریکارڈ کیے تھے' یہ وہ دور تھا جب فنکاروں نے ریڈیو پاکستان کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا۔ ریڈیو پاکستان کے تمام شعبوں کے اسٹاف نے جس طرح دن رات جاگ کر جنگی ترانے ریکارڈ کیے اور اپنے پروگراموں میں پیش کیے وہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے' شہنشاہ غزل مہدی حسن بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے انہوں نے اپنی پُرسوز آواز میں قوم کے مجاہدوں کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔ اپنی جاں نذر کروں' اپنی وفا پیش کروں' اس ملی نغمے کے شاعر مسرور انور تھے۔ 'خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام' یہ نغمہ رئیس امروہوی نے آدھے گھنٹے میں لکھا تھا' مہدی حسن نے اُسی وقت اس کی دھن بنائی اور چند گھنٹوں کے اندر یہ نغمہ ریڈیو پر نشر کر دیا گیا' مہدی حسن کی آواز کے بارے میں برصغیر کی عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر کا کہنا تھا کہ مہدی حسن کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔

شوکت علی کا گایا ہوا ترانہ 'اے دشمن دیں تو نے کس قوم کو للکارا ہے' اس ترانے کو حمایت علی شاعر نے لکھا تھا اور اس کی موسیقی خلیل احمد نے ترتیب دی تھی امانت علی خان کی آواز میں گائے ہوئے ان نغموں 'اے وطن پیارے وطن' 'چاند میری زمین پھول میرا وطن' نے بڑی شہرت حاصل کی۔ 'جنگ کھیڈ نئیں ہوندی زنانیاں دی' یہ نغمہ نگہت سیماں اور تاج ملتانی نے ریکارڈ کروایا اس نغمے کے شاعر ڈاکٹر انور تھے۔ عنایت حسین بھٹی کا ترانہ 'اے مرد مجاہد جاگ ذرا' اب وقت شہادت ہے آیا' نسیم بیگم کی آواز میں گایا ہوا مشہور نغمہ 'اے راہِ حق کے شہیدو' وفا کی تصویروں تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں' یہ نغمہ انہوں نے روح کی گہرائیوں سے گایا تھا۔ لوک فنکار عالم لوہار بھی دفاع وطن کی اس جنگ میں کسی سے پیچھے نہیں رہے' وہ اپنا چمٹا لے کر میدان جنگ میں کود پڑے اور اپنی مخصوص آواز میں وطن کی شان میں

یہ گیت گایا۔ ’دنیا جانے میرے وطن کی شان‘ پاک بھارت جنگ کی وجہ سے راتیں تاریک ہوتی تھیں توپوں کی گھن گرج کی وجہ سے زمین لرز جاتی تھی اور دروازے خود بخود کھٹکنے لگتے تھے اور پھر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے تھے۔ اعجاز حسین بٹالوی روزانہ مجازِ جنگ پر جا کر حالات کا جائزہ لیتے اور شام کو ریڈیو پاکستان سے ’آج کی بات‘ کے عنوان سے ایک پُر جوش تقریر کرتے‘ نیوز ریڈر شکیل احمد جب پاک فوج کی فتوحات کی خبریں سناتے تو اُن کے جذباتی انداز کی وجہ سے فضا نعرہ تکبیر سے گونج اٹھتی تھی 1965ء کی جنگ زیادہ طویل نہیں تھی صرف سترہ دن تک لڑی گئی تھی۔

ریڈیو کے عروج کے زمانے میں رائٹر تعلیم یافتہ تھے اور سچے جذبوں سے لکھتے تھے‘ اُن کی تحریریں روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں سید امتیاز علی تاج‘ سعادت حسن منٹو اور اشفاق احمد ایسے لوگوں میں شامل تھے حکیم احمد شجاع ابتدائی دور کے ڈرامہ نگاروں میں سے تھے‘ انہوں نے جو ڈرامے ریڈیو کے لیے لکھے اُن کے مکالمے آج بھی زبان و بیان کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کے چند مشہور ڈرامے فتح طرابلس‘ ہیرے کی چوری‘ کانوس‘ شاہکار‘ سلطان صلاح الدین ایوبی‘ اور ٹیپو سلطان ہیں اُن کا شمار ریڈیو کے یادگار ڈراموں میں ہوتا ہے اس کے علاوہ جشن تمثیل کے حوالے سے بھی ڈرامے پیش کیے جاتے تھے جن کے کردار اپنی مثال آپ تھے‘ یہ ڈرامے رات کو 9 بجے سے 10 تک ہوا کرتے تھے 1969ء میں پیش کیے جانے والا ڈرامہ ’رانی‘ مجھے ابھی تک یاد ہے ہم سب بہن بھائی بیٹھے ڈرامہ سن رہے تھے وہ جذباتی ڈرامہ سننے کے دوران سب کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ وہ کردار تھے جو سننے والوں کا دل موہ لیتے تھے ریڈیو کا ایک ایک پروگرام شاہکار اور اس کا ہر صداکار ایک جادو تھا۔ کم تنخواہوں اور کم سہولتوں کے باوجود انہوں نے قومی خدمت کے جذبے سے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے‘ آج کل تو قومی نشریاتی اداروں کے افسران لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور دھیلے کا کام نہیں کرتے۔

سلطان علی کھوسٹ نہ صرف ریڈیو کے فنکار تھے بلکہ کئی فلموں میں بھی انہوں نے اپنی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا اُن کی شہرت بطور مزاحیہ اداکار کے ہوئی تھی ریڈیو کے پروگرام ’جمہور دی آواز‘ میں وہ چوہدری نور دین کے نام سے مشہور تھے‘ انہوں نے چوہدری نظام دین کے ساتھ ایک طویل عرصہ تک اس پروگرام میں حصہ لیا‘ وہ ریڈیو ہی کے ایک پنجابی پروگرام میں ’چاچا خیرو‘ کا کردار بھی کیا کرتے تھے۔ مشہور فنکار عرفان کھوسٹ اُنہی کے صاحبزادے ہیں‘ اور آج کے مشہور اداکار اور ہدایت کار سرمد کھوسٹ عرفان کھوسٹ کے بیٹے ہیں۔ سلطان علی کھوسٹ کی وفات کے بعد چوہدری نظام دین کے ساتھ عبداللطیف مسافر آ گئے جو ریڈیو میں چوہدری صاحب کے نام سے مشہور تھے‘ وہ پروگرام میں نہایت دانشمندی اور سمجھداری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ جب چوہدری نظام دین کی ویکلی آف ہوتی تو چوہدری قائم دین کو پروگرام میں نظام دین کی جگہ آنا پڑتا تھا وہ چوہدری نظام دین کی غیر حاضری کا خلا بڑی خوبصورتی سے پُر کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں فنکار ’جمہوری آواز‘ پروگرام کی پہچان تھے جو اپنے زمانے کا مشہور پنجابی پروگرام تھا۔ یہ پروگرام دیہاتوں اور شہروں میں ہر جگہ بڑے شوق سے سنا جاتا تھا۔

’جمہور دی آواز‘ پروگرام شروع ہونے سے

پہلے ہی لوگ اس طرح ریڈیو کے گرد بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جیسے کوئی بہت بڑی بریکنگ نیوز آنے والی ہو' چوہدری نظام دین اس پروگرام کے میزبان ہوا کرتے تھے اُن کا اصل نام مرزا سلطان بیگ تھا' وہ کاہنا کے نواحی گاؤں کوموتا کے رہنے والے تھے' چوہدری نظام دین بھی کمال کے آدمی تھے اُن کو لطیفہ گوئی اور طنز و مزاح میں بھی کمال حاصل تھا۔ وارث شاہ کا بہت سا کلام انہیں ازبر تھا۔ چوہدری نظام دین بعض اوقات اصل اسکرپٹ سے ہٹ کر کئی ایک نئی باتیں بھی کر جایا کرتے تھے' اور پروگرام کے مرکزی خیال کو متاثر بھی نہیں ہونے دیتے تھے' وہ ایک ذہین فنکار تھے حالات حاضرہ پر معنی خیز اور دلچسپ جملے کہا کرتے تھے جس سے سامعین بہت لطف اندوز ہوتے تھے' بعض اوقات وہ ملک کے حکمرانوں پر بھی طنز کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے ایک ایسے ہی طنز کی پاداش میں اُس وقت کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے انہیں نوکری سے ڈسمسڈ کر دیا تھا جو ریڈیو کے ایک مشہور فنکار کے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی۔

چوہدری قائم دین کا اصل نام رشید جیبی تھا وہ زرعی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے پروگرام کا اسکرپٹ وہی لکھا کرتے تھے اور نظام دین کو دکھانے کے بعد خود ہی پروگرام پیش کیا کرتے تھے' چوہدری قائم دین کا ریڈیو سے تعارف استاد سراج دین نے کروایا تھا وہ ریڈیو کے مشہور ستار نواز تھے جس سے چوہدری قائم دین ستار سیکھا بھی کرتے تھے' قارئین کو شاید معلوم نہ ہو کہ رشید جیبی نے ایک پنجابی گیت بھی لکھا تھا جو پرویز مہدی اور ریشماں کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا جس کے بول تھے' گوریئے میں جانا پردیس' چوہدری نظام دین اور چوہدری قائم دین دونوں ایسے فنکار تھے جن کے برجستہ مکالمے لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ جمہور دی آواز کے فرمائشی گیتوں کے لیے لوگ خطوط لکھا کرتے تھے اور اپنی پسند کا گیت سننے کے لیے ہفتہ ہفتہ انتظار بھی کرتے تھے۔' جمہور دی آواز' پروگرام میں جو امتیاز چوہدری نظام دین کو حاصل تھا وہ کسی اور کو نہ مل سکا۔

لاہور ریڈیو سے نشر ہونے والا پروگرام' پنجابی دربار' اپنے دور کا مقبول پروگرام تھا جو خالصتاً سکھوں کے لیے ہوا کرتا تھا یہ پروگرام 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ہی شروع ہوا تھا اور ایک طویل عرصے تک جاری رہا' یہ پروگرام خاص طور پر پوربی پنجاب کے رہنے والوں کے لیے تھا اُس وقت اس پروگرام کی میزبان اور کمپیئر نگار زریں ملک ہوا کرتی تھیں جو سکھوں کے مخصوص لب ولہجے کے ساتھ پروگرام کیا کرتی تھیں' دلچسپ بات یہ ہے کہ پروگرام سننے والے اُسے سکھنی ہی سمجھتے تھے اس پروگرام میں گوربانی کا کرتن' اتہاسک نیے' آج دی گل اور پنجابی گیت پیش کیے جاتے تھے۔' وشیش وانا' اُن کے ہر گرو صاحب کے جنم اور سکھوں کے ہر تہوار کے موقع پر خصوصی پروگرام نشر کیے جاتے تھے یہ پروگرام پوربی پنجاب میں بہت پسند کیا جاتا تھا بھارت سے بے شمار خطوط آتے تھے جن کے اس پروگرام میں جوابات دیے جاتے تھے' لیکن وقت کے ساتھ یہ پروگرام بھی تبدیل ہوتا گیا اور اس پروگرام کی اہمیت پہلے جیسی نہ رہی' یہ پروگرام بھی پنجابی گیت اور نغمات تک محدود ہو کر رہ گیا' اس پروگرام میں سریندر کور اور پرکاش کور کے گائے ہوئے پنجابی گیت بھی نشر ہوتے تھے چونکہ یہ دونوں بہنیں سکھ دھرم سے تعلق رکھتی تھیں

انہوں نے گلوکاری کا آغاز بھی لاہور ریڈیو ہی سے کیا تھا' ماہیا اور ڈھولک کے گیت گانے میں انہیں کمال حاصل تھا' اُن کے گیتوں کی وجہ سے بھی یہ پروگرام بہت کامیاب ہوا تھا۔

لاہور ریڈیو سے ایک پروگرام 'فوجی بھائیوں' کے نام ہوتا تھا یہ پروگرام 1965ء کی جنگ کے زمانے میں شروع ہوا تھا' جس میں فوجی بھائیوں کے پیغامات اُن کے عزیزوں' دوستوں اور رشتہ داروں کے نام نشر کیے جاتے تھے' یہ پروگرام جنگ کے دوران شروع ہوا تھا اور جنگ کے بعد بھی طویل عرصے تک نشر ہوتا رہا تھا' اس پروگرام میں فوجی بھائیوں کی پسند کے فرمائشی گیت بھی نشر کیے جاتے تھے' اس پروگرام کو یاسمین طاہر پیش کیا کرتی تھیں جو مشہور رائٹر امتیاز علی تاج کی بیٹی ہیں' لاہور ریڈیو سے ایک پروگرام 'تلقین شاہ' بھی نشر ہوا کرتا تھا یہ پروگرام طنز و مزاح سے بھرپور ہوا کرتا تھا۔ اشفاق احمد اسے خود ہی لکھتے تھے اور تلقین شاہ کا کردار بھی خود ہی کرتے تھے' اس پروگرام نے انہیں ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا' تلقین شاہ اپنے ملازموں ہدایت اللہ اور سلیمان کے ساتھ مسلسل مکالمہ کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی انہیں ڈانٹتے بھی نظر آتے تھے' کبھی کبھی اُن کے دوست خاں صاحب بھی شعر پڑھتے ہوئے حاضر ہوتے تھے وہ اس پروگرام سے معاشرے کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔ آزاد کشمیر سے ایک پروگرام 'ڈھول کا پول' بھی نشر ہوتا تھا جس میں میر صاحب اور اللہ لوک حصہ لیا کرتے تھے' کشمیر کی آزادی کا وہ گیت جو پروگرام کے آخر میں لگایا جاتا تھا آج بھی کشمیری عوام کے حوصلوں کو بلند کرتا ہے اس نغمے کے بول تھے' میرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن'

آپا شمیم کے ساتھ میری ایک ملاقات آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ کے ہال میں ایک مشاعرے کے دوران ہوئی تھی' مشاعرے کے اختتام پر شاعر نسیم فضل جنہوں نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیے تھے میرا تعارف آپا شمیم سے کروایا' وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے تپاک سے ملیں اُن کا چہرا اُن کی آواز کی طرح اب بھی خوبصورت اور تروتازہ تھا' لیکن اُن کے بالوں کی سفیدی اُن کے عمر رسیدہ ہونے کا احساس ضرور دلا رہی تھی' وہ انتہائی خوش اخلاق اور بہت جلد گھل مل جانے والی طبیعت کی مالک تھیں میری خواہش تھی کہ اُن سے ذرا تفصیلی گفتگو ہو' جب میں نے اِس خواہش کا اظہار کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور بہت بے تکلفی سے بات چیت کی' اُن سے پہلی ملاقات ہی سے یوں لگا جیسے ہماری بہت پرانی شناسائی ہو اور یہ بات بھی صحیح تھی کیونکہ اُن کی آواز تو ہم بچپن ہی سے سنتے آرہے تھے' جب میں نے کہا کہ ہم بچپن میں آپ کی کہانیاں بڑے شوق سے سنا کرتے تھے اور کہانی سے پہلے ہی ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتے تھے تو انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

آپا شمیم کا اصل نام موہنی حمید تھا اُن کی مستقل رہائش تو امریکہ میں تھی لیکن اُن دنوں وہ پاکستان آئی ہوئی تھیں' شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ شاعرہ بھی تھیں وہ عارفانہ کلام اور کافیاں لکھا کرتی تھیں' انہوں نے مشاعرے میں شاہ حسین کے انداز میں لکھی ہوئی کافی بڑے ترنم سے سنائی تھی۔ اُن کی آواز میں بلا کا جادو تھا' انہوں نے اپنے ماضی کے حوالے سے کافی دلچسپ باتیں کیں' انہوں نے بتایا کہ ہماری پرانی رہائش بھاٹی دروازے کے قریب تھی' ہمارا فنکار گھرانہ تھا' اپنے

والد صاحب کے حوالے سے بتایا کہ وہ بھی شاعر تھے اور 'ہیر وارث شاہ' سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے خود بھی 'ہیر' لکھی تھی۔ جس کے اشعار وہ اکثر محفلوں میں بڑے ترنم سے سنایا کرتے تھے ۔انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی فلمی اداکار زلفی مرحوم کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے فلموں میں اداکاری کی اور بہت شہرت حاصل کی افسوس کہ وہ جوانی ہی میں فوت ہو گئے' اپنے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔
انہوں نے بتایا کہ میں نے 1938ء میں آل انڈیا ریڈیو سے بچوں کا پروگرام شروع ہوا تو ریڈیو والوں کو پروگرام کی میزبانی کے لیے ایک آواز کی ضرورت تھی لہٰذا انہوں نے مجھے کئی نام لکھ کر دیے جن میں ایک نام آپا شمیم بھی تھا جس کو میں نے منتخب کر لیا لہٰذا اُسی دن سے میں موہنی حمید کی بجائے آپا شمیم کہلوانے لگی' انہوں نے بتایا کہ قیام پاکستان کے بعد میں لاہور میں آ گئی' وہ ریڈیو پاکستان کا ابتدائی دور تھا انہوں نے بتایا کہ اُس زمانے میں ریکارڈنگ وغیرہ تو ہوتی نہیں تھی اس لیے ہمیں ڈراموں کے ڈائیلاگ یاد کرنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی تھی' اُس زمانے میں لوگ ہمیں شکل وصورت سے نہیں بلکہ آواز ہی سے پہچان لیتے تھے' اُس زمانے میں ریڈیو آرٹسٹ ہونا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی' مشہور ڈرامہ رائٹر سید امتیاز علی تاج کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ ڈراموں میں میرے لیے ایسے ڈائیلاگ لکھتے تھے جنہیں میں بڑی روانی سے بول جاتی تھی۔ اپنے دور کے مشہور ڈراموں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ 'اکھیاں' ساکوشی' اور 'مامتا' میرے یادگار ڈرامے تھے۔ مامتا کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ اس ڈرامے میں میرے تین کردار تھے۔ دادی' ماں اور چھوٹی بچی' یہ تینوں کردار میں نے اکیلے ہی کیے تھے' دلچسپ بات یہ ہے کہ سامعین میں سے کوئی بھی نہ جان سکا کہ تینوں کردار کسی ایک فنکارہ نے ادا کیے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے چالیس سال ریڈیو پروگرامز کو دیے ہیں اس کے باوجود میں اب بھی ریڈیو والوں اور سامعین کو بہت یاد کرتی ہوں۔ میں جب پاکستان میں ہوتی ہوں تو اپنے گھر میں مشاعرے کا اہتمام ضرور کرتی ہوں' آپا شمیم کی گفتگو کافی دلچسپ تھی اُن کا مطالعہ کافی وسیع تھا اُن کی پنجابی شاعری پنجابی زبان سے محبت کی علامت تھی۔ پی ٹی وی کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ پی ٹی وی کی پہلی اناؤنسر کنول نصیر آپا شمیم ہی کی بیٹی ہیں' جنہوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز ریڈیو ہی سے کیا تھا اور پھر پاکستان ٹیلی ویژن کی اولین اناؤنسر بن گئیں اور پی ٹی وی میں نصف صدی سے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دینے کے بعد آج کل ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں کنسلٹنٹ کے فرائض انجام دے رہی ہیں' اُن کی پہلی اناؤنسمنٹ کے الفاظ اُس زمانے کے لوگوں کو آج بھی یاد ہوں گے۔ ''آپ کو مبارک ہو پاکستان میں ٹیلی ویژن آ گیا ہے۔'' آپا شمیم کی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے 1964ء میں تمغہ امتیاز سے نوازا انہیں پی ٹی وی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی ملا ۔ پھر ایک دن اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی۔ بقول فراق گورکھپوری 'دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں' آپا شمیم ایک عظیم اور سچی فنکارہ تھیں ریڈیو کے حوالے سے اُن کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

☆☆......☆☆

بدیسی کہانی

دنیا کی مختلف زبانوں سے ترجمہ کی گئی کہانیاں

ایک عجیب مقدمہ

(ترکی ادب سے)

رُشاد نوری/ ترجمہ سید شاہ ضمیر

جج: (ملزم سے) ''تمہارا نام؟'' ملزم: ''حسین ادیب۔''

جج: ''تمہاری عمر؟''
ملزم: ''44 سال۔''
جج: ''تمہارا پیشہ؟''
ملزم: ''انجینئر۔''
جج: حسین! تم انجینئر ہوتے ہوئے اپنے آپ کو ڈاکٹر کہلواتے ہو...... یہاں تک کہ اب تم آپریشن بھی کرنے لگے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے؟''
ملزم: (حیران و پریشان ہوکر) جان کی امان جناب والا' بندہ کس طرح بغیر ڈگری کے ڈاکٹری کرسکتا ہے؟ اس بارے میں یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''
جج: ''یعنی تم انکار کرتے ہو' اچھا تو پہلے گواہوں کو سن لیں' پھر تم سے مزید بات ہوگی۔''
(جج چوبدار سے بات کرتا ہے' عدالت میں تیس پینتیس برس کی ایک خاتون کو بلایا جاتا ہے)
جج: (خاتون سے کچھ سوال پوچھنے کے بعد)
''ندیمہ خانم! آپ کو جو کچھ معلوم ہے' بیان کریں۔''
ندیمہ خانم: ''جناب میرا خاوند اچھا خاصا صحت مند ہے' مگر اسے جب درد قولنج ہوا تو ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے اپنڈکس تشخیص کیا اور کہا کہ اس کا فوراً آپریشن کرنا ہوگا۔ میں یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتی کہ مجھے اپنے خاوند سے بہت محبت ہے' اس لیے میں اس کی بیماری اور اس کے علاج سے متعلق اچھی طرح تسلی کرکے کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا آپریشن کروانا چاہتی تھی۔
جج: ''یہ آپ کا حق ہے ندیمہ خانم...... اپنا بیان جاری رکھیں۔''
ندیمہ: جناب والا! مخمورہ نام کی میری ایک دوست ہے۔ اس کے خاوند کو بھی اپنڈکس تھا۔ ایک سرجن نے اس آپریشن کیا۔ اس نے پانچ سولیرے لے کر مریض کو ایک مہینے میں بھلا چنگا کردیا تھا۔ اب وہ ہماری طرح صحت مند ہو چکا ہے۔ میری دوست جو مجھے اپنے خاوند کے سرجن کے گھر لے گئی تھی' اس نے مجھے سمجھایا کہ پیاری' پیسے تو دوبارہ بھی آ جاتے ہیں' مگر گئی ہوئی صحت نہیں' لہٰذا جیسے بھی ہو فوراً اپنے شوہر کا علاج اس ڈاکٹر سے کروالو۔
جج: (ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس سرجن سے آپ کی ملاقات ہوئی؟
ندیمہ: جی ہاں...... اسی روز۔''
جج: ''آپ اسے پہچانتی ہیں؟''
ندیمہ: ''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اسے پہچانتی نہ ہوں؟ (ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہیں ڈاکٹر صاحب۔''
ملزم: محترمہ! خدا کے لیے' حقیقت میں میری جو گفتگو آپ سے ہوئی تھی وہ کہیں نا' ورنہ جھوٹ بول کر کیوں اپنے آپ کو جہنم کے شعلوں کے حوالے کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے جو کہا تھا وہی جج صاحب کے سامنے بیان کریں۔''
ندیمہ: ''بتاتی ہوں...... (جج سے مخاطب ہوکر) یہ صاحب کہتے تھے کہ میں سرجن وغیرہ نہیں ہوں بلکہ انجینئر ہوں۔ اپنے خاوند کے علاج کے لیے کوئی اچھا سا سرجن تلاش کرو۔'' میں ہاتھ باندھ کر اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ اگر پانچ سولیرے کم ہیں تو میری سونے کی بالیاں' جھومر اور گلے کا ہار لے لو' پر خدارا میرے پیارے خاوند کو بچالو مگر انہوں نے وہی ایک نوح کی رٹ لگائی مگر پیغمبر نہ کہا (یعنی یہ کسی طور نہ مانے)۔''
ملزم: (بڑی ممنونیت کے ساتھ...... جج سے) سنا آپ نے جج صاحب؟ جو سچ ہے آپ پر آشکار ہو چکا ہے۔''
جج: جلدی مت کرو...... اب دوسرے گواہوں کو سن

لیں جو یہاں موجود ہیں...... مخمورہ خانم کو پیش کرو۔"
(دومنٹ بعد عدالت میں مخمورہ خانم آتی ہے' وہ بھی ندیمہ خانم کی عمر کی ہے' مگر اس کے برعکس یہ لمبے قد اور پتلے جسم کی مالک...... یہاں تک کہ اس کی آواز بھی باریک ہے)۔

جج: "مخمورہ خانم! آپ کو (ملزم کے بارے میں) جو معلوم ہے بیان کریں۔"

مخمورہ: "میری دوست نے جب مجھ سے ایک اچھے ڈاکٹر سرجن کا پتہ پوچھا تو میں نے (ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا۔"

جج: "ملزم کے سرجن ہونے کا آپ کو کیسے علم ہوا؟"

مخمورہ: "میں بھلا کیسے نہ جانتی؟ انہوں نے ماشاء اللہ میرے خاوند کا بڑی کامیابی سے اپنڈکس کا آپریشن کیا ہے' لہٰذا ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انہوں نے آپریشن کے پانچ سو لیرے معاوضہ لیا اور واقعی اسے حلال کر کے دکھایا۔ اللہ انہیں کسی چیز کا محتاج نہ رکھے۔ یہ صاحب باعث شرف انسانیت ہیں' ان پر خدا کی رحمت نازل ہو۔"

جج: (خاتون کی بات کاٹتے ہوئے...... ملزم سے) اب جواب دو۔

ملزم: (جو ناامیدی کا شکار ہو رہا تھا) جھوٹ' اللہ کی قسم جھوٹ...... کیسا آپریشن؟ میں تو خود اپنی شیو نہیں کر سکتا' آپریشن کیسے...... اگر اتوار کے دن حجام کی دکان بند ہو تو میں سارا دن بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ گزار دیتا ہوں۔"

مخمورہ: "جناب! التجا کرتی ہوں...... آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟ حسن کا آپریشن اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے آپ نہیں تھے کیا؟ ہر روز میں آپ کے ہاں حسن کو دیکھنے آتی تھی۔ ایک بار جب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ اتنے اچھے ڈاکٹر ہیں' پھر بھی آپ کے دروازے پر نیم پلیٹ کیوں نہیں ہے تو آپ نے جواب دیا تھا' میں اشتہار بازی سے گھبراتا ہوں۔ اس سے خواہ مخواہ انسان مشہور ہو جاتا ہے جبکہ مجھے جاننے والے جانتے ہیں۔" کیا یہ سب کچھ آپ نے نہیں کہا تھا؟ جج صاحب! اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں تو میرے خاوند کو بلا کر ان سے پوچھ لیں۔ وہ ان کے بارے میں کہی گئی باتوں کی تصدیق کر دیں گے۔ (مخمورہ خانم' مقدمے کی کارروائی سننے والوں میں بیٹھے اپنے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے) حسن! خدا کے لیے' کچھ تم ہی بولو۔ احمقوں کی طرح میری طرف دیکھنے کے بجائے کچھ تم ہی بتاؤ۔"

(جج حسن کو پکارتا ہے' وہ ڈرتے ڈرتے آتا ہے)

جج: "کیا ملزم نے آپ کا آپریشن کیا تھا؟"

حسن: (قربان ہونے والے جانور کی طرح ادھ کھلی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) کیا یہ صاحب؟ خدا کی قسم' کیا کہوں؟ یہ صاحب ایک مشہور انجینئر ہیں۔ یہ اپنے پیشے کے بڑے ماہر ہیں اور ہمارے ملک کے قابل فخر لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔"

جج: "یہ کیسا جواب ہے؟"

ملزم: "حسن! تم میرے دیرینہ دوست ہو' خدا کے لیے' مجھے اس مشکل گھڑی سے نکالو۔"

حسن: (جھوٹ موٹ کھانستے ہوئے) جناب والا! معلوم نہیں کیا کہوں...... میرے دوستوں میں سے حسین صاحب......"

مخمورہ: (اس بار اضافی غصے سے) انہوں نے تمہارا آپریشن کیا ہے نا؟ کیوں ہچکچا رہے ہو؟ ہاں کہو نا...... ڈاکٹری کی ڈگری نہ ہونے کے باوجود اس نے تمہاری جان سے کھیلنے کی کوشش کی تھی کیا اس کا تمہیں کوئی ملال نہیں؟ اگر یہ تمہیں جان سے مار دیتا پھر؟"

ملزم: (التجا کرتے ہوئے) حسن! اللہ کی رضا

کی خاطر مجھے بچاؤ۔''

حسن: (خاصی دیر سوچنے کے بعد کھانستے ہوئے' جج سے) ''جناب والا! حقیقت حال ابھی بیان کرتا ہوں' مگر اس کے لیے یہاں خصوصی تخلیہ چاہتا ہوں۔''

جج: ''یہ تخلیے دخلیے کا وقت نہیں۔''

حسن: ''اگر ایسا نہ ہوا تو جناب والا' میں کچھ کہہ نہ پاؤں گا۔'' (حسن نے جب زیادہ اصرار کیا تو کمرہ عدالت لوگوں سے خالی کروالیا گیا۔ جج نے جب اپنے ساتھ گواہوں کو رکھنا چاہا تو حسن نے جج کے قریب ہوکر آہستہ آواز میں کہا۔

''جناب والا! میرا خصوصی تخلیہ چاہنے کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی بیوی کی موجودگی میں کھل کر بات نہ کرسکوں گا۔'' چنانچہ اس کی خواہش کے مطابق اس کی بیوی کو عدالت سے باہر بھجوادیا گیا۔

جج: ''اب بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

حسن: ''جناب! کیا آپ شادی شدہ ہیں؟''

جج: (غصے ہوتے ہوئے) اس مقدمے سے اس بات کی مناسبت کیا ہے؟''

حسن: ''اگر آپ کنوارے ہیں تو شاید مجھے آپ کو اپنی بات سمجھانے میں دشواری پیش آئے' پھر بھی میں کہتا ہوں۔ جناب! ایک دن جب میری بیوی نے ایک دکان پر سمور کا قیمتی لباس دیکھا تو اسے خریدنے کی فرمائش کرنے لگی۔ اس نے مجھے بڑی جلی کٹی سنائیں اور کہا کہ میں چوری کروں' ڈاکہ ڈالوں یا بھیک مانگوں' ہر حال میں اسے یہ لباس لے کر دوں۔ میں اس کی عادت خوب سمجھتا تھا' میری التجا' منت سماجت اور دھمکی کا جب اُس پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا تو آخرکار مجھے ایک چارہ سوجھا۔ میں نے اسے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''چلو تمہاری خواہش کا لباس ہی لے لیں گے مگر آج نہیں کل سہی۔'' پھر اس رات میں نے جھوٹ موٹ تڑپنا اور چیخنا چلانا شروع کردیا کہ مجھے درد قولنج ہورہا ہے اور اگلی صبح اپنے انجینئر دوست حسین ادیب کو ڈاکٹر کہہ کر بلا بھیجا۔ اسے اپنا مسئلہ اور اس کا حل بتاتے ہوئے اس کو ڈاکٹر بنادیا۔ میرے دوست نے مجھے اس مصیبت سے نکالنے کا وعدہ کیا اور میری بیوی کو بلا کر کہا۔

''آپ کے خاوند کی آنتوں میں سوجن ہے' لہٰذا مجھے ان کا آپریشن کرنا ہوگا۔'' میری بیوی جیسی بھی ہے مجھے بڑا چاہتی ہے۔ یہ سن کر بے چاری۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اپنے خاوند کو کھورہی ہوں۔'' کہہ کر دہائی دینے لگی۔ حسین ادیب نے میرے کہنے کے مطابق میری بیوی سے آپریشن کا معاوضہ سات سولیرے مانگا' مگر پانچ پانچ سولیرے پر طے پاگئی۔ میں نے اس موقع پر درد سے بے تاب ہوکر کہا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔ اس رقم سے تو میں تمہارے لیے سمور کا لباس خریدوں گا۔'' میرے اس انداز وفا نے اس کو مزید رُلادیا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے رونا شروع کردیا۔

''سمور پر لعنت بھیجو۔ مجھے صرف تمہاری جان عزیز ہے اور میری زندگی تم سے وابستہ ہے۔'' میں حسین ادیب کے گھر میں ایک ماہ تک آرام کرتا رہا ہوں۔ اس عرصے میں مجھے جو آرام ملا' دنیا میں آنے سے اب تک زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوا۔ جب بیوی مجھے ملنے آتی تو میں بستر میں لیٹ کر مریض بن جاتا اور اس کے جانے کے بعد اس کے لائے ہوئے پھل حسین ادیب کے ساتھ مل کر مزے مزے سے کھاتا۔ یہ ہے میرے معصوم دوست کی ڈاکٹر بننے کی حقیقت۔

(جج پانچ منٹ بعد حسین ادیب کا جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے اسے باعزت بری کرنے کا فیصلہ سناتا ہے)۔

☆☆......☆☆